قمر احسن
آگ الاؤ صحرا

آگ الاؤ صحرا

قمر احسن

انتخاب و ترتیب

نیّر مسعود

زیر اہتمام

شب خون کتاب گھر، الہ آباد

یو۔ پی۔ اردو اکیڈمی کے جزوی مالی اشتراک سے

بار اول ---------- ۱۹۸۰ء
تعداد ------------ ۱۰۰۰
ناشر --------- قمر احسن
قیمت ----------- ۲۵/..

سرورق : صادق
کتابت : ریاض احمد، الہ آباد
مطبع : نیشنل آرٹ پرنٹرس، الہ آباد

تقسیم کار

شب خون کتاب گھر

۳۱۳۔ رانی منڈی، الہ آباد، ۲۱۱۰۰۳

انتساب

شاہد اعظمی — جنھوں نے میری تربیت کی۔
شہنشاہ مرزا — جن سے مجھے تحریک ملی۔
شمس الرحمن فاروقی — جنھوں نے مجھے لفظ و معنیٰ کے رشتوں سے آگاہ کیا، ادب اور غیر ادب کے مابین امتیاز کرنا سکھایا۔

أَتَزْعَمُ أَنَّكَ جِرْمٌ صَغِيرٌ
وَفِيكَ طَوَى الْعَالَمُ الْأَكْبَرُ

— حضرت علی علیہ السلام

ترتیب

صحرا ۱۰۵

ناولٹ ۱۸۱

قمر احسن ــــ اثبات اور انکار کی کشمکش

تاریخ کا میکانکی تصور جو انیسویں صدی میں عام ہوا اس کی بنیاد اس مفروضے پر ہے کہ تاریخ ہمیشہ تقریباً ایک سیدھی لکیر میں سفر کرتی ہے۔ لہذا بعد میں آنے والا زمانہ پچھلے زمانے سے آگے بڑھا ہوا ہوتا ہے۔ چونکہ آگے بڑھا ہوا ہونا ترقی کی دلیل ہے، اس لئے بعد میں آنے والا زمانہ پچھلے زمانے سے ترقی یافتہ ہوتا ہے اور چونکہ ترقی میں خوبی کا پہلو بھی موجود ہے اس لئے ترقی یافتہ زمانہ بہتر زمانہ بھی ہوگا۔ لیکن خود تاریخ کا مطالعہ اس میکانکی تصور کی نفی کرتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ یہ ممکن ہے کہ بعد میں آنے والا زمانہ پچھلے زمانہ سے بہتر ہو ممکن ہے کہ نہ ہو۔ لیکن زمانہ بذاتِ خود کوئی طبعی شے نہیں ہے جس کے آگے بڑھنے یا شروع ہونے کا تعین مقررہ پیمانوں کے ذریعہ ہو سکے۔ زمانہ دراصل ان تصورات و رجحانات کی روشنی میں پہچانا جاتا ہے۔ جو اس میں جاری یا موجود ہوتے ہیں۔ تصورات کی تاریخ ہمیں یہ بتاتی ہے کہ ایک ہی وقت میں کئی طرح کے تصورات بھی موجود ہو سکتے ہیں۔ اگر اس خیال کو ادب کی تاریخ کے حوالہ سے بیان کیا جائے تو یوں کہا جائے گا کہ ایک ہی وقت میں کئی طرح کے ادبی اظہار نشو و نما پا سکتے ہیں۔

پھر سوال یہ اٹھتا ہے کہ کسی زمانہ کی خصوصیات کا بیان کیوں کر کیا جائے۔ اگر زمانہ سیدھی لکیر کی صورت میں آگے نہیں بڑھتا اور اس میں بیک وقت کئی طرح کے اظہار رائج ہو سکتے ہیں۔ تو کیا پھر تمام زمانے ایک طرح کے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایسا نہیں ہے۔ اس لئے زمانوں کی تخصیص کے لئے کچھ اور معیار تلاش کرنے ہوں گے۔ مثال کے طور پر نئے افسانے کی تاریخ کے بارے میں عام خیال یہ ہے کہ وہ منٹو کے افسانے "پھندنے" سے شروع ہوتی ہے۔ یہ افسانہ ۱۹۵۵ء میں لکھا گیا تھا۔ لیکن ۱۹۵۵ء کے بعد بھی صدہا ایسے افسانے لکھے گئے ہیں (بلکہ آج بھی لکھے جا رہے ہیں) جن میں اور "پھندنے" میں کوئی بات مشترک نہیں ہے۔ دوسری طرف یہ بھی کہا گیا ہے کہ نئے افسانے کی تاریخ پریم چند کے

افسانے "کفن" سے شروع ہوتی ہے۔ "کفن" "پھندنے" کے بیس سال پہلے لکھا گیا تھا مگر یہاں بھی یہی مشکل ہے کہ "کفن" اور "پھندنے" کے بیچ کے عرصہ میں شاید ہی کوئی ایسا افسانہ لکھا گیا ہو جسے "کفن" کی طرح کا افسانہ کہہ سکیں لیکن اس بات سے بھی انکار ممکن نہیں کہ "کفن" اور "پھندنے" دونوں افسانوں میں بہت سی چیزیں ایسی ہیں جن کا وجود ان کے پہلے افسانے میں نہیں ملتا۔ "کفن" کو عام طور پر پریم چند کا بہترین افسانہ کہا جاتا ہے۔ "پھندنے" کو منٹو کا بہترین افسانہ نہیں تو اہم ترین افسانہ اکثر کہا گیا ہے۔ نئے افسانے کی تنقید میں خلط مبحث اس لیے پیدا ہوا کہ تاریخ کے سیدھی لکیر والے تصور کی بنا پر لوگوں نے یہ فرض کر لیا کہ چونکہ "کفن" یا "پھندنے" نئے افسانے کا نقطۂ آغاز ہے، اس لئے جو کچھ ان افسانوں کے بعد ہوا وہ سب نیا ہے۔ واقعہ دراصل یہ ہے کہ "کفن" کے بعد کا دور کئی معنوں میں افسانے کی ترقیٔ معکوس کا دور ہے اور جن لوگوں نے محض "پھندنے" کو نئے افسانے کا پہلا قدم سمجھا انھوں نے "کفن" کی اہمیت کو نظر انداز کر دیا۔

نیا افسانہ دراصل "کفن" اور "پھندنے" دونوں کی روشنی میں برآمد ہونے والے ادبی اظہار کے طریقوں اور نظریات سے عبارت ہے۔ دوسرے الفاظ میں وہ افسانے جنھیں ہم نیا افسانہ کہتے ہیں ان کی جڑیں خاصی گہری ہیں۔ لیکن نیا افسانہ ابھی اپنی جڑوں کی گہرائی کو پوری طرح ثابت نہیں کر پا رہا ہے اور نہ ابھی پوری طرح اس قابل ہوا ہے کہ "کفن" اور "پھندنے" کی روشنی میں جس طرح کے افسانے کا امکان ہے وہ اس امکان کو حقیقت میں بدل دے اور جب تک یہ امکان حقیقت میں نہیں تبدیل ہوتا تب تک گزشتہ نسل کے افسانوں کو پوری طرح پامال بھی نہیں کہا جا سکتا۔ شاید یہ کبھی بھی ممکن نہ ہو سکے گا لیکن اتنا ضرور ہوگا کہ نیا افسانہ پرانے افسانے کے شانہ بہ شانہ قائم ہو جائے گا۔

یہاں پر یہ سوال اٹھ سکتا ہے کہ اگر پرانا افسانہ پوری طرح پامال نہیں ہو سکتا یا اب تک پامال نہیں ہو پایا ہے تو پھر نئے افسانے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ اس کا سب سے پہلا جواب تو یہ ہے کہ تاریخ چونکہ خطِ مستقیم میں سفر نہیں کرتی اس لئے گزشتہ اور موجودہ میں ماضی اور حال سے زیادہ حال اور حال کا تعلق ہوتا ہے۔ اس کے پہلے کہ حال پوری طرح ماضی بن جائے یہ ممکن ہے کہ ایک اور حال وجود میں آجائے۔ دوسرا حال پہلے کو متاثر کرتا ہے اور اسے پوری طرح ماضی ہونے سے بچاتا ہے۔ اردو افسانہ کی تاریخ میں انتظار حسین اس حال کی صورت میں ہے جس کے بعد ایک اور حال پیدا ہو چکا ہے۔ لیکن وہ خود ابھی ماضی نہیں بنا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ افسانہ میں ایک طرح کی یکسانیت ہوتی ہے اور اس یکسانیت کی اصلاح کرنے کے لئے یہ ضروری ہو جاتا ہے کہ افسانوی

اظہار کی نئی شکلیں تلاش کی جائیں۔ یہ شکلیں بھی جلد پرانی ہو جاتی ہیں اور پھر افسانہ نگار ان سے بھی قدیم تر شکلوں کو نیا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ ایسا اس لئے ہوتا ہے کہ افسانہ میں تنوع اور تبدیلی کے امکانات شاعری کے مقابلہ میں کم ہیں۔ لہذا نیا افسانہ آپ اپنا جواز ہے۔ صرف وہی لوگ جو افسانے کے بنیادی مسائل سے واقف نہیں ہیں، نئے افسانے کو دیکھ کر خوف زدہ ہو جاتے ہیں اور کبھی افسانے کی موت کا اعلان کرنے لگتے ہیں تو کبھی اس کے اشکال یا ابہام یا روزمرہ کے حقائق سے دوری کا رونا رونے لگتے ہیں۔ حالاں کہ افسانے کی بنیادی حقیقت یہی ہے کہ وہ یا تو سماجی حقائق پر مبنی ہو گا یا کردار کے داخلی نفسیات پر یا ان دونوں چیزوں پر۔ لہذا افسانہ بظاہر چاہے کتنا ہی مبہم یا نام نہاد افسانویت سے عاری ہو بے معنی نہیں ہو سکتا اور نہ اس قدر مبہم ہو سکتا ہے کہ قاری کو اس کے معنی کی تلاش میں کسی بہت بڑے دردسر کا سامنا ہو۔

نیا افسانہ جن بنیادوں پر قائم کیا جا رہا ہے ان میں کوئی ایسی بات نہیں جس کا جواز پرانے افسانے میں تلاش نہ کیا جا سکے۔ فرق صرف یہ ہے کہ نیا افسانہ اظہار اور رویہ کی بعض ایسی جہتوں کو نمایاں کرتا ہے جو پرانے افسانے میں ذرا دبی ہوئی تھیں۔

نئے اور پرانے افسانے میں سب سے بنیادی فرق افسانہ گوئی اور افسانہ نویسی کی اصطلاحوں کے ذریعہ ظاہر کیا جا سکتا ہے۔ وہ افسانے جو افسانہ گوئی پر مبنی ہیں، افسانہ نگار یعنی راوی کا وجود اور نقطۂ نگاہ ان پر حاوی رہتا ہے۔ پریم چند کا افسانہ "کفن" افسانہ گوئی سے افسانہ نویسی کی طرف کے سفر کا پہلا بڑا قدم ہے۔ اس افسانہ میں پریم چند ایک جگہ راوی کے روپ میں ظاہر ہوتے ہیں لیکن خود افسانے میں معنی کی اتنی تہیں ہیں کہ ان کا نقطۂ نظر پس پشت جا پڑتا ہے اور یہ کہنا مشکل ہو جاتا ہے کہ پریم چند کو اپنے دونوں کرداروں یعنی "گھیسو" اور "رامو" سے ہمدردی ہے یا نفرت، یا دونوں ہی جذبات ان کے دل میں بیک وقت کارفرما ہیں۔ لیکن منٹو کے افسانے "پھندنے" میں راوی کا وجود ہی نہیں ہے۔ سارا افسانہ غیر معمولی بلکہ ناقابل یقین واقعات پر مبنی ہے۔ کردار نگاری چوں کہ جان بوجھ کر واقعیت سے دور رکھی گئی ہے اس لئے مصنف محض مصنف رہتا ہے، راوی نہیں بنتا۔ لہذا ان دونوں افسانوں میں کردار اور واقعہ دونوں کا وجود افسانہ نگار کی شخصیت سے آزاد ہے اور حقیقت کی ایک ایسی دنیا خلق کرتا ہے جو سماجی دنیا کے ذریعہ اپنی معنویت حاصل کرتی ہے۔ لیکن اس کی پابند نہیں ہے۔

نئے افسانے کو قائم کرنے کے لیے ہمیں ایسے افسانے کی ضرورت ہے جس میں "کفن" اور "پھندنے"

دونوں کی داخلی ہیئت موجود ہوں۔

تو مسئلہ یوں بنتا ہے کہ کون سی صفات ہیں جو "کفن" اور "پھندنے" سے حاصل ہو سکتی ہیں اور ان کے ذریعہ افسانے کی تشکیل ممکن ہو۔ "کفن" جس کی بنیادی صفت یہ ہے کہ اس میں واقعات کی فراوانی ہے لیکن کردار کا جو نقشہ بنتا ہے وہ سراسر ان واقعات کی سطحی تفصیل کا مرہون منت نہیں۔ اب تک تو یہ خیال عام تھا کہ کردار کی وضاحت کے لئے افسانہ نگار کے پاس دو اہم ترین ذرائع ہیں۔ ایک تو کردار کی شکل و شباہت اور اس کے ذاتی اور خاندانی پس منظر کی تفصیل بیان کرنا اور دوسرا یہ کہ واقعات کی روشنی میں کردار کے خط و خال واضح کرنا۔ اس قسم کی کردار نگاری کی بہترین مثال "توبتہ النصوح" کا "ظاہر دار بیگ" ہے۔ ظاہر دار بیگ کا سارا کردار (یعنی وہ کردار جو نذیر احمد ہمارے سامنے بیان کرنا چاہتے ہیں) اس کی اس شکل و شباہت کے ذریعہ نمایاں ہو جاتا ہے جو نذیر احمد نے درج کی ہے اور اس کردار (یا کردار کے اس تصور) کی دلیل ان واقعات سے فراہم ہوتی ہے جو "کلیم" پر اس وقت گزرتے ہیں جب وہ گھر چھوڑ کر ظاہر دار بیگ کے یہاں رہنے کے لئے آتا ہے۔ ظاہر دار بیگ کے چہرے مہرے اور لباس وضع قطع اور چال ڈھال کا جو بیان نذیر احمد نے لکھا ہے اس سے یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ یہ شخص سطحی نمائش اور جھوٹی شیخی مارنے والا چھوٹی طبیعت کا شخص ہے۔ اس کی دلیل اس وقت ملتی ہے جب ہم کلیم کی آنکھوں سے یہ دیکھتے ہیں کہ ظاہر دار بیگ کے پاس نہ حویلیاں ہیں نہ باغات، نہ مہمان خانے ہیں نہ خدام، نہ صرف یہ کہ دولت مند نہیں بلکہ پرلے سرے کا کنجوس اور غیر مہمان نواز شخص ہے۔

اس طرح روایتی کردار نگاری میں مصنف اپنے کردار کو اور اس پر یا اس کے ذریعہ پیش آنے والے واقعات کو پوری طرح اپنی گرفت میں رکھتا ہے اور یہ گرفت سراسر ہم کو دکھائی بھی دیتی ہے۔ چنانچہ یہ ممکن نہیں کہ ظاہر دار بیگ کی زبان سے معنوی خوش طبعی، طراری اور لفاظی کے علاوہ کسی اور طرح کے مزاج کا اظہار کرنے والا فقرہ نذیر احمد کے قلم سے نکل جائے۔ اس کے برخلاف "کفن" میں تفصیلات اور واقعات تو اس درجہ کے ہیں جیسے کہ ظاہر دار بیگ کے بارے میں ہیں۔ لیکن ہم ان کرداروں کو اپنے دل اور دماغ میں کس جگہ اور کس طرح کا مقام دیں اس کا فیصلہ نہ مصنف کرتا ہے اور نہ ہم کر پاتے ہیں۔ انیسویں صدی کے آخر میں روایتی واقعیت کے تابوت میں ایک زبردست کیل نطشے نے یہ کہہ کر ٹھونکی تھی کہ حقیقتیں لامتناہی ہیں کیوں کہ ان کے ادراک کے مناظر بھی لامتناہی ہیں۔ اس کا مطلب یہ نکلا کہ کسی شخص کے بارے میں یہ حکم نہیں لگایا جا سکتا کہ وہ پوری طرح اچھا ہے یا پوری طرح خراب۔ اور اگر ایسا ہے تو شاید مصنف کو بھی یہ حق نہیں کہ وہ اپنے کسی کردار کو اس طرح پیش کرے کہ قاری اسے پوری طرح اچھا یا پوری

طرح خراب کہنے پر مجبور ہو جائے۔

لہٰذا افسانے میں اعلیٰ تر واقعیت کا عمل دخل "کفن" سے شروع ہوتا ہے۔ "کفن" کے کردار اپنی کمزوریوں اور مضبوطیوں کے ساتھ یوں نمایاں ہوتے ہیں کہ ان کی کمزوریاں ہی بعض اوقات مضبوطیاں اور ان کی مضبوطیاں ہی بعض اوقات ان کی کمزوریاں معلوم ہونے لگتی ہیں۔ جب ہم "پھندنے" کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ حقیقت کی ایک شکل یہ بھی ہے کہ افسانے کے کرداروں کے بارے میں کسی قسم کا حکم ممکن نہ ہو۔ کیوں کہ وہ اس مقررہ معنی میں کردار نہیں ہیں۔ کہ کردار وہ شے ہے جس پر واقعات اثر انداز ہوں اور جو واقعات پر اثر انداز ہو۔ کردار کو افسانے سے خارج کر دینے کے نتیجہ میں افسانہ ایک نئے بعد کے امکان کی نشان دہی کرتا ہے۔ کیوں کہ جن افسانوں میں کردار کا عمل دخل ہوتا ہے چاہے وہ جس پہلو سے یا جس طرح بھی ہو وہ قاری کو مجبور کرتے ہیں کہ واقعات کی قدر و قیمت کا اندازہ کردار کے حوالہ سے لگایا جائے۔ مثلاً منٹو کے افسانے "ہتک" میں سوگندھی اپنے جیلہ حوالہ کرنے والے عاشق کو (جو ایک طرح سے ظاہر دار بیگ کی ترقی یافتہ شکل ہے) ذلیل کر کے گھر سے باہر نکال دیتی ہے کیوں کہ اس کے ایک گاہک نے اسے ذلیل کیا تھا۔ سوگندھی کے کردار کے خال و خد جس طرح افسانے میں نمایاں کئے گئے ہیں اس کے بغیر اس واقعہ کی قدر و قیمت کا تعین اور توضیح ممکن نہیں۔ لیکن اگر کردار روایتی معنی میں کردار نہ ہو تو واقعہ علامت کا رنگ اختیار کر لیتا ہے اور اس کی معنویت زمان (یعنی کردار کا ذہنی اور جسمانی ارتقاء) اور مکان (یعنی وہ ماحول جس میں وہ واقعہ پیش آیا ہے) کی محتاج نہیں رہ جاتی۔ اس کی بہترین مثال کافکا کے افسانوں میں ملتی ہے۔ جن میں کردار صرف سطحی طور پر مکان کا محتاج ہوتا ہے اور زمان سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ اس کے افسانے (ایک کتے کی تفتیش و تحقیق) میں مرکزی اہمیت رکھنے والا کتا اپنی اور دوسرے کتوں کی حسیت اور ذہنیت کی روشنی میں انسانوں کے کردار و کوائف کا تجزیہ کرتا ہے۔ ایسے افسانے میں جگہ یا وقت کی قید نہیں ہوتی جس طرح معمولی سطح پر پریم چند کے یہاں اور اعلیٰ سطح پر ڈکنس کے یہاں نظر آتی ہے۔

چنانچہ افسانے کا مسئلہ مختصراً یوں ہے:

(۱) کردار کی اہمیت کو کم کرنا تاکہ واقعہ کی اہمیت از خود مسلّم ہو سکے۔

(۲) واقعہ کو از خود یا کسی اور مرکزی یا محوری وسیلہ کی مدد سے علامتی رنگ دینا۔

(۳) کردار کی منہائی کی وجہ سے واقعہ میں خط مستقیم کی کیفیت باقی نہیں رہی اس کو تجرید بھی کہہ سکتے ہیں۔ لہٰذا مسئلہ یہ ہوا کہ تجرید کے باوجود واقعہ میں افسانہ پن کیوں کر لایا جائے۔

میں یہ نہیں کہوں گا کہ نئے افسانہ نگار نے ان مسائل کو حل کر لیا ہے بلکہ اغلب تو یہ ہے کہ ابھی اس نے ان مسائل کا احساس بھی نہیں کیا ہے۔ ان پر غور کرنا تو دور رہا لیکن اکثر یہ بھی ہوتا ہے کہ فن کار اپنی تخلیقی حسیت کی روشنی میں بہت سی منزلیں سر کر لیتا ہے اور بعد میں نقاد ان کا تجزیہ کرنے بیٹھتے ہیں۔ قمر احسن کے افسانوں میں ان تینوں مسائل سے پیدا ہونے والی پیچیدگیاں اور پیچیدگیوں کو حل کرنے کی کوشش صاف نمایاں ہے۔ علامت کی تخلیق کا مسئلہ قمر احسن کا بنیادی تخلیقی اشتغال ہے۔ لیکن علامت سے ملتی جلتی اور تخلیقی تشکیلات جن میں تمثیل اور تمثیلی کہانی یعنی PARABLE اور استعارہ سر فہرست ہیں، اکثر افسانہ نگار کے لئے سدہ راہ بن جاتی ہیں۔ علامت کی بنیادی شکل یہ ہے کہ اسے کسی نقشے یا خاکے میں محدود نہیں کر سکتے اس لئے وہ علامتیں آسانی سے گرفت میں آجاتی ہیں جن میں نیم تاریخیت ہو۔ نیم تاریخیت سے مراد یہ ہے کہ وہ شے یا واقعہ جو علامت کے طور پر استعمال ہوا ہے اپنی جگہ پر اس قدر مشہور اور مستحکم ہو کہ تاریخ سے زیادہ قوی طور پر ذہنوں میں جاگزیں ہو۔ لیکن اس کی تاریخی اصل واضح نہ ہو۔ رسول اللہ صلعم کے واقعۂ معراج کی مختلف روایات میں ایک یہ بھی ہے کہ انھوں نے عرشِ اعظم کے قریب ایک عظیم الشان مرغ دیکھا جس کے پر انتہائے انتہا تک پھیلے ہوئے تھے اور جب وہ پروں کو ہلاتا تھا تو دور دور تک تسبیح و تحلیل کی آوازیں گونجتی تھیں۔ DANTE نے اس آفاقی مرغ کو ایک آفاقی عقاب کی شکل میں پیش کیا ہے اور اب یہ دونوں طائر انسانی روح کی اعلیٰ ترین تخلیقی قوتوں اور عارفانہ قلب کی وسعتوں کی علامت کے طور پر ہمارے سامنے ہیں۔ کوئی ضروری نہیں کہ ان علامتوں کی شدت کو محسوس کرنے کے لئے ہم ان تمام مذہبی اعتقادات سے بھی واقف ہوں جن پر یہ مبنی ہیں۔ ہوا صرف یہ ہے کہ عہد بہ عہد، ملک بہ ملک ان پرندوں کا وجود انسانی شعور میں رچتا بستا گیا ہے۔ اب ان کی تاریخی تعیئن ممکن نہیں ہے۔ لیکن ادبی اور روحانی قدر و قیمت تاریخی تعین سے ماورا ہو چکی ہے۔ قمر احسن کے افسانے "یا مصطفٰے" میں سیاہ گھوڑے کی علامت اس طرح کے کئی تصورات کو اپنے محاذ میں لے آتی ہے۔ قبرستان اور قبروں کے کھلنے کا تذکرہ، گھوڑے کا کف در دہان ہونا اور افسانہ نگار کا افسانہ لکھنے کی کش مکش میں گرفتار ہونا جب کہ سیاہ گھوڑا بار بار اس کے شعور میں حقیقت بن کر در آتا ہے۔ تخلیقی عمل کی داستان خود اس داستان کی علامت بن گئی ہے۔ تخلیقی عمل اور خاص کر وہ تخلیقی عمل جس کا تعلق فنونِ لطیفہ سے ہے زندگی اور موت دونوں سے عبارت ہے۔ سیاہ گھوڑا بھی اسی وجہ سے زندگی اور موت یعنی تخلیق کے ادراک اور اس کے اظہار کی علامت بن جاتا ہے۔ اگر افسانہ نگار اپنی شخصیت کو تھوڑا اور پردہ میں رکھتا اور اس بات کو پوری طرح واضح نہ کر دیتا کہ وہ خود افسانہ

میں ایک کردار (بلکہ واحد کردار) ہے تو افسانہ کی فنی تکمیلیت اور بھی بھرپور ہو جاتی۔

لیکن مشکل یہ ہے کہ واحد متکلم کے افسانے میں افسانہ نگار واقعہ بیان کرتے کرتے کبھی کبھی از خود گھبرا اٹھتا ہے کہ افسانہ نگار اور راوی دونوں ایک تو نہیں ہوتے جا رہے ہیں۔ افسانہ نگار اور راوی کی وحدت ایک دلکش جال ہے جس میں کیا ڈکنس اور کیا بالزاک بڑے بڑے شکار ماہیٔ بے آب کی طرح تڑپتے نظر آتے ہیں۔ یو۔ ایس۔ رچرڈ نے اپنی حالیہ خود نوشت سوانح میں اس مسئلہ پر تھوڑی بہت روشنی ڈالی ہے۔ وہ اپنے ایک افسانے کا ذکر کرتا ہے جس میں واقعہ واحد متکلم نے بیان کیا ہے۔ لیکن واحد متکلم جو مرکزی کردار بھی ہے کئی ناپسندیدہ اور اخلاقی کمزوریوں سے مملو شخص ہے۔ اب رچرڈ کا مسئلہ یہ تھا کہ وہ واحد متکلم کے بیانات کو کس طرح ظاہر کرے کہ اس کے عیوب بھی سامنے آجائیں اور وہ خود اپنے ان عیوب سے بے خبر دکھائی دے۔ یعنی مسئلہ یہ تھا کہ افسانہ نگار کو راوی کی شکل اختیار کرنے سے کس طرح محفوظ رکھے۔ رچرڈ اس مشکل سے کسی نہ کسی طرح نکل آیا لیکن ایسا بار بار نہیں ہوتا۔ علاوہ بریں اکثر افسانہ نگار کو یہ شوق بھی ہوتا ہے کہ وہ قاری کو اس دھوکا میں ڈالتا رہے کہ وہ جو کچھ لکھ رہا ہے وہ افسانہ نہیں ہے یا اس کو یہ لالچ پیدا ہوتی ہے کہ قاری کو یہ دھوکہ دے کہ جو کچھ وہ لکھ رہا ہے وہ محض افسانہ ہے۔ لہٰذا کبھی تو افسانہ نگار صرف ایک ہی شخص بن جاتا ہے جس پر کوئی بات یا واردات گزری ہو اور کبھی وہ واقعات کو گھڑنے والا یا افسانے کو عمارت کی طرح تعمیر کرنے والا مصور بن بیٹھتا ہے۔ "یا مصطفیٰ" کا مرکزی مسئلہ یہی ہے کہ افسانہ نگار اس کشمکش سے آزاد نہیں ہو سکا ہے کہ وہ اپنی تخلیقی کشاکش کو قمر احسن کی کشاکش کے طور پر بیان کرے یا قاری کو اس دھوکہ میں ڈالے کہ قمر احسن تو کوئی اور شخص ہے یہ تو محض کسی ایک افسانہ نگار یا تخلیق نگار کی کشمکش کی داستان ہے۔

لیکن اس کے باوجود "یا مصطفیٰ" میں گھوڑے کی علامت اپنی جگہ پر قائم رہتی ہے اور یہ ضروری ہے اس لئے کہ اپنے تہذیبی اور سماجی پس منظر کی بنا پر قمر احسن نے گھوڑے کی علامت کا انتخاب کیا اور یہ علامت بہت سی شیعی روایات کی یاد دلاتی ہے ورنہ ممکن تھا کہ گھوڑے کی جگہ اس طرح کا کوئی اور آسانی سے قابو میں نہ آسکنے والا جانور علامت کے طور پر استعمال کیا جاتا۔ اگر ایسا ہوتا تو وہ علامت کسی اور تاریخی یا نیم تاریخی یا تہذیبی پس منظر کی محتاج ہوتی یا پھر محض ایک ذاتی علامت بن جاتی۔ ورجینا وولف کا ناول TO THE LIGHT HOUSE شایع ہوا تو مصوری کے مشہور نقاد راجر فرائی نے اس کو لکھا کہ تمھارے ناول میں لائٹ ہاؤس ایک مرکزی شے کی طرح جاری وساری ہے لیکن میں اس علامت کے معنی نہیں سمجھ سکا ہوں۔ مگر شاید اس کے معنی سمجھنا کوئی بہت ضروری بھی نہیں ہیں۔ ورجینا وولف نے جواب میں لکھا کہ میں نے ناول میں لائٹ ہاؤس کو ایک

مرکزی خط تنصیف کے طور پر استعمال کیا ہے اور مجھے اس بات سے بڑی دحشت ہوتی ہے کہ کسی چیز کو قطعیت سے بیان کیا جائے۔ بہتر یہ ہے کہ میں اس کے الفاظ ہی نقل کر دوں:

"لائٹ ہاؤس سے میری مراد کچھ بھی نہ تھی۔ میں نے اسے ضروری سمجھا تھا کہ کتاب کے بیچوں بیچ ایک مرکزی خط کھینچا جائے جو اس کے ڈھانچے کو باندھے رکھے۔ میں جانتی تھی کہ یہ چیز طرح طرح کے محسوسات اور تاثرات کا مرجع بن جائے گی۔ لیکن میں نے ان کے بارے میں تفصیل سے سوچنے سے انکار کیا۔ مجھے خیال تھا کہ لوگ اسے اپنے جذبات کا مخزن بنالیں گے۔ اور ایسا ہی ہوا۔ کوئی اس کے معنی کچھ سمجھتا ہے اور کوئی کچھ سمجھتا ہے۔ میں اس غیر قطعی اور عمومی طرز کے علاوہ علامت نگاری کو اور کسی طرح نہیں برت سکتی۔ میں نہیں جانتی کہ یہ اچھا ہے یا برا لیکن جیسے ہی مجھ سے کوئی بتاتا ہے کہ کسی چیز کے معنی کیا ہیں تو وہ میرے لئے نفرت انگیز ہو جاتی ہے۔"

ورجینا وولف کے ان خیالات میں افسانوی علامت نگاری کے اور عام علامت نگاری کے بھی بہت سے نکات پوشیدہ ہیں۔ اگر علامت میں قطعیت ہو تو وہ نفرت انگیز ہو جاتی ہے۔ کیوں کہ وہ علامت رہتی ہی نہیں۔ علامت کا جواز صرف اس کی معنویت نہیں ہے بلکہ اس کی فنی ناگزیریت بھی ہے۔ اگر علامت فن پارہ کے ڈھانچے میں اس طرح پیوست نہ ہو کہ وہ پورے ڈھانچے کو اپنے پاؤں پر قائم کر سکے تو پھر وہ علامت کے بجائے دھوکے کی ٹٹی بن جاتی ہے۔

علامت کی اس مرکزیت کی تلاش میں قمر احسن نے افسانوی اظہار کے کئی امکانات کو اختیار کیا ہے۔ اپنے ذاتی ماضی، تہذیبی ماضی اور ادبی ماضی تینوں سے ان کا تعلق بہ یک وقت برقرار رہنے کی وجہ سے ان کے بیشتر افسانوں میں تاثر کی وحدت کا احساس ہوتا ہے۔ نئے افسانے کا ایک مسئلہ یہ بھی ہے کہ نیا افسانہ نگار معاصر دنیا اور گرد و پیش کے ماحول کے جبر میں کچھ اس طرح گرفتار ہے کہ اپنے تہذیبی اور ذاتی ماضی کی گہرائیوں میں اترنے سے کچھ معذور نظر آتا ہے۔ قمر احسن کی خوبی یہ ہے کہ وہ ماضی اور حال کو بیک وقت انگیز کرتے ہیں۔ اگرچہ وہ ماضی سے بعض ایسی چیزیں بھی اٹھالاتے ہیں جو بہ یک نظر قاری کو الجھن میں ڈال دیتی ہے اور نقاد یہ محسوس کرتا ہے کہ یہ ہتھکنڈے محض نیاپن حاصل کرنے کے لئے ہیں۔ لیکن ماضی اور حال کو یکساں انگیز کرنے کی بنا پر ان کا افسانہ اپنے ظاہری الجھاؤ کے باوجود ایسے حقائق پر مبنی ہوتا ہے جو تمام زمانوں کو ایک رشتے میں پرو دیتے ہیں۔ ہوزہ میم۔ ذ میں مرکزی

شخصیت (اسے کردار کہنا مناسب نہ ہوگا) کسی مثالی (افلاطونی مفہوم میں) افسانے کا مرکزی کردار ہے۔
جو اظہار کے لئے بے چین ہے۔ اس کی مشکل یہ ہے کہ وہ کسی بھی حوالہ سے اپنے کو ظاہر نہیں کر سکتا۔ نہ قدیم
مذہبی روایات نہ عہد حاضر کی بیماریاں اور جسمانی عوارض اور نہ داستانی دنیا۔ اس میں جو چیز موجود ہوتی
ہے وہ صرف واہمہ کی سطح پر قائم ہوتی ہے۔ مثالی افسانے کا یہ مرکزی کردار قدیم الایام تعویذ کے سہارے
چلنے کی کوشش کرتا ہے لیکن پھر ترغیب کی کمزوری کا شکار ہو کر تعویذ کو کھول کر دیکھ لیتا ہے۔ ابتدا میں
داستانی انداز میں شہزادہ قید و بند کی مصیبت برداشت کر کے تھک جاتا ہے تو موت کی دعا مانگتا ہے
اور آخر میں درد پتھرائی ہوئی آنکھیں کسی اور شخص کا انتظار کر رہی ہوتی ہیں۔ لیکن افسانہ ایک نظم پر ختم ہوتا
ہے جس میں موت کی آواز کو ندا کی آواز کی طرح سننے والے کو مجبور کر دیتی ہے۔ یعنی کردار یا افسانہ
وجود میں آنے سے انکار کر دیتا ہے۔

میں نے اوپر کہا ہے کہ علامت تک پہنچنے سے پہلے افسانہ نگار کو اکثر تمثیل میں الجھنا پڑتا ہے۔
یعنی علامت تمثیل کے دھندلکوں میں گم ہو جاتی ہے۔ افسانہ نگار کو قدم قدم پہ لالچ گھیرتی ہے کہ بظاہر
پر اسرار طرز بیان اختیار کرے اور خود کو مطمئن کرے کہ اس نے علامت کا حق ادا کر دیا۔ اس کا ایک
طریقہ یہ بھی ہوتا ہے کہ افسانے میں کردار تو ہوں لیکن ان کے نام نہ ہوں یا اگر نام ہوں تو غیر قطعی قسم
کے نام ہوں مثلاً الف۔ ب م و۔ "سلیماں سر بہ زانو اور سبا ویراں" اس کش مکش کا آئینہ دار ہے۔ اس
افسانے کو جو چیز پوری طرح تمثیل بننے سے روکتی ہے وہ اس کی زبان کی شاعرانہ شدت ہے جو روایتی
شاعرانہ نثر سے بہت مختلف ہے۔ کیوں کہ اس کی بنیاد حسی اور بصری پیکروں پر ہے۔ عبارت کے بیچ
میں اچانک غیر رسمی الفاظ کا استعمال بھی غالباً اسی لئے جان بوجھ کر کیا گیا ہے۔

"ہم چلتے تھے تو ہمارے پیروں کے نیچے دھواں دھواں ابخرات تھے، بھیگتے حباب، نرم
ملائم پولی زمین ہمارے سروں کا آسمان سورج، ظالم بے رحم بہت اوپر تھا۔ یہ خندق
بن جاتی تو میں بھی ایک گھر بناتا۔ سارا نگار خانۂ چیں بالکل ویسا ہی جیسا ہمارے
ماں باپ کا ہے۔ وسیع و عریض خوبصورت باغ۔ مولسری مولسری، ہار سنگھار، ستار
بجاتی پریاں، گلابی سرخ نہریں۔ کنیزیں اور غلام، لق و دق کمروں میں سجاوٹ
کے ساز و سامان منقش دیوار و در، بھاری پردے، شاہ بلوط کی چوڑی مسہریاں،
نرم ریشمی خوشبودار بستر اور ملگجی شمعیں اجالا، سلگتے ہوئے عود و عنبر۔ آزاد ہوتا تو چٹانوں
کے اس پار جاتا۔ اور سب کچھ دیکھتا۔ یہ حرام زادے سور اور کتا یہاں کیوں ہیں؟ کاش

زخم ٹھیک ہو جاتا اور یہاں سے بھاگ سکتا۔ ان چٹانوں سے دور، اس پھولی ہوئی سیاہ سرخ نرم ملائم زمین پر۔"

(سلیمان سر بہ زانو اور سبا ویراں)

"آہستہ آہستہ کمرہ کی تمام سلاخیں پر ہوتی جا رہی تھیں۔ کچھ پرندوں کی گردنیں، کچھ کے سینے اور پیٹ، کچھ کی ٹانگیں اور کچھ کے پر سلاخوں میں پھنسے ہوئے تھے اور پرندے اب بھی کھڑکی کے راستے داخل ہوتے اور پھنستے جا رہے تھے۔ بوڑھا دروازے سے مڑ کر پھر اسی کمرے کی طرف چلا اور دروازے سے ہی پکارنے لگا۔ اٹھو، اٹھو پرندے آگئے ہیں۔ تقریباً تمام سلاخیں بھر گئی ہیں اور لاتعداد پرندے اب بھی اڑ رہے ہیں۔ چلو ورنہ .... اچانک اس کی نظر سامنے دیوار پر داہنی طرف بنے سیاہ رنگ کے خاکے پر پڑی تو وہ لڑکھڑا گیا اور پاگلوں کی طرح چیختا ہوا دیوار کی طرف دوڑا پھر جھٹکے سے رک گیا۔ اس کی آنکھیں دہشت سے پھیلی ہوئی تھیں۔ وہ ایک ٹک اس سیاہ خاکے کو گھور رہا تھا۔"

(طلسمات)

"کسی غیر مرئی جھٹکے کی وجہ سے اس کی آنکھ تو کھل گئی لیکن وہ سمجھ نہ سکا کہ کیا ہو گیا ہے۔ گھپ اندھیرا۔ چاروں طرف بکھرا ہوا اندھیرا۔ وہ طے نہیں کر سکا کہ وہ ہے کہاں۔ آسمان کدھر ہے اور زمین کتنی دور ہے۔ وہ کھڑکی کہاں گئی جو میرے داہنے ہاتھ کے بہت قریب تھی۔ مشرق و مغرب، شمال و جنوب اب کدھر ہوں گے۔ بہت دیر تک دماغ سائیں سائیں کرتا رہا۔ پھر آنکھ کے اندر پٹ پٹ کچھ بولنے لگا۔ اس کے ساتھ ہی اندھیرے میں مٹیالے رنگ کے چھوٹے چھوٹے پروانے سے اڑنے لگے۔ سر کے نیچے آسمان، اوپر زمین۔ اس نے جلدی سے آنکھیں بند کر لیں۔ دل اور تیزی سے دھڑکنے لگا اور بہت سے دائرے گڈمڈ ہو کر اسے اوپر کی طرف اٹھانے لگے۔ اوپر اور اوپر۔ کیا یہ کل رات کی بارش اور طوفان کا اثر ہے۔

میں یہاں کب آیا؟ کب سے اس طرح پڑا ہوں؟ پتہ نہیں ٹرین گزر گئی کہ نہیں؟ اس نے آنکھیں کھول دیں اور اندھیرے میں گھورنے لگا۔ ان گھونسلوں سے پھر تنکے اڑ گئے ہوں گے۔ لیکن دروازہ تو باہر سے بند ہوگا۔

"آنکھیں اندھیرے سے مانوس ہونے لگیں تو دیواروں پر عجیب عجیب سے دھبے واضح ہونے لگے۔ کچھ پرچھائیاں ان دھبوں پر رینگ رہی تھیں۔ اس نے بے ساختہ مخالف سمت دیکھا۔ وہاں بھی ویسی ہی پرچھائیاں تھیں۔ مکڑی کے جالے ہیں۔ وہ ان دھبوں اور پرچھائیوں کو گھورتا رہا۔ پھر وہ دھبے بڑے ہونے لگے اور بڑے ہوتے ہوتے سارے کمرہ میں بکھر گئے۔ اس کے چاروں طرف کچھ رینگنے لگا۔ دو چوہے لڑتے ہوئے اوپر سے اس کے سینے پر ٹپک پڑے تو وہ گھگھیاتا ہوا اٹھ بیٹھا۔ لیکن اٹھتے ہی اسے محسوس ہوا جیسے اس کی پیشانی سے نور ساطع ہو رہا ہو۔ وہ خوف زدہ ہو کر ایک طرف کھسک گیا۔"

(سانپ)

"سلیماں سر بہ زانو اور سبا ویراں" ماضی کے اس ورثہ سے آزاد ہونے کی ناکام کشمکش کے المیہ کی داستان ہے۔ یہ ورثہ افسانہ نگار کی داخلی شخصیت پر ارزل و اسفل جانوروں کی علامتوں کے ذریعہ ظاہر ہوا ہے۔ افسانہ کی خوبی یہ نہیں ہے کہ افسانہ نگار (یا جس نے بھی یہ افسانہ بیان کیا ہے) اپنی تہذیبی شخصیت کے ان عناصر سے آزاد ہونے کی کوشش کر رہا ہے جو نادر فیگر کی صورت میں اس کی شخصیت کو پوری طرح بڑھنے اور پھیلنے نہیں دیتے۔ خوبی دراصل یہ ہے کہ خود اس تہذیبی ورثے کے بارے میں یہ حکم لگانا ممکن نہیں ہے کہ وہ افسانہ نگار کے لئے واقعی مضر یا زحمت رساں ہے بلکہ یہ بھی کہنا مشکل ہے کہ ایسا کوئی ورثہ اس کی شخصیت (یعنی تخلیقی شخصیت) کے اظہار کے لئے نقصان دہ یا فائدہ مند ہے کہ نہیں۔ اس افسانہ میں اور اسی طرح طلسمات میں اسرار کی جو کیفیت ہے وہ دراصل ایک بے نام داخلی کرب کی وجہ سے ہے۔ ان دونوں افسانوں کو اگر صرف ایک ہی حقیقت (یعنی تہذیبی اور ذاتی ماضی کی دریافت اور اس سے آزاد ہونے کی کوشش) پر ہی مبنی رکھا جائے تو یہ افسانے تمثیل سے زیادہ کچھ نہیں۔ ان کا علامتی کردار اس نکتہ کا مرہون منت ہے کہ دریافت کا عمل احساس کے بعد نہیں بلکہ اس کے پہلے ہو چکا ہے۔ لہٰذا اس احساس کی کئی تعبیریں ممکن ہیں۔

قمر احسن کے افسانوں میں ایک عمومی اساطیری اور داستانی اسلوب کی بنا پر بعض لوگوں کو گمان گزر سکتا ہے کہ انھوں نے انتظار حسین سے ضرور کسب فیض کیا ہوگا۔ یہ بات اس حد تک تو صحیح ہو سکتی ہے کہ داستان یا نیم اساطیری یا نیم تاریخی طرز کو افسانہ کے لئے انتظار حسین نے جس خوبی سے استعمال کیا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے لیکن افسانہ سازی کا وہ عمل اور افسانے کا وہ سڈول پن جو بیانیہ اور مکالمہ کے بہترین امتزاج کا نمونہ ہے اور جو انتظار حسین کا طرۂ امتیاز ہے وہ قمر احسن کے یہاں نظر نہیں آتا۔ قمر احسن افسانے کی مختلف کڑیوں کو اور واقعہ کی مختلف ڈوریوں کو نہ الجھاتے ہیں نہ سلجھاتے ہیں بلکہ الگ الگ ادھوری شکل میں چھوڑ دیتے

ہیں۔ ایک طرح سے ان کا افسانہ انتظار حسین سے فرار کی ایک کوشش ہے۔ اور ممکن ہے کہ اس کوشش میں انھوں نے انور سجاد کی مثال سامنے رکھی ہو۔ لیکن افسانوی شخصیت کے طور پر جو چیز قمراحسن کو ممتاز کرتی ہے اور ان کے افسانوں میں محرومی اور شکست رسیدگی کا ایک نیا تاثر پیدا کرتی ہے۔ وہ یہ ہے کہ قمراحسن اپنی اجتماعی تہذیب کو صرف اپنے ذاتی حوالہ سے پڑھتے ہیں۔ ان کا المیہ اجتماعی تہذیب کے زوال کا المیہ نہیں ہے۔ بلکہ اجتماعی تہذیب کے اس حصہ سے برأت کے اظہار کا المیہ ہے جس نے ان کی شخصیت کی تعمیر کی ہے۔ یعنی دنیا انھیں تشکیک اور خوف اور گم کردگی سے عبارت نظر آتی ہے۔ جب کہ ان کی ذاتی تہذیبی شخصیت انھیں اوہام وعقائد اور اسرار میں دلیل صبح روشن دیکھنے پر مجبور کرتی ہے۔

قمراحسن نے نثر کا جو اسلوب اختیار کیا ہے اس میں داستانی گرینڈ اسٹائل اساطیری اسرار سے بھرپور سادہ اسلوب اور روزمرہ میں استعمال ہونے والے بے تکلف الفاظ ملے جلے ہیں۔ اور یہ امتزاج بھی ان کی اسی داخلی کش مکش کا آئینہ دار ہے جو ان میں اجتماعی اور ذاتی تہذیب کے پروردہ ہونے کے احساس اور اس احساس سے بیزاری کی بنا پر وجود میں آئی ہے۔

جیسا کہ میں اوپر کہہ چکا ہوں قمراحسن کی تخلیقی حسیت تہذیبی ماضی کے امتزاج اور اس امتزاج سے آزاد ہونے کی ناکام کوشش کا اظہار کرتی ہے۔ میں سہل پسند نقادوں کی طرح یہ کہہ کر دل خوش کرنا نہیں چاہتا کہ ان کا بچپن اور لڑکپن تلخ نارسائیوں میں گزرا ہوگا اور ان کے بیدار ہوتے ہوئے شعور نے اس تمام عقیدہ اور رسم ورواج کے اندر جال کو توڑنے کی کوشش کی ہوگی جو ان کی نظر میں اپنی ان تلخ نارسائیوں کا سرچشمہ رہا ہوگا۔ تخلیقی ذہن اور اس کے اظہارات کی توجیہہ وتفسیر اگر اتنی ہی آسان ہوتی تو کافکا کے سہل پسند نقادوں کو اتنے پاپڑ نہ بیلنے پڑتے۔ جہاں تک ہم جانتے ہیں کافکا کا بچپن اور لڑکپن والدین سے اور خاص کر اپنے باپ سے یگانگت اور ہم آہنگی میں گزرا۔ اس مفہوم میں کہ اسے اپنے باپ سے محبت تھی اور اسے اس بات کا بھی احساس تھا کہ اس کے باپ کو اس سے محبت ہے۔ اس کے باوجود اس کی تمام تحریروں میں اس بات کا نمایاں احساس ہے کہ باپ کی شکل میں با اختیار شخصیت یعنی فادر فیگر کا وجود اس کے لئے تکلیف دہ تھا۔ باپ کے نام اپنے مشہور خط میں وہ لکھتا ہے:

> "واقعی یہ بالکل ممکن ہے کہ اگر میں آپ کے اثر سے قطعاً آزاد ہو کر پروان چڑھا ہوتا تو بھی آپ کے ڈھب کا انسان نہ بن سکتا۔ میں شاید پھر بھی کچھ مریض سا بزدل ہچکچانے والا بے چین سا شخص بنتا... بات صرف یہ ہے کہ آپ جیسے ہیں یعنی میرے باپ کی حیثیت سے، آپ میرے لئے کچھ زیادہ ہی قوت مند ثابت ہوئے ہیں۔"

اس اقتباس سے ظاہر ہے کہ باپ بیٹے میں پوری محبت کے باوجود کچھ ایسی چیز ممکن ہے جس کی بنا پر بیٹا باپ کے اثر سے آزاد ہونا چاہے لیکن آزاد نہ ہو پائے تو اپنے ماضی کو مسترد کر دے۔ ساری مشکل یہ ہے کہ باپ جب ماضی بن کر تہذیب کا اور روایت کا نمایندہ بن بیٹھتا ہے تو اس کی افسانوی شکل بغاوت سے زیادہ گھبراہٹ کی شکل میں نمایاں ہوتی ہے اور اس گھبراہٹ کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ فن کار خود اپنی شخصیت کی دریافت میں اس وجہ سے ناکام رہتا ہے کہ قدم قدم پر اس کو باپ کی شکل میں ماضی نظر آتا ہے۔ پھر معاملہ اچھائی، برائی کو طے کرنے یا فلسفیانہ سطح پر رد و قبول کا نہیں ہوتا بلکہ گہری داخلی سطح پر خود کو ثابت کرنے یا خلق کرنے کا ہوتا ہے۔ اپنی ڈائریوں میں کافکا نے اس کی طرف اشارے کئے ہیں۔

۶ مئی ۱۹۱۲ء کی ڈائری میں وہ لکھتا ہے کہ "میں نے خواب میں دیکھا کہ میں اپنے باپ کے ساتھ شہر برلن میں ایک ٹرام کار میں سفر کر رہا ہوں۔ ایک پھاٹک کے پاس پہنچ کر ہم دونوں ٹرین سے اترے لیکن اترنے کا کوئی احساس نہیں ہوا۔ ہم ایک پھاٹک میں سے گزرے جس کے بعد ایک سیدھی اونچی دیوار تھی جسے میرے باپ نے انتہائی آسانی سے گویا رقص کرتے ہوئے پار کر لیا۔ اس کے برعکس میں بڑی مشکلوں سے دیوار پر چڑھ سکا۔ اپنے چاروں ہاتھوں پیروں سے کوشش کرنے کے باوجود میں بار بار نیچے پھسل آتا۔ گویا دیوار مشکل سے مشکل تر ہوتی جا رہی ہو۔ پھر میں نے یہ بھی محسوس کیا کہ ساری دیوار انسانی غلاظت سے ڈھکی ہوئی ہے اور اس کے لمبے لمبے چیتھڑے میرے جسم پر خاص کر میرے سینے پر چپکے جا رہے ہوں۔"

خواب اس کے آگے بھی چلتا ہے لیکن اب تک کی بیان کی ہوئی تفصیلات یا اشارے بیٹے کافکا اور فن کار کافکا کی کشاکش باپ اور خدا اور خاص کر باپ کی اس خدائی کیفیت کے خلاف گھبراہٹ اور بے چارگی کا اظہار کرتی ہے کہ خدا سب کچھ دیکھتا ہے لیکن کرتا کچھ نہیں۔ ان الجھنوں کے پیچھے بچپن کی صرف معمولی نارسائیاں نہیں ہیں بلکہ دریافت کے عمل کی ناکامی کا المیہ ہے۔

قرۃ العین حیدر... قمر احسن کے ناول "آگ الاؤ صحرا" میں اسی کش مکش کا اظہار ہوا ہے۔ حالانکہ ان کے یہاں ابھی کافکا کی سی شدت، بیانیہ کی پر اسرار ارتکازی قوت اور شاہانہ لاشخصی اندازِ بیان کا پتا بھی نہیں لیکن مسئلہ دونوں کا ایک ہی ہے۔ قمر احسن نے جو اسلوب اختیار کیا ہے اس میں خواب، حافظہ، یاد اور واہمہ سب ایک ہو جاتے ہیں۔ ان کا مسئلہ کافکا کے مقابلہ میں نسبتاً آسان ہے کیوں کہ وہ بخوبی واقف ہیں کہ انھیں کن روایتوں سے بغاوت کرنی ہے۔ لہٰذا ان کے یہاں گم کردہ راہی کی جگہ بے چارگی کی کیفیت ہے۔ اگر اس بے چارگی میں خود ترحمی کا جذبہ نہ شامل ہوتا تو اظہار کی شدت کہیں سے کہیں پہنچ جاتی موجودہ صورت میں وہ کہیں کہیں جذباتی خطابت کی دلدل میں پھنس جاتے ہیں لیکن لڑکپن سے قبل از بلوغ کے

وہ تمام کرب اور تمام گرہیں جو جنس سے لے کر شکست اعتقاد تک پھیلی ہوئی ہیں "آگ الاؤ صحرا" میں سرتاسر نمایاں ہیں۔

" لیکن میرے ظہور کے لئے تو ایک وقت معین ہو چکا تھا اور اسی درمیان اس نے تیسرے سفر کی ابتدا کر دی تھی اور میں وشادیوگ جذبۂ غم ویاس کے چکر میں پڑ کر پرسادیوگ یعنی آخری جزا کا انتظار کرتے رہنے پر مجبور ہوتا گیا۔ دیکھیں یہ پرسادیوگ اب کون سا نیا رنگ لے کر آتا ہے۔"

" آم کے درختوں میں چھپے قبرستان سے نکل کر اس نے کہا سنو! ہمارا فرض صرف اتنا ہی نہیں ہے کہ ہم اپنے ہم عصروں میں ممتاز ہوں بلکہ ہمیں اپنے بعد والوں کے تجربہ کی کسوٹی پر بھی پرکھا جانا ہے جس کا نتیجہ ہم نہیں۔ اس لئے ہماری ذمہ داری اب آج سے کئی گنا بڑھ گئی ہے۔ میں ڈرا سہما اسے اس قبرستان کی حدود سے نکال لایا۔"

" اکثر میں اس سے نفرت بھی کرنے لگا ہوں۔ جہاں وہ روحوں سے چشم پوشی کر کے نچلی سطح پر آجاتا تھا اور قینچی چرا کر خلوت کی مٹیوں میں دفن کرنے لگتا تھا یا بڑھیوں کی ڈھلی چھاتیوں کا تصور کر کے اپنی ہی بیوی کو اپنی ہی بغل میں عریاں سوتا دیکھتا تھا۔ لیکن نہ جانے کیوں میں بے بس رہ جاتا۔ صرف یہ سوچ کر کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ پیاری گائے کی شکل میں وہ خود ہی دروازہ پر کھڑا ہو۔ اس لئے بے زبان ہو کر ان حرکات کو صرف " آسری سمپتی " کہہ کر " دیوی سمپتی " کا روشن دن تلاش کرنے لگتا تھا۔ اس لئے کہ کبھی وہ خود ہی مجھ سے غافل تھا اور میں خود ہی تب اپنے وجود میں مضمر طاقتوں کا احساس نہ کر سکا تھا۔"

(آگ الاؤ صحرا۔ چوتھا باب)

ایسا نہیں ہے کہ افسانے کا مرکزی کردار جو کاظم بھی ہے اور قمر احسن بھی صرف اسی لیے المیہ شناس ہے کہ وہ اپنے وجود میں مضمر طاقتوں کا احساس نہ کر سکا تھا بلکہ بنیادی بات یہ ہے کہ وہ اپنے وجود ہی کا اعتراف کر کے فادر فیگر کے سامنے خوف کا شکار ہو جاتا ہے۔

" جاؤ بھائی کاظم جاؤ نا۔ اور خانقاہوں میں تعلیم حاصل کرو خودداری، اصول، تزکیۂ نفس اور انفرادیت کے ڈھول پیٹو۔ لڑکیوں کو دیکھو تو اپنے طویل ترین بالشت سے اپنی آنکھیں بند کر لو۔ جب لوٹ کر آؤ تو ان سے منسوب کر کے دوسروں کو جھوٹے قصے

سناؤ۔ آج میں نے فلاں لڑکی کو یوں ڈانٹا کہ وہ میری طرف یوں دیکھ رہی تھی۔ آج میں نے فلاں لڑکی کو طمانچہ مار دیا کہ وہ مجھ سے ہی نوٹس کی کاپی لینے پر بضد تھی اور مجھے مغرور کہہ رہی تھی۔ جاؤ بھائی کاظم۔ اسے زندہ رہنے کا سبق دو۔ لیکن یاد رکھنا کہ خود تمھیں بھی ابھی کچھ نہیں آتا۔ بس تزکیۂ نفس کئے جاؤ۔ جب آنکھ کھلے گی تو خود ہی سارے سبق جان لوگے۔ جیسے آج ڈاکٹر داس نیم پاگل ہو کر جان گیا ہے۔"

"کاظم بھائی۔ اب یہ صرف ایک روایت ہے جسے تم نباہ رہے ہو۔ ورنہ اب تمھیں بھی اپنے فلسفوں کے کھوکھلے پن کا یقین ہو گیا ہے۔ لیکن تم بھی کیا کر سکتے ہو کہ سرگشتۂ رسوم ہو اور سارے توہمات کو اسی رسم سے باندھتے چلے آ رہے ہو۔ تم ڈرتے ہو—تو تو—تو—تو—دوسروں کے نزدیک تو جا کر دیکھو۔ تمھیں تمھارے علاوہ ہر شخص مکمل ملے گا۔

تب میں گھبرا کر چیخ اٹھتا—ہاں—ہاں—یار یہ صرف دھوکہ ہے جو میں اپنے آپ کو۔ اسے۔ دیتا آ رہا ہوں۔ مسلسل سراب پیمائی کر رہا ہوں۔ لیکن کیا کروں کہ کمزور پتھر کی طرح لڑھنا ٹھوکر کھانا اور سر پر ایک لاش اٹھائے رکھنا میرا مقدر ہو چکا ہے۔ جس کا خون میری آنکھوں سے ٹپکتا رہا ہے۔ ٹپک رہا ہے اور شاید ٹپکتا رہے گا۔

ہاں—سچی بھائی تم ٹھیک ہی کہتے ہو۔"

(آگ الاؤ صحرا۔ نواں باب)

"آگ الاؤ صحرا" ایک ایسے نوجوان کی داخلی داستان ہے جو اپنے آپ کو دریافت کرنا چاہتا ہے لیکن وہ یہ محسوس کرتا ہے کہ اس دریافت کے لئے اسے اپنے ذاتی اور تہذیبی دونوں ماضیوں کو جھٹلانا ہوگا۔ لیکن یہ ناول ہمارے عہد کے ہر نوجوان کی داستان نہیں بن سکا ہے یہی اس کی کمزوری ہے اور شاید یہی اس کی قوت بھی۔ لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ انفرادی روح اور خاص کر انفرادی فن کارانہ روح کے نہاں خانوں میں مسلسل سفر کا جو عمل قمر احسن کے یہاں ملتا ہے وہ ہمارے عہد میں بے مثال ہے۔ دیکھنا صرف یہ ہے کہ انفرادی ارتقار کی داخلی داستان اگر مکمل آفاقیت نہیں تو ایک وسیع عمومیت کب اختیار کرتی ہے۔ میرا اندازہ ہے کہ قمر احسن کا دوسرا قلم اب اسی طرف اٹھے گا۔

نئے لکھنے والوں کے بارے میں تنبیہی، تعریفی، مربیانہ اور پیشین گویانہ جملے لکھنا ہمارے نقادوں کا محبوب اور مقدس مشغلہ ہے۔ میں یہ کام انھیں پر چھوڑ دیتا ہوں اور آپ کو قمر احسن کے افسانے پڑھنے کی دعوت دیتا ہوں۔

—— شمس الرحمٰن فاروقی

آگ

تعاقب

گولیوں کا ایک راؤنڈ اور چلا ۔ کئی چیخیں لپکیں اور دھوئیں کی طرح اوپر اٹھتی چلی گئیں ۔ اوپر سے پھیلتی ہوئی ، وہ سب سمٹنے لگیں اور پھر معدوم ہوگئیں ۔ دور سے فوراً ہی بعد کچھ ویسی ہی چیخیں پھر ابھریں ۔ لیکن شاید یہ بعد والی چیخیں پہلی چیخوں کی بازگشت تھیں ۔

اس آخری راؤنڈ کے بعد ان کے پاس گولیاں ختم ہوگئی تھیں ۔ وہ سب اپنے اسلحے گھماتے ہوئے ادھر ادھر دیکھ رہے تھے ۔

اب ان رائفلوں ، مشین گنوں ۔ اسٹین گنوں میں کیا بھریں ۔ کیا یہی سوکھی گھاس اور وہ دور پڑے ہوئے پتھر ــــ ؟ شاید سڑک بننے والی تھی ۔

سب کے سب بے دلی سے ٹہلتے ہوئے پاس ہی رکھے ہوئے لکڑی کے کندوں پر بیٹھ گئے ۔ ایک نے زور سے جماہی لی تو دوسرے نے دو بیڑیاں اسے تھماتے ہوئے کہا۔

"لو سلگاؤ ۔"

دوسرے اس میڈل والے کو دیکھ رہے تھے جو ان سب سے زیادہ بے دلی سے آدھا لیٹا ہوا ، اوپر اڑتی ہوئی ایک چیل کو دیکھ رہا تھا ۔ اس کی آنکھیں سنہری دھوپ میں بھوری بھوری سی ہوگئی تھیں ۔

یہ دوسرے اس سے چھپا کر بیڑی پی رہے تھے ۔ شاید وہ ان سب کا افسر تھا ۔

اسی وقت بغل کی گلی سے ایک عورت نے جھانک کر دیکھا اور پھر جلدی سے چہرہ سمیت غائب ہوگئی ۔

سارے سپاہی اسی طرح بیٹھے رہے ـــــ لیکن افسر ـــــ نہ جانے کیسے ادھر ادھر دیکھنے لگا تھا۔

اتنے میں ان سب سے ذرا ہٹ کر دوسری گلی سے تیزی سے ایک سائیکل نکلی۔ ایک دبلا پتلا سا سیاہ رو آدمی سیٹ پر بیٹھا تیزی سے پیڈل مار رہا تھا۔

ارے وہ نکلا ـــــ دوڑو ـــــ افسر کہتا ہوا کڑبڑا کر اٹھا تو لکڑی کا کندہ ڈگمگا گیا۔ اتنی ہی دیر میں دوسروں نے بھی اپنی اپنی بیڑیاں بجھا کر وردی کی جیب میں رکھ لیں اور اسی طرف دیکھنے لگے جدھر سے سائیکل نکلی تھی۔ سائیکل کے کیرئیر پر ایک ادھیڑ عمر کی عورت بیٹھی تھی جس کی گود میں ایک بچہ تھا۔ اس سے کچھ بڑی عمر کا بچہ فریم پر بیٹھا تھا۔ اور ایک لڑکا اپنے دونوں پیر اگلے مڈگارڈ پر رکھے ہینڈل پر بیٹھا تھا۔ یہ شاید سب سے بڑا تھا۔

وہ سیاہ رو آدمی اپنی پوری طاقت سے پیڈل مار رہا تھا اور پسینہ بہہ بہہ کر اس کی آنکھوں میں گھسا جا رہا تھا۔ جسے فریم پر بیٹھا ہوا لڑکا مرد کے "ہوں" کہنے پر جلدی سے خشک کر دیتا۔ اس کے ہاتھ میں ایک رنگین سا کپڑے کا ٹکڑا تھا۔

ارے وہ نکلا جا رہا ہے ـــــ دوڑو ـــــ پیچھا کرو ـــــ ان سب کا افسر چیخا۔ اور سب گھبرا کر سائیکل کے پیچھے دوڑ پڑے۔

ارے وہ سب دوڑے آ رہے ہیں۔ سائیکل بھگاؤ۔ کیرئیر پر بیٹھی ہوئی ادھیڑ عمر کی عورت نے بلغم بھری ہوئی آواز میں گھبرا کر کہا۔ اور گود والے لڑکے کو سینہ میں دبانے لگی۔

منا تم سنبھل کر بیٹھے رہنا ـــــ اس نے آگے بیٹھے ہوئے دونوں بچوں میں سے کسی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

مرد کے پیر سائیکل کی پیڈل پر مشین کی طرح چلتے رہے۔

"ڈر لگ رہا ہے"، ہینڈل پر بیٹھے ہوئے لڑکے نے کپکپاتی ہوئی آواز میں کہا اور مرد نے اسے اپنی کلائیوں میں دبا لیا۔

گھبراؤ نہیں ـــــ گھبراؤ نہیں ـــــ ہوں ـــــ بس اب شہر نزدیک ہے۔

فریم پر بیٹھا ہوا لڑکا ہینڈل پر بیٹھے ہوئے لڑکے کو پسینہ پونچھتے ہوئے خاموشی سے گھور رہا تھا ـــــ ماں کی گود میں لیٹا ہوا لڑکا اپنے منہ سے ادھیڑ عمر عورت کا اوپری لباس اٹھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ عورت اس کوشش سے بے خبر انھیں آتے ہوئے سپاہیوں کو دیکھ رہی تھی جو لمحہ بہ لمحہ

نزدیک آتے جا رہے تھے۔ سب سے آگے وہی میڈل والا افسر تھا۔ حالانکہ مرد اپنی پوری قوت سے سائیکل چلا رہا تھا۔ مگر وہ سب کافی قریب آچکے تھے۔

اور تیز بھاگو ــــ عورت نے بچہ کو اور زور سے بھینچ کر گھبرائی ہوئی آواز میں کہا۔

سیاہ رو مرد نے جھٹکے سے سائیکل پر زور دیا لیکن سامنے ہی ایک گڑھا آجانے وجہ سے سائیکل اچھل گئی اور دھچکا لگنے سے عورت کی گود میں چمٹا ہوا بچہ اس کی گود سے پھسل گیا۔

ارے گڈو گر گیا ــــ چیخ کر ادھیڑ عمر عورت نے کودنا چاہا لیکن سیاہ رو مرد نے سائیکل قابو میں کرتے ہوئے روندھے گلے سے ڈانٹ دیا ــــ گرنے دو ــــ گرنے دو

سیاہ رو مرد نے سائیکل اور تیز کر دی۔

پیچھے سے آتے ہوئے میڈل والے افسر نے ہانپتے ہوئے کہا۔

ایک سالا گرا ہے ــــ رکنا نہیں ــــ گردن پر ــــ بوٹ ــــ وہ دوڑتا ہی دوڑتا اگلا پیر گرے ہوئے بچے کی گردن کے پاس رکھ کر سیکنڈ بھر کے لئے دباؤ ڈالتا گذر گیا بچہ کی چیخ ان بعد والے سپاہیوں نے سنی جو عین اسی جگہ جہاں افسر نے بوٹ سے دبایا تھا۔ چار کیل لگے ہوئے بوٹ رکھتے ہوئے گذر رہے تھے۔

ارے ــــ ؟ وہ ــــ انھوں نے ــــ اسے کچل ڈالا۔

عورت نے پشت سے سائیکل کی سیٹ پکڑ کر جھنجھوڑتے ہوئے کہا تو فریم پر بیٹھے ہوئے لڑکے نے سیاہ رو مرد کے ہوں کہنے پر جیسے ہی پسینہ خشک کرنے کے لئے ایک ہاتھ سے سائیکل چھوڑی اور اچک کر گھبراہٹ میں پیچھے دیکھنا چاہا ویسے ہی نیچے سرک گیا۔ چلتی ہوئی سائیکل میں پھنس کر جب اس نے سیاہ رو مرد کی ٹانگ پکڑ کر سنبھلنا چاہا تو سیاہ رو مرد نے سائیکل سنبھالتے ہوئے اسے اٹھا لینا چاہا لیکن گھبراہٹ میں بچہ زمین پر گر پڑا۔ سائیکل ذرا سا آگے بڑھ چکی تھی۔ ادھیڑ عمر کی عورت نے روتے ہوئے بچہ کو اٹھا لینا چاہا تو سائیکل جھکولا کھا کر گرنے لگی۔

ارے سور کی بچی کیا کر رہی ہے۔ سیاہ رو مرد نے سائیکل سنبھالتے ہوئے کہا ــــ لیکن عورت تو دس قدم پیچھے دوڑتے ہوئے بچہ کو دیکھ رہی تھی۔

رک جاؤ ــــ جاؤ ــــ جا ــــ رک ــــ عورت نے ہچکی لیتے ہوئے کہا ــــ منا آ رہا ہے ــــ وہ پاس آگیا ہے ــــ رو رہا ہے ــــ دوڑ رہا ہے ــــ !

لیکن سیاہ رو مرد نے اپنی ساری قوت لگا کر سائیکل اور تیز کر دی ــــ دوسرا سالا بھی

ملا ___ افسر نے اسی طرح دوڑتے ہوئے اپنے آپ سے کہا ___ پھر زور سے چیخا ___ رکنا نہیں۔
سنگین ___ پر ___ اچھال لو ___ سنگین ___

اور نزدیک آتے ہی اس نے دوڑتے ہوئے، بچہ کی کمر میں پوری طاقت سے سنگین چبھا کر اچھال دیا ___ پھر اس گرے ہوئے لڑکے کے جسم کے مختلف حصوں میں ذرا ذرا سے وقفے کے بعد چار سنگینیں دھنسیں اور لڑکے کو اچھالتی گئیں۔

اس ادھیڑ عمر عورت نے، بچہ کی چیخیں اور چبھتی ہوئی سنگینوں سے پہلے ہی اپنی آنکھ اور کان مضبوطی سے جکڑ لئے تھے۔ صرف ہینڈل پر بیٹھا ہوا لڑکا یہ سب دیکھ رہا تھا اور کانپ رہا تھا اور سیاہ رو مرد اپنی پوری قوت سے سائیکل کھینچ رہا تھا۔ ادھیڑ عمر کی عورت اب آہستہ آہستہ سائیکل پر جھول رہی تھی جیسے اس پر غشی طاری ہونے والی ہو۔

ارے انھوں نے اسے بھی مار ڈالا ___ ا ___ ا۔ ہینڈل پر بیٹھے ہوئے لڑکے نے اچھل کر چیختے ہوئے کہا ___ تو سائیکل کا توازن اور بگڑ گیا۔

ٹھیک سے بیٹھو ___ ورنہ تمھیں بھی دھکا دے دوں گا۔ مرد نے پھولتی سانسوں میں سائیکل پر اور دباؤ ڈالتے ہوئے کہا ___ بچہ نے سہم کر سائیکل جکڑ لی اور مرد کے چہرے کو دیکھنے لگا۔

ادھیڑ عمر عورت نے بہت آہستہ آہستہ آنکھ کھولی اور پھر دھیرے دھیرے اس نے خالی فریم کی طرف رخ کیا۔ جیسے وہ کچھ دیکھنا نہ چاہتی ہو۔ پھر بھی کچھ دیکھنا چاہتی ہو۔ لیکن دیکھ سکنے کی ہمت بھی نہ ہو۔

کیسا خواب ہے ___ ؟ وہ دھیرے سے بڑبڑائی ___ وہ بھی چھوٹ گیا ___ ادھیڑ عمر عورت کی آواز پر ہینڈل پر بیٹھے ہوئے لڑکے نے ہینڈل پر دباؤ ڈال کر پیچھے مڑ کر ادھیڑ عمر عورت کو دیکھنا چاہا ___ تو سائیکل گھماتے ہوئے وہ سیاہ رو مرد قابو نہ پاسکا اور سائیکل الٹ گئی۔

ابے سالے تو سب کو مروائے گا۔ سیاہ رو مرد نے جلدی سے سائیکل اٹھائی اور کود کر چڑھ گیا۔ ادھیڑ عمر عورت خالی خالی نظروں سے اس لڑکے کا سارا جسم ٹٹول رہی تھی۔

سیاہ رو مرد نے پیچھے دیکھتے ہوئے چیخ کر کہا " جلدی بیٹھو " اس نے لڑکے کا ہاتھ پکڑ کر فریم پر بٹھانا چاہا تو لڑکا مچل گیا۔

میں فریم پر نہ بیٹھوں گا۔ امی پر سے مُنا گرا ہے۔

سیاہ رو مرد نے گالی دیتے ہوئے جلدی سے ادھیڑ عمر عورت کو فریم پر بٹھایا اور لڑکے سے

پیچھے کیریر پر بیٹھنے کو کہہ سیٹ پر بیٹھ گیا۔ عورت اب بھی خالی خالی نظروں سے لڑکے کو دیکھ رہی تھی۔

اور سارے حملہ آور موڑ کے بالکل پاس آچکے تھے۔ ادھیڑ عمر عورت نے انھیں دیکھ کر جلدی سے آنکھیں بند کرلیں۔

رک جاؤ ــــ رک جاؤ ــــ ہم تم کو چھوڑ دیں گے ــــ افسر نے چیخ کر ہانپتے ہوئے کہا ــــ اب دوڑا نہیں جارہا ہے۔ اس نے لڑکھڑاتے ہوئے کہا ــــ اس کے پیچھے ہی بقیہ حملہ آور لڑکھڑا رہے تھے۔

سائیکل ایک جھٹکے سے پھر آگے بڑھی۔ لیکن عورت مڑ مڑ کر لڑکے کو دیکھے جارہی تھی اور سیاہ رو مرد پوری طاقت سائیکل کی پیڈل پر صرف کررہا تھا۔ سامنے ہی سڑک پر مرمت کے لیے مہین مہین کنکریاں ڈھیر تھیں۔ جیسے ہی سائیکل ان کنکریوں پر پہنچی ویسے ہی سلپ کرگئی۔ سیاہ رو مرد نے گھبرا کر اسے سنبھالا مگر وہ لہرا کر ایک طرف جھک گئی۔ ادھیڑ عمر عورت بیٹھی رہی۔ سیاہ رو مرد نے جلدی سے ایک پیر زمین پر ٹکا کر سائیکل بڑھائی۔ تب لڑکے نے جلدی سے کیریر پر بیٹھ جانا چاہا۔ مرد نے رفتار دھیمی کررکھی تھی کہ لڑکا آسانی سے بیٹھ جائے ــــ اور پیچھے مڑ مڑ کر دیکھتا جارہا تھا۔ حملہ آور بہت نزدیک آچکے تھے لیکن لڑکا کیریر پر نہیں بیٹھ پارہا تھا ــــ حملہ آور بہت نزدیک آگئے تھے ــــ مشکل سے بیس قدم ــــ ادھیڑ عمر عورت زور سے سائیکل کا ہینڈل پکڑے ہوئے تھی اور لڑکے کی طرف دیکھ رہی تھی۔

حملہ آور اور نزدیک آچکے تھے کہ اچانک مرد نے سائیکل اور تیز کردی۔ لڑکے کی چیخ کے ساتھ ہی حملہ آوروں کا افسر چیخ کر کہہ رہا تھا۔

کندے سے مارو ــــ کندے ــــ سے ــــ پھر اس نے بھاگتے ہوئے لڑکے کے سر پر دوڑتے ہی دوڑتے زور سے کندہ مارا۔

کھچاک کی آواز کے ساتھ ہی لڑکا گر کر تڑپنے لگا۔ پھر پیچھے سے آتے ہوئے دوسرے حملہ آور نے کندہ اٹھایا ہی تھا کہ ادھیڑ عمر عورت نے مڑ کر پیچھے دیکھ لیا۔

ارے میری ماں ــــ کندے سے مار رہے ہیں ــــ کہہ کر وہ بلبلاتی ہوئی کود پڑی اور سائیکل میں پھنس کر گر پڑی۔ سیاہ رو مرد نے بھی سائیکل روک لی اور سیاہ چہرے سمیت کپکپانے لگا۔

جب تک ادھیڑ عمر عورت سنبھل کر اٹھے حملہ آور لڑکے کو کندہ مارتے ہوئے اور نزدیک

آ چکے تھے۔ ادھیڑ عمر عورت اب تڑپتے ہوئے ـــــ اچھلتے ہوئے لڑکے کی طرف دوڑ رہی تھی۔

سالی اب کو دی ہے ـــــ حملہ آوروں کا افسر کہتا ہوا عورت کی طرف لپکا۔

سیاہ رو مرد نے سیٹ پر بیٹھتے ہوئے دیکھا۔ افسر اس ادھیڑ عمر عورت کے پاس کھڑا تھا اور دوسرے گھیرا بنائے ہوئے اسے لڑکے کے پاس جانے سے روک رہے تھے۔

مرد نے سائیکل بڑھادی۔ سامنے ہی ایک گڑھا تھا۔ اس نے گڑھے سے سائیکل بچائی اور پوری قوت سے پیڈل چلانے لگا۔

"ابھی شہر بارہ میل دور ہے" ـــــ اس نے سنگ میل دیکھ کر کہا۔ لیکن وہاں ـــــ بمباری نہ ہو رہی ہو ـــــ وہ آہستہ آہستہ شل ہونے لگا۔ □

صدیاں

عبداللہ المرزوقی کو پہلے تو پیدل چلنے میں بڑا مزا آیا۔ ریگستان کی ٹھنڈی ٹھنڈی ریت اور اس پر اگی ہوئی ڈھیروں چاندنی اسے تسخیر پر اکسا رہی تھی۔

لیکن اب اسے اکتاہٹ سی محسوس ہونے لگی تھی۔

ہونہہ۔ ناقے تو بلا وجہ خالی چلیں اور میں پیدل چلوں۔ لیکن لات کی قسم آج سے زیادہ میٹھی چاندنی کبھی نہ چھٹکی تھی۔

جھنجھلاہٹ کی ابتدا میں اسے عذرا یاد آگئی۔ "عزہ کی قسم! اگر تم اس وقت میرے ساتھ ہوتیں تو کتنا مزہ آتا۔

یہ بڈھا سردار نہ معلوم کیوں احوص کے اس عظیم ریگستان میں سفر کر رہا ہے۔ اگر میں اس کے قبیلے کا ہوں تو کیا یہ بھی ضروری ہے کہ اس کے ساتھ در بدر مارا مارا پھروں؟ مجھے تو احد کی ان سبز پوش وادیوں میں رہنا چاہئے جہاں عذرا رہتی ہے اور اس کے بہت سے اونٹ رہتے ہیں۔ جہاں ایک ساتھ بہت سی خوشبوئیں رہتی ہیں۔ وادیوں کی عذراؤں کی بھیڑوں کی اور کھجوروں کی جہاں صبح و شام نخلستان کی ہوائیں چلتی ہیں۔

"قسم ہے سردار کی اس تلوار کی جس سے اس نے بہت سے قبیلوں کے سرداروں کا سر کاٹا ہے۔ اگر وہ تلوار مجھے ملی تو میں پہلے اسی کا گلا کاٹوں۔ کالی بھیڑ۔ مجھے بزدل کہتا ہے۔"

"ارے او شاعر! تو حدی خوانی کیوں نہیں کرتا۔ اونٹ آہستہ ہو رہے ہیں۔" آگے سے مڑتے ہوئے سردار نے کہا۔

"ارے واہ! کیا میں کوئی پیشہ ور شاعر ہوں جو حدی خوانی کروں۔ وہ ٹال گیا۔ پھر ناقے خود بخود تیز ہو گئے۔

خوابیدہ ریت کے ٹیلوں کو دیکھ کر نیند کا تصور جاگ رہا تھا۔ جب عورتوں نے تھکن کا اظہار کیا تو قافلہ رک گیا۔

"عزہ کی قسم ہم لوگ قبیلہ بنو کلیب کے بہت نزدیک ہیں۔ وہ کلیب جن کی کھوپڑیوں میں کبھی ہم نے پرانی شراب پی تھی اور جن کی عورتوں نے ہمارے لئے اولاد پیدا کی تھی کہیں وہ شب خون نہ مار دیں ..."

شور سے جب عبداللہ کی آنکھ کھلی تو ریگستان میں سیاہ پوش چھاتے جا رہے تھے۔ سردار کہتا تھا کہ جنگ اشعث کے بعد بنی کلیب نے بنی مرزونہ سے انتقام لینے کے لئے سیاہ لباس پہن لیا تھا۔

"آج بنی کلیب کا انتقام پورا ہو رہا ہے۔" اس نے دل ہی دل میں قہقہہ لگایا اور پھر اپنے اس قہقہے پر شرمندہ ہو گیا۔

"ارے میرے قبیلے والے مارے جا رہے ہیں۔" وہ لپکتا ہوا سردار کے پاس پہنچا جسے تین حبشی غلام اپنے کاندھوں پر اٹھائے ہوئے تھے۔

"ارے او شاعر! کیا تیرا ضمیر بالکل ہی مردہ ہو گیا ہے؟ اپنے قبیلے والوں کا گیت گا۔ ان کی تلواروں کی کاٹ کی تعریف کر۔"

عبداللہ نے سوچا۔ میں کس کی تلواروں کی تعریف کروں۔ بنی مرزونہ کی یا بنی کلیب کی —؟

وہ وہاں سے بھاگ کر ٹیلے کے پیچھے چھپنے لگا۔ ہاہا! وہ غیر اختیاری طور پر ہنس پڑا۔ "اب بنی کلیب کے مردوں کے لئے بنی مرزونہ کی عورتیں بچے جنیں گی۔ لات کی قسم! کیا خوبصورت سرخ و سیاہ چاندنی ہے"۔

پھر وہ بہت زوروں سے گانے لگا۔

ہم وہ ہیں جنھوں نے ہمیشہ شاعری کی ہے
ہم وہ ہیں جو ہمیشہ سے بزدل رہے ہیں
ہم نہیں جانتے کہ ہندی تلوار، سنہرے نیزوں کی چبھن کیسی ہوتی ہے اور اس لئے

ہم سب سے بہادر ہیں کہ
نہ ہمارے سامنے زخم ہے اور نہ ہماری پشت پر
میری ماں مجھے جنتے وقت ہی مر چکی تھی۔ میں نے اونٹنی کا دودھ پیا ہے جو بزدل ہوتی ہیں اس . . .

یک بیک اس کا رجز ختم ہو گیا۔ اس لئے کہ سیاہی میں سے ایک سفیدی نکل کر اس کی کمر کے پاس آ ئی تھی۔ پھر اونٹنی کا سرخ دودھ اس کی پشت سے نکل کر ٹیلے کے گڑھے میں گرنے لگا تھا۔

کیا نیزہ اسی طرح چبھتا ہے کہ ہڈی بھی ٹوٹ جائے۔ اس نے مسکرا کر سوچا —— اور خون کے قطرے ترل ترل ٹیلے کے گڑھے میں جمع ہوتے جا رہے تھے۔

عارف عبداللہ چلتے چلتے ٹھٹھک گیا۔ اعوص کے ریگستان میں چاندنی کا کھیت تھا لیکن اب اسے اکتاہٹ سی محسوس ہونے لگی تھی۔ یہ سفر بھی کتنے بھونڈے ہوتے ہیں۔ انگریزی فرموں کے خشک گوشت کے ڈبے، سوکھے میوے اور پھپھوندی لگی ہوئی پاؤ روٹیاں۔

"لاحول ولا قوۃ۔ چھتری والوں کو بھی بس یہیں اترنا تھا" اسے اپنے ہوا بازوں سے نفرت ہونے لگی۔ "لیکن ہم لوگ لڑتے ہی کیوں ہیں ہاتھ جوڑ کر ——" اسے اپنے سے ڈر لگنے لگا۔

"کیا میں واقعی بزدل ہوں۔ میں خود ہی بلاوجہ ضد کر کے چلا آیا ہوں۔ اب تو ناقوں کی جگہ جیپ اور ٹینک نے لے لی ہے۔ ورنہ حدی خوانی ہی کرتا اور دور قدیم کا کوئی راگ ہی الاپتا۔

"قسم ہے اس اونٹنی کی جس کی پشت پر میں پیدا ہوا تھا"

"ہشت کتنا ردی خیال ہے —— یہ اسکندریہ کے قہوہ خانے اتنے حسین کیوں ہوتے ہیں۔ کاش اس وقت میں وہاں ہوتا"

"ارے او شاعر! تم اس وقت کوئی غزل کیوں نہیں گاتے؟" کمپنی کمانڈر نے اپنا وزنی تھیلا اچھالتے ہوئے کہا۔

"اہا زبردستی ہے کوئی؟ نہیں سناتے۔ یہ فوجی لوگ ایسے ریگستانوں میں آ کر غزل سنانے کی فرمائش کیسے کر لیتے ہیں اور کیوں کرتے ہیں؟" (بزدل لوگ سوچتے زیادہ ہیں کہتے کم ہیں)

"انسان اپنے دشمنوں سے کب تک پچتا رہے گا۔ جب کہ وہ خود اپنے سے ہی لڑکر اپنا لاشہ اٹھاتا رہتا ہے"۔ کمانڈر نے دور ٹیلوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

اب یہ فلسفہ پر بور کرے گا اور پھر اپنی بے وفا محبوبہ کو یاد کرکے رو دے گا جس نے اس سے کبھی کہہ دیا تھا کہ میں تم سے نفرت کرتی ہوں اس لئے کہ تم غریب ہو۔ حالانکہ ایسی کبھی کوئی بات ہوئی"۔ پھر عارف نے چاند کی طرف سر اٹھا کر زور سے نعرہ لگایا۔

ہم یہاں پراگندہ اور اپنے آپ سے گھبرائے ہوئے بھٹک رہے ہیں اور تم (اے چاند) میری محبوبہ سے سرگوشیاں کر رہے ہو۔

دیکھ اس سے میرا تذکرہ نہ کرنا ورنہ ——

وہ صرف تم کو دکھانے کے لئے اداس ہو جائے گی اور کسی قہوہ خانے میں

بیٹھ کر اپنے دوستوں کے درمیان

میرا مضحکہ اڑائے گی۔ بڑا بے وقوف تھا وہ

بڑا عقلمند تھا وہ۔ میرا چارلیٹ کافی لاؤ

کمپنی کمانڈر کو شاید اپنی محبوبہ بری طرح یاد آنے لگی۔ اس لئے اس نے سب کو آرام کا حکم دے دیا۔ تاکہ وہ خود ذرا سا رو لے۔

"مجھے بزدل تو یہ فوجی ہے جو رونے کے لئے بہانہ تلاش کرتا ہے۔ حالانکہ رونا بزدلی نہیں ہے"۔

"دیکھو دشمن ہم سے نزدیک بھی ہو سکتا ہے۔ کچھ لوگ جاگتے رہو۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ رات میں حملہ کر دے"۔

کمپنی کمانڈر نے ایک حملے سے خوف زدہ ہو کر دوسرے حملے سے خوف زدہ کیا۔ اس کی آواز کی بھراہٹ ریت کے ذرات میں مل گئی۔

عارف بڑبڑاتا ریت پر اوندھا لیٹ گیا —— ریڈیم ڈائل کی گھڑیاں جب دو پر پہنچیں تو مشین گن کی اچانک ریٹ ریٹ سے عارف عبداللہ اٹھ بیٹھا۔ کچھ گولیاں اس کے سر پر سے گذریں تو اس نے جلدی سے سر ریت کے ایک گڑھے میں چھپا لیا جس سے اس کے منہ میں ڈھیر سی ریت چلی گئی۔ پھر یک بیک اس نے گھبرا کر ریت پر سے منہ اٹھا لیا اس لئے کہ ریت کے ذروں میں اسے خون کی نمکینی محسوس ہو رہی تھی۔

"ارے میرا خون ریت کے اس گڑھے میں کب گرا تھا۔؟؟؟"

پھر وہ چھپا چھپا زوروں سے قہقہے لگانے لگا اور اس کے قہقہے بڑی شدت کے ساتھ مشین گن کی آواز میں ملتے جا رہے تھے۔ پھر وہ ہنستے ہنستے رونے لگا۔۔۔

اور مشین گن بھی آخری ہچکیاں لینے لگی تھی۔

"سب مر گئے"۔ اس نے دھیرے سے کہا۔ "اب کیپٹن کی محبوبہ کسی کلب میں بیٹھ کر اس کا تذکرہ کرے گی اور اپنے عشق کی داستان سنائے گی۔" وہ ریت کے ڈھیر کے اندر چھپا چلا گیا اور اس کا ذہن ان کے سامنے آ کر چیخنے لگا۔

ہم وہ ہیں جنھوں نے ہمیشہ غزل گائی ہے۔ ہم ہمیشہ سے بزدل ہیں۔

ہم نہیں جانتے کہ تھری ناٹ تھری اور اسٹین گن کی گولیوں میں کیا فرق ہوتا ہے۔

ہڈیاں ٹوٹتی ہیں تو آواز آتی ہے اور جب کوئی ہنستا ہے تو بھی آواز آتی ہے۔

ہم بزدل ہیں، ہمیں نفرت چاہیے۔ اسے نفرت تو کتنی خوبصورت ہوگی۔

"لیکن میں بزدل نہیں ہوں!" وہ چیخ اٹھا۔ اس کی چیخ سرد لاشوں پر سے گذر گئی اور وہ گھسٹتا ہوا آگے بڑھا۔ سارے میدان میں لاشیں بکھری تھیں۔ خشک میوے اور گوشت کے ڈبے غائب تھے۔ پاؤ روٹیاں خون میں لتھڑی ہوئی تھیں اور پانی کی چھاگلیں ایسی مایوس آنکھوں سے اسے گھور رہی تھیں۔

وہ تیزی سے جھک کر ریت کے ذروں کو اچھالنے لگا۔

ہمیں افسوس کے ریگستان سے پیار ہے قسم ہے اس عظیم ریگستان کی ہم بہت بہادر ہیں اور بہت بہادر ہیں۔ ہماری محبوبائیں بزدل ہوں گی، ہمیں بزدل نہ کہو۔ ہم باشعور شاعر ہیں۔

اس نے دور پڑی ایک رائفل اٹھائی اور چاند کو نشانہ بنا کر فائر کرنے لگا۔

"ہاہا۔ سب سارے زخمی ہو گئے۔ ان کا چاندی جیسا خون سارے ریگستان پر ٹپک رہا ہے۔" اس وقت کمپنی کمانڈر نے آہستہ سے سانس لی تو اس کی رائفل کی نال گھوم گئی۔ ٹھائیں ٹھائیں۔

پھر عارف عبداللہ ناچنے لگا۔

دورِ قدیم کا کوئی جنگلی رقص ہیجان، برانگیختگی، انتقام، پیاس، تھکن اور پھر فرار۔ وہ رقص کرتے کرتے چیخ چیخ کر رونے لگا۔

"میری سابقہ محبوباؤ۔ آؤ۔ سب مل کر نوحہ کریں ان زخمی ستاروں کا۔ اعوص کے اس عظیم ریگستان کا۔ اسکندریہ کے اس قہوہ خانے کا جہاں کمانڈر کی محبوبہ اس کا مذاق اڑاتی تھی۔ آؤ ماتم کریں اپنے آپ کا۔ اپنی روح کا اور اپنے اس ذہن کا جو دور کھڑا ہے۔"

اس نے اپنے تمام کپڑے پھاڑ ڈالے اور عریاں ہو کر خون ملی ہوئی ریت پر لوٹنے لگا۔ پھر تھک کر وہیں سو گیا۔

تیز جلن سے جب صبح اس کی آنکھیں کھلیں تو ایک گدھ اس کی کھلی ہوئی پنڈلی کا گوشت نوچ رہا تھا اور بہت سے دوسرے گدھ دوسری لاشوں سے لپٹے ہوئے تھے۔

وہ مسکرا اٹھا۔ "چلو سڑن اور بدبو سے نجات ملے گی۔"

پھر اس نے اپنی پنڈلی سے بہتے ہوئے خون کو دیکھا اور اٹھ بیٹھا۔

سورج اپنی زہریلی آنکھوں سے اس اکیلے شخص کو گھور رہا تھا۔ ریگستان آہستہ آہستہ دہک رہا تھا۔

کچھ دیر تک تو وہ یوں ہی سامنے دیکھتا رہا۔ گدھ اس کی زندگی سے ڈر کر دوسری لاشوں پر جا کر لڑ رہے تھے۔ تھوڑی دیر بعد اسے احساس ہوا کہ وہ بھوکا اور پیاسا ہے تو سامنے ایک نہر نظر آنے لگی ... اف کتنا ٹھنڈا پانی ہوگا۔

وہ سراب کے لئے بہت دور تک دوڑتا چلا گیا اور پھر واپس پلٹ پڑا۔

"ارے نہر تو پیچھے ہی چھوٹ گئی ــــ" پھر لاشوں تک آتے آتے وہ گر پڑا۔ اسی وقت اس کا ذہن پھر باہر آگیا۔

"ارے وہ تو سراب تھا۔" اور ذہن کی اس آواز پر وہ مسکرا اٹھا۔ "ہاں مجھ سے بھول ہوگئی۔"

پھر اس کے ذہن نے اسے یاد دلایا کسی انگریز مصنف نے لکھا تھا۔

ریگستان میں پیاسا انسان پہلے تو سراب کے پیچھے دوڑتا ہے پھر تھک کر بیٹھ جاتا ہے۔ (.....) اور بیٹھا بیٹھا یہ سوچتا ہے کہ وہ سراب تھا جس کے پیچھے وہ دوڑا تھا (.....) پھر وہ رونے لگتا ہے (.....) اور پھر جب دھوپ تیز ہونے لگتی ہے تو وہ قہقہہ لگاتا ہے (.....) دھوپ جب اور تیز ہونے لگتی ہے تو اس کا جسم چیخنے لگتا ہے (.....) جب اور تیز ہوتی ہے تو وہ پاگل ہو جاتا ہے (.....) اور پھر ایک وقت ایسا آتا ہے جب وہ اپنا خون پینے لگتا ہے۔ تقریباً تین بجے۔"

اس نے جب اپنا خون چکھا تو بڑا مزا آیا۔ جیسے اسکندریہ کا نیم گرم قہوہ۔ وہ زور سے

ہنس پڑا اور خیالی تلوار چلانے لگا...... اف بنی مرزونہ کی کھوپڑیوں میں بنی کلیب شراب
پی رہے ہیں اور ان کی عورتیں ۔ جھن نن نن نن ..... سب تلواریں ٹوٹ گئیں ۔ ایک گدھ نے
اس کی آدھی کھلی ہوئی آنکھ نوچ لی تھی ۔ عارف عبداللہ کو تکلیف کا احساس نہیں ہوا۔ بس اسے
اتنا معلوم ہوا کہ اس کا ذہن اس کے سامنے اداس ، پیاسا کھڑا ہے اور اس کے جامد دانت کمانڈر
کے یا کسی اور کے جسم میں پیوست ہوتے جارہے ہیں ۔ ☐

ڈھورے

(محمد عمر میمن کے لئے)

میرے کمرے کے بالکل سامنے دیوار سے ملا ہوا ذرا سا نشیب بن گیا تھا۔ ایک پھیلے ہوئے پیالے یا تھالی کی صورت کے اس گڑھے میں چائے کی پیالیوں کا دھوَن اور کلیوں کا پانی جمع ہو جایا کرتا تھا اور ہر دوسرے یا تیسرے دن ـــــ گرمی کی چٹیل دھوپ اس پانی کو وہاں سے اٹھا لے جایا کرتی تھی اور وہاں سیاہی مائل غلاظت کی ایک تہہ سی چپکی رہ جاتی ۔ میں نے ایک دن سوچا۔ کیا اس کا بھی کوئی مصرف ہوگا ۔ ؟؟؟ نہ معلوم کیا ۔ ؟

بہت پہلے نہ معلوم وہ کون سا موسم تھا ؟ کون سا وقت تھا ؟ شاید ؟ اونہہ نہ معلوم ... کہ بڑی زوردار بارش ہوئی تھی ۔ کہتے ہیں کہ کئی دنوں تک اس کا سلسلہ جاری رہا۔ نہ معلوم یہ سچ ہے کہ نہیں کہ ایک صبح شاید دوپہر ہی ہو ۔ شاید شام جب ذرا بارش کا زور کم ہوا تو ایک نہ دیکھنے والی آنکھ نے دیکھا کہ چاروں طرف جھاگ ہی جھاگ بھرا تھا۔ سفید سفید اور پھولا پھولا جھاگ جو ایک دوسرے جھاگ کے ٹکڑوں کو روندتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔ اس اکلوتی آنکھ والے نے اپنی دوسری بند آنکھ کو پل بھر کے لئے کھولا تو جھاگ کے جھاگوں نے دیکھا کہ ایک بہت روشن اور گرم چیز چمک رہی ہے ۔ پھر یکایک طوفان آگیا ۔ شاید ؟ اور سارا جھاگ بکھیجاتا ہوا اس ڈیڑھ فٹ کے نشیب پر چکر لگانے لگا۔ ہر نچلی تہہ جمتی رہی اور اوپر کی پھولی ہوئی تہہ اس کی جگہ لیتی رہی ۔ یہ سلسلہ کافی دنوں تک جاری رہا کہ ایک دن اس ایک آنکھ والے نے اپنی دوسری آنکھ کو پل بھر کے لئے کھلا رہنے دیا اور بڑے زور سے چھائیں کی آواز کے ساتھ ہی سارا جھاگ نہ جانے کہاں غائب ہوگیا۔

اور وہاں سفیدی مائل غلاظتوں کی تہیں باقی رہ گئیں۔

دوپہر کو؟ شاید صبح رہی ہو؟ یا شاید رات؟ میں نے دیکھا کہ وہاں ایک جرثومہ پڑا تھا، بے جان اور مردہ سا۔ اور شام کو؟ شاید؟ شاید؟؟ نہ معلوم کیسی زوردار آندھی آئی کہ وہ بے جان جرثومہ ایک لجلجے ڈھورے کی شکل کا ہو گیا۔ پھر رات گئے۔ شاید؟؟ کیسی آواز تھی جس نے اس میں حرکت پیدا کر دی۔ یہ میں آج تک نہ جان سکا اور سوچتا سوچتا سو گیا۔ اسی درمیان ایک تیسری آنکھ نے جس کی روشنی (چمک) بڑھتی جا رہی تھی دیکھا کہ۔

رات بھر۔؟؟ وہ ڈھورا اپنے ننھی سے جسم کے اگلے حصہ کو بڑی مشکل سے کھینچ کر آگے بڑھاتا ہے اور کانپتا ہوا آگے کی غلاظت کے ایک حصہ پر چپکا کر کچھ دیر سانس درست کرتا ہے پھر پچھلے حصے کو ڈھیلا چھوڑ کر اسے اپنے قریب کھینچنے لگتا ہے۔ اس طرح اس کے نچلے جسم سے ایک سفیدی مائل چپچپا سا لعاب ایک لکیر بناتا ہوا اس تک پہنچ جاتا ہے۔ ٹھنڈک کے احساس پر جب اس نے اس کو مس کیا تو نہ جانے کیوں ایک کراہت کا احساس ہوا مگر مجبوری کا خیال آتے ہی اس ڈھورے نے اسے چاٹ لیا اور اپنے آپ کو اس لعاب میں لتھیڑ کر وہ لکیر بناتا پھر دوسرے حصے کی طرف رینگنے لگتا۔ لجلجا سا رقیق مادہ ایک لکیر کی صورت میں گواہی دے رہا تھا کہ اس سے پہلے کوئی اور تھا۔؟

اس تیسری آنکھ نے جب ساتویں پردے کو ہٹایا تو وہاں پر لکھا تھا کہ وہ ڈھورا اسی طرح رات بھر۔ شاید؟؟ نشیب کی اس غلاظت کی چاروں سمتوں میں یہی عمل دہراتا رہا تھا اور صبح کو سب تماشہ؟ بہت سے ننھی ڈھورے ایک دوسرے کے جبڑوں، کاندھوں، سینوں، پیٹھوں، رانوں اور پنڈلیوں سے چپکے سفر کر رہے تھے۔ پھر ایک دن سب بکھر گئے اور ایک دوسرے کے لعابوں کی لکیر پر اپنے اپنے اگلے حصوں کو غلاظت کے دوسرے ڈھیر پر چپکا کر اپنے اپنے پچھلے حصوں کو ڈھیلا چھوڑ کر اپنے قریب کھینچ لیتے۔ اب ان کی کپکپاہٹ بھی آہستہ آہستہ مفقود ہوتی جا رہی تھی۔ میں نے ایک پہلے والے ڈھورے کو تلاش کرنا چاہا۔ مگر اب اس کی کوئی نشانی میرے پاس نہیں تھی۔

وہ ایک ننھی سا ڈھورا تھا۔ کل جب ایک بڑے ڈھورے نے اپنا رقیق مادہ اپنے جسم سے علیحدہ کر کے پچھلی غلاظتوں کے ساتویں ٹکڑے میں چھوڑ دیا تھا تو یہ جرثومہ پیدا ہوا تھا۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے اسی جگہ بڑھنے لگا۔ جب خدوخال واضح ہونے لگے تو اس کے قد سے بھی طویل اس کی

دم اسی میں مدغم ہونے لگی اور میکانکی عمل سے وہ ایک مکمل ڈھورے کی شکل میں آگیا۔ اس نے اپنی بچ مچی آنکھوں سے کیا دیکھا؟ (یہ آج تک کوئی نہیں جان سکا) لیکن پہلا منظر اتنا غیر متوقع ضرور تھا کہ وہ بھی چند ساعتوں بعد وہی عمل دہرانے لگا جو بہت سے پہلے ڈھورے یا تو دہرا کر چپ چاپ خاموش کسی غلاظت کے حصے میں سر ڈالے پڑے تھے یا وہی عمل اب بھی دہرا رہے تھے۔

اس طرح پہلے دن اس میں کوئی خاص بات محسوس نہ ہوئی جس سے یہ اندازہ ہو سکتا کہ کل یہ ڈھورا اتنا مختلف ہوگا اور سارے ڈھورے گردن اٹھا اٹھا کر اسے عجیب نفرت زدہ، ہیبت زدہ اور رشک زدہ نظروں سے گھوریں گے۔ میرا خیال ہے اس کا اندازہ اس سے پہلے خود اسے بھی نہ ہوا ہوگا۔

میں نے ان میں سے ایک پرانے ڈھورے سے پوچھا۔ کیوں؟ کیا بات ہے؟

یکایک وہ دوڑ پڑے اور ایک ساتھ سب نے کہا۔ وہ بڑا پر اسرار ہے۔ بڑا کمینہ ہے اور شاید یہ بھی کہا تھا کہ بڑا عظیم ہے۔ دراصل شور کی وجہ سے میں ٹھیک سے سن نہ پایا تھا۔ پھر میرا سوال بھی بہت زیادہ جواب طلب نہ تھا۔ بس تھا؟

میں نے اسے دیکھا ـــــ وہ ایک غلاظت کے ذرا ہٹے ہوئے ڈھیر سے چپکا سوچ رہا تھا۔ پہلے کون سے عناصر آئے ہوں گے ـــــ؟ ہمارے پاس کون کون سے حواس ہیں؟ کیا کوئی مجھ سے پہلے بھی تھا؟ وہ کون ہے؟ کیا میں اس کے رقیق مادّے کی پیداوار ہوں۔ کیا وہ اور یہ سارے ڈھورے جانتے ہیں کہ وہ اپنے پیچھے کیا چھوڑ آئے ہیں اور اس کا کیا نتیجہ نکل سکتا ہے۔ کیا وہ پہلا ابھی موجود ہوگا۔ لیکن میں کیسے پہچانوں۔ اس لئے کہ میں اس کی کوئی نشانی اپنے وجود سے پہلے نہ لے سکا تھا۔ تو کیا وجود ہی۔ لیکن پھر بھی اس کی شناخت اپنی جگہ پر ہے۔ اس نے بےچینی سے ادھر ادھر کی غلاظتوں پر نظر اٹھا کر رکھی لیکن وہ بڑی بےدلی سے واپس آگئیں تو اس نے انھیں سمیٹ کر منھ کا غبارہ بنا کر سوچا۔ کوئی تو ہوگا۔ اس نے غبارہ کی ہوا بڑھائی تو سمٹی ہوئی نظر۔ بس جلدی سے پیار کا احساس لے کر پھر ان غلاظتوں پر لپکیں لیکن اس نے انھیں جلد ہی واپس بلا لیا۔ اس لئے کہ فوراً ہی شدت سے نفرت کرنے لگا تھا۔ نہ معلوم کیوں وہ مجھے اس مختصر ڈھیر میں چھوڑ کر چلا گیا۔ چھوڑنا ہی تھا تو کسی بڑی غلاظت کے کنارے چھوڑتا۔ یا.... یا پھر اس نے چھوڑا ہی کیوں؟ اگر ساتھ ہی رہتا یا وجود کے بعد ہی اپنی کوئی نشانی دے جاتا تو کون سا ظلم ہو جاتا۔ لیکن اگر ایسا ہو جاتا تو بھی کیا میں اکیلا نہ رہتا؟ کیا اس کے ساتھ گذرنے والوں میں اور

لوگ بھی تھے ؟؟ یہ لوگ سر اٹھا کر مجھے کیوں دیکھ رہے ہیں ۔ اب وہ روشن اور گرم چیز کیا ہو گئی ؟ کیا وہ واقعی ہمارا انجات دہندہ ہے ۔ کہیں وہ پہلا والا اچانک واپس نہ آجائے اور اپنا سودا مانگ لے ۔ اسے کیا دے سکوں گا ؟ ابھی میرے پاس ہے ہی کیا ۔ لیکن اگر نہ مانا تو یہ اس کا وجود ۔ ؟ مفتی سے فتویٰ پوچھنا ہے کہ کیا اس کا استعمال میرے لئے جائز ہے ۔ (کاش مکروہ نہ کہتا) میں جانتا ہوں کہ وہ مکروہ کہے گا ۔

اس نے بہت آہستہ سے جب اپنا اگلا حصہ کھینچ کر غلاظت کے دوسرے حصے پر چپکا دیا اور پچھلے حصہ کو ڈھیلا چھوڑ کر دھیرے دھیرے اپنے پاس کھینچنے لگا تو اچانک چاروں طرف ہلچل مچ گئی جب کہ وہ دیکھ چکا تھا کہ اس طرح حرکت کرنے پر کسی کی آنکھ نہیں اٹھتی مگر ۔ دور کونے میں بیٹھے ہوئے پرانے ڈھوروں نے کہا ۔

ہونہار بچہ ہے ایک دن ضرور ترقی کرے گا ۔

ارے میاں ! ہونہار بروا کے چکنے چکنے کی بات ۔

وہ پھولے ہوئے منھ سے نظر نکال کر غلاظتوں کے ڈھیر کی طرف دوڑا کہ اس پرانے ڈھورے کو بتا سکے کہ یہ پرانے ڈھورے اس کے بارے میں کس قسم کی رائے رکھتے ہیں ، لیکن وہ اپنے وجود سے پہلے اس کی کوئی نشانی نہ حاصل کر سکا تھا ۔ اس لئے نظروں کو پھر اٹھا کر واپس ہو لیا ۔

ایک دن ایک ڈھورے نے دوسرے ڈھورے سے BY THE WAY کہا میاں اگر یہ چھوٹ ہی کسی ڈھورے سے کہہ دے کہ تم نے اپنا رقیق مادہ کسی صاف جگہ پر ڈھیر کیا ہے تو اس بیچارے کو فوراً قبول کر لینا پڑے گا ۔ (یہ واقعہ اس پہلے واقعہ کے کافی دنوں بعد کا ہے) ۔

بہت دنوں بعد کسی دوسری غلاظت سے ایک یاسٹ ڈھورے نے اٹھ کر کہا (بہت آہستہ اور دبے ہوئے لہجے میں) یہ بہت بلند ہو گا ۔ ہم ایسے ڈھورے اسے دکھائی بھی نہ دیں گے ۔ اور یہ سمندری سفر بھی کرے گا اور پھر اس کی سمتا کرنے والا کوئی نہ ہو گا ۔ مگر ۔ (دوسرے ڈھوروں نے لاپروائی برتی تو وہ خاموش ہو گیا ۔ موقع شناس یاسٹ بےچارہ)

مگر اسی دیوار سے لگی ہوئی ایک چھپکلی یہ سن رہی تھی ۔ اس نے گردن ذرا سا اٹھا کر اسے پھر دیکھا ۔ حالانکہ وہ بہت دنوں سے اس منحنی سے ڈھورے کو دیکھا کرتی تھی ۔ سر جھکائے آنکھ بند کئے اور پنجوں کو دیوار سے اٹھائے ۔ لیکن اس ڈھورے نے اس کی پروا نہیں کی تھی جب کہ کچھ ڈھورے صرف سمجھانے کے لئے ہی اسے سمجھایا کرتے ۔

دیکھو! اس سے خوف زدہ رہو۔ یہ بڑی نقصانی ہے۔ اور وہ اکثر اسی درمیان سوچا کیا کرتا تھا۔

ایک دن جب ایک بوڑھے ڈھورے نے سورج نکلنے سے پہلے اس سے کہا۔ دیکھو! یہ چھپکلی سو برس کے بعد اپنی صورت بھی بدل لیتی ہے۔

تب اس نے تعجب سے دیکھا اور دیکھتا رہا۔ ارے واقعی یہ۔۔۔؟؟ چھپکلی بھی دیوار سے اسی طرح چپکی اس کی طرف دیکھتی رہی۔

ایک دن اس نے سنا کہ بہت سے عقل مند اور حقیقت پسند ڈھورے اس کے احساس کو خود پر طاری کردہ جنون کہہ رہے ہیں۔ لیکن وہ اس بات پر مصر رہا کہ یہی حقیقت ہے۔ اب تم سب بوڑھو چاہے اسے خبط کہو یا خواہش کی انتہا لیکن ایسا گھٹیا لفظ میرے سامنے مت دہراؤ۔

ثبوت میں اس نے کہا۔ نہ میں اس کا ساتھی۔ نہ عزیز نہ دوست۔ نہ ساتھ کھیلا اور نہ ہی اب مجھے اس کی صورت یاد نہ ہی ہم سب اس کے بارے میں زیادہ جانتے ہیں۔ بس شاید۔ پھر وہ گھبرا کر خود ہی محسوس کرنے لگتا کہ شاید پاگل پن ہی ہو۔ اور لمحہ لمحہ غلاظت پر نظر اٹھا اٹھا کر تکنے لگا۔ وہاں سے ہلکی ہلکی آواز ابھری۔ مدھ مکھی۔ مدھ مکھی ۔۔۔ جیسے شاید چھپکلی نے بھی سن لیا۔

بات دراصل یوں ہوئی تھی کہ وہ اس غلاظت کے ڈیڑھ خطے نشیب میں چکر لگا رہا تھا کہ جزیرہ کے ایک حصہ سے آنکھ اٹھاتے ہی اسے ایک مدھ مکھی نظر آگئی جو نیم کی ایک ہری سینک سے سر ٹکائے اسے گھورے جا رہی تھی۔ اس چھپکلی سے بے خبر جو اوپر دیوار سے چپکی اسے گھورے جا رہی تھی۔ بس۔ وہ ڈھورا کچھ دیر تو وہاں زبردستی ٹھہرا رہا اور دوسرے تیز گام ڈھورے نفرت اور غصے سے اس کی طرف دیکھ دیکھ کر آگے بڑھتے اور عمداً اسے دھکا دیتے رہے۔ کہ ۔۔۔ اچانک چھپکلی کو آج .... ؟ نہ معلوم کیا ہوا کہ وہ اس سارے جزیرہ پر جھپٹ پڑی اور سارے ڈھوروں میں بھگدڑ مچ گئی۔ جیسے وہ بخوبی واقف ہوں کہ اس کے بعد کیا ہونے والا ہے۔ یا ہو سکتا ہے کہ وہ بلا وجہ ہی بھاگے ہوں۔ اس بھگدڑ میں ساری غلاظت سروں پر آگئی اور وہ ننھا سا ڈھورا بھی اپنی جگہ سے ہٹ گیا اور پریشان ہو گیا کہ دور ایک اونچائی سے آواز آئی۔ آؤ ہماری طرف پلٹ آؤ۔ اس میں تمہاری نجات ہے۔ ابھی بھی اپنی تیسری آنکھ بند کئے ہو۔ یہاں دودھ کی نہریں بھی بہہ رہی ہیں جن سے تم اس وقت تک سیراب ہو سکتے ہو جب تک کہ ترک اولیٰ نہ سرزد

ہو جائے۔

اس ڈھورے نے فال نکالی کہ موجودہ جگہ کے متعلق ہی اشارہ ہے لیکن وہ اس آواز سے دھوکا کھا چکا تھا اس لیے جب چند لمحوں کے بعد ہی اسے احساس ہوا کہ اس کا دوبارہ دیکھا جانا بہت ضروری ہے تو اس کو بڑی تیزی سے ساری غلاظت کا چکر لگانا پڑا جس کے لیے اسے سخت ترین روحانی اور جسمانی اذیت کا شکار ہونا پڑا۔ وہ اگلی غلاظت کے ایک حصہ پر جلدی سے اپنا اگلا حصہ چپکا کر اور پچھلے حصے کو ڈھیلا چھوڑ کر فوراً اسے کھینچ لیتا۔ اس طرح پسینے میں شل ہو کر بھی اس نے ساری غلاظت کے جزیرے میں اس جگہ اور اس زاویہ کی تلاش جاری رکھی جہاں سے وہ بدھ کبھی دکھائی دی تھی۔ لیکن جب رات زیادہ بیت گئی تو اسے علم ہوا کہ وہ اس جگہ پر پہنچ ہی نہیں سکا تھا شاید اس لیے کہ اٹھائیسویں تاریخ کے چاند میں؟ کبھی تو اس بینگ — کا صرف اگلا یا پچھلا حصہ دکھائی دیتا اور کبھی تقریباً وہی جگہ جہاں وہ — ٹیک لگائے تھی۔ مگر اسے بے یقینی نے مار ڈالا — کیا یہ وہ جگہ ہو سکتی ہے؟ بس ذرا سا اور آگے یا اور داہنی طرف اس طرح صبح ہونے پر اسے علم ہوا کہ وہ اس جگہ کو نہیں پا سکا ہے۔ اسے غلاظت کا جزیرہ جب ریگستان لگنے لگا تو ظلمات کے آگے کے لیے اس نے تلاش جاری رکھنی چاہی۔ شاید میں ہی وہ ہوں جو طلسم کشائی کر سکے۔ شاید لوح پر میری ہی نشانیاں ہوں۔

اوپر دیوار سے چپکی ہوئی چھپکلی نیم مطمئن ہونٹوں پہ زہریلی مسکراہٹ لیے اور ذرا سا پنجہ اٹھائے سارے ڈھوروں کو دیکھتی رہی۔ یہ ان بوڑھوں نے دیکھا جب کہ وہ کن انکھیوں سے اس منحنی سے ڈھورے کو ہی تک رہی تھی۔ بڑے بوڑھوں نے اپنی اپنی پھیلی آنکھوں سے چپکے چپکے چھپکلی کو دیکھا اور رگوں میں خنکی کا احساس ہوتے پر ہونٹ کاٹنے لگے۔ پھر اپنے کو بہلانے کے لیے اس منحنی سے ڈھورے کو گھیر کر کھڑے ہو گئے۔ (ہنسی آتی تھی یہ دیکھ کر کہ زیادہ تر بوڑھے ڈھورے اپنا رخ دیوار کی طرف ہی کرنا چاہتے تھے) ایک نے ذرا سا گردن اٹھا کر اچکتے ہوئے کہا۔ سمجھایا اور نصیحت کی۔ دیکھو! یہ صرف واہمہ ہے۔ خود پر طاری کردہ ایک جنون۔

دوپہر ہونے پر پیامسٹ نے سمجھایا۔ "دیکھو۔ اگر تم نے اس کی تلاش نہ چھوڑی تو برباد ہو جاؤ گے اور کسی کام کے نہ رہو گے۔ ساری استطاعت ختم ہو جائے گی اور تمہاری بڑھتی ہوئی قسمت کی لکیر دل کی لکیر تک پہنچ کر رک جائے گی۔"

مگر شام تک پھر تلاش کا عمل جاری رہا — یہاں تک کہ رات ہو گئی اور اسے شاک

گذرا کہ ــــ کہیں یہ وہی چھپکلی تو نہیں تھی جو بھیس بدل کر مدھ مکھی بن گئی ہو، اور یہ سوچتے ہی وہ چیخ کر بے ہوش ہو گیا۔ اور ساری رات اس کے جسم سے رقیق اور لجلجا مادہ نکل کر ایک ہی جگہ جمع ہوتا رہا۔

جس رقیق مادہ سے صبح کو ایک جرثومہ پیدا ہوا۔ دوپہر ہوتے ہوتے اس کے قدرے طویل دم بھی اس کے جسم میں مدغم ہونے لگی۔ اور رات آتے ہی ـــ اس میں جان آگئی۔ مگر۔ وہ ایک ڈھورن تھی۔ آدھی رات بعد اس کے جسم سے بھی ایک لجلجا رقیق مادہ نکلنے لگا جس کی خوشبو حصار بنا کر اس کے چاروں طرف ناچنے لگی۔

کہتے ہیں جس رقیق مادہ سے اس ڈھورن کی تخلیق ہوئی تھی جب تک اس سے اتصال نہ ہوگا یہ خوشبو اس کے اردگرد یوں ہی ناچتی رہے گی اور وہ اس کی تلاش تمام مخصوص جگہوں پر کرتی رہے گی۔ نہ جانے یہ راز اس ڈھورن کو کب اور کس سے معلوم ہوا تھا کہ وہ پراسرار عظیم اور معصوم ڈھورے کو تلاش کرنے لگی جس کے پچھلے حصے سے نکلے لعاب نے اس کی تخلیق کی تھی۔ مگر وہ بھی کیا کرتی کہ اپنے وجود میں آنے سے پہلے اس کے وجود کی کوئی نشانی حاصل کر لینا اس کے بس سے باہر تھا۔ مگر وہ تمام تر روحانی اور جسمانی اذیتوں کو برداشت کرتی ہوئی اس بے معنی تلاش سے باز نہ آئی جس کے لیے اسے سخت اذیت سے گذرنا پڑا۔ وہ اپنے لچک دار جسم کے اگلے حصے کو غلاظت کے اگلے حصے پر چپکا کر پچھلے حصہ کو ڈھیلا چھوڑ دیتی اور پھر اس پچھلے حصہ کو کھینچ کر تلاش کرنے لگتی۔

ایک دن جب وہ دیکھنے میں اپنے سے عقل مند اور سینیر ڈھوروں کے درمیان گھرا ہوا شان بے نیازی کی مدھ مکھی سے باتیں کر رہا تھا اور دوسرے درحقیقت اس سے کم تر ڈھورے شدت سے لاپرواہی اور لاتعلقی کا اظہار کرنے میں منہمک تھے۔ جس سے کم از کم انھیں تو اپنی اہمیت کا احساس رہے ورنہ اس کے سامنے تو بوڑھے کاہن بھی گالیاں دیتے ہوئے اٹھ جایا کرتے تھے اور وہ مسکراتا ہوا کسی دوسرے ڈھورے کا کاندھا تھپتھپا کر وہاں سے چلا جایا کرتا تھا۔ (ویسے وہ ڈھورے بڑی بے چینی سے قصے کے اگلے حصوں کو بھی سن لینے کے خواہش مند تھے۔)

اسی وقت ڈھورن نے شاید اسے پہچان لیا یا شاید خوشبو کی لہروں کا اپنے اصل سے قرب کے بعد مرتعش ہو جانا ہی اس کی نشان دہی کر چکا ہو۔ بہرحال اس نے اس ڈھورے کے داہنے حصہ کو منہ میں دبا لیا اور ایک طرف کھینچ لائی ـــ چلو تم مجھے بتاؤ اس مدھ مکھی کی

تفصیلات تاکہ ــــ کیا یہ کوئی علامت ہے ؟؟

اس نے کہا تو جب میں نے ان آنکھوں کا تجزیہ کیا جو چشمہ نہیں لگائے تھیں اور بہت بڑی چمکیلی تھیں ــــ تو مجھے تین مجہول چیزوں کا علم ہوا ــــ پیار، حیرت اور خوشی ــــ میں قسم کھا سکتا ہوں کہ یہ تینوں جذبے اس کی آنکھ میں مجھ کو ہی دیکھ کر پیدا ہوئے تھے۔

ڈھورن نے جلدی سے تینوں چیزیں اپنی آنکھوں میں بھر لینا چاہا ــــ کتنا عظیم ہے جو آنکھوں کا تجزیہ کر رہا ہے۔ تب تو ضرور یہ چھپکلی سے محفوظ رہ کر اپنی خوشبو پہچان لے گا۔ اف کتنی بدنصیب ہیں یہ ساری ڈھورنیں جو ڈھوروں کے جسم کی پہلی باس سے محفوظ رہ گئیں۔ موئی چھپکلی نے انھیں ساری زندگی کی جلن سونپ دی۔ (وہ یہ بھول گئی تھی یا نہیں جانتی تھی کہ اس سے پہلے بہت سی ڈھورنوں نے یہی باتیں سوچی تھیں۔)

پھر اس کی زبان سے نکل گیا،

لیکن اس کی تصدیق ؟

اور وہ جیسے اس سوال کے لئے تیار تھا؛

مجھے نہیں ضرورت تصدیق کی۔ میں تو جانتا ہوں کہ جب میں صرف ان تجزیوں کے سہارے اتنا آگے بڑھ سکتا ہوں تو کیا اس کا کبھی کچھ محسوس کرنا ناممکن ہے۔ مجھے یقین ہے کہ جب میں تنگ و دو سے تھک کر کسی غلاظت کے نرم اور گدگدے ڈھیر کے نیچے چھپ کر روتا ہوں تو لاشعوری طور پر اس کی آنکھ ضرور کھل جاتی ہوگی۔ یہ جانتے ہوئے کہ وہ کیوں جاگی ہے ؟ کیوں ایسا ہو سکتا ہے کہ نہیں ؟

ڈھورن سوچ رہی تھی ــــ کتنا یقین ہے اسے اگر کہیں واقعی یہ سچ ہوا تو ؟ اور وہ سوچ رہا تھا ــــ کتنی گہری خود فریبی ہے یہ ــــ کہیں واقعی مفروضہ ہی رہا تو ؟

ڈھورن دعا دینے لگی ــــ ہمارا بڑا رب اسے سچ کرے۔ اور وہ مدھ مکھی ڈھورن بن جائے۔ (حرامزادی۔ سور کی بچی ..... مردار!)

وہ آنکھوں سے شکریہ ادا کرتا ہوا اس کے بائیں طرف زور سے چٹکی کاٹ کر روش[1] کا عمل دہرانے لگتا ــــ اور نتیجوں کی پروا کئے بغیر ان غلاظتوں کی اونچائیوں پر بڑھنے کے لئے آگے بڑھ جاتا جہاں ماضی میں بوڑھے ڈھورے نہ جاسکے تھے اور تھک کر نا پیما سمجھ بیٹھے تھے۔

---

[1] یہ لفظ میں نے چلنے، عمل کرنے اور حرکت کرنے کے معنوں میں استعمال کیا ہے۔ (ق۔ا۔)

اور جوان ڈھورے اپنا زرد چہرہ اور پوسٹر زدہ جسم لئے اس کے بارے میں سوچنا ہی چھوڑ چکے تھے۔

ڈھور یہ سوچ رہا تھا کہ شاید ارتقار کے اس عمل سے ایک سو سال بعد وہ زندہ مکھی بن جائے اور پھر اسے تلاش کر لینا آسان ہو۔ لیکن اکثر بلندی کی کسی چٹان پر رک کر وہ سوچنے لگتا۔ اگر کہیں میرا تیسرا موڑ غلط ہوا تو۔

اسی وقت وہ سب ڈھورے جن کی نظریں اس پر نہیں ٹھہر رہی تھیں اس چٹان پر اسے دیکھ کر چیخے —— یہ دھوکہ ہے، ہم جو دیکھ رہے ہیں وہ نہیں دیکھ رہے ہیں، یہ مایا ہے۔ تم سب پلٹ پلٹ کر اپنے پیچھے کی طرف دیکھو۔؟ اور آگے کی تیاری کرو۔

لیکن دوسری چٹان کی طرف اسے بڑھتا دیکھ کر وہ پھر اپنی بے صدائی پر جھنجھلانے لگے۔ اور اسے ہیبت زدہ، رشک زدہ اور نفرت زدہ نظروں سے گھورنے لگے۔ نوجوانوں نے کہا بڑا کمینہ ہے۔ بڑا پر اسرار ہے وہ (اور مجبوراً) بڑا عظیم ہے وہ۔

واپسی پر ان کی نظروں سے اکتا کر جب وہ یک سطحی غلاظت پر آتا تو رات میں اپنا حق مانگنے لگتا اور دوسرے گھروں سے غلاظت کی چوری کرنے لگتا اور رات گئے دوسرے جوان ڈھوروں کے ساتھ چوپال کے اندھیرے میں چھپ کر بوڑھوں کی زبان سے چھپکلی کی کہانی سنا کرتا جو اب کبھی دیوار پر آنکھ بند کئے ذرا سا سمٹ کر اور نیچے ذرا سا دیوار سے اٹھائے چپکی رہتی۔ یہ سر جھٹک دیتا تو اکثر سفید ذرے دوسروں کو گندہ کر دیتے تھے۔

پھر وہی ہوتا کہ کافی رات گئے چھپکلی شہد کا لباس پہنے دیوار سے اتر آیا کرتی......

صبح کو وہ کہیں سے لوٹ کر دو چار ڈھوروں میں کہتا آج فلاں سطح پر بارہ چھپکلیاں مجھے دیکھتے ہی گر کر بے ہوش ہو گئیں۔ پھر کسی دن کہتا آج فلاں سطح پر پانچ چھپکلیاں مجھے دیکھتے ہی گریں اور ختم ہو گئیں۔ کیا تم نے ادھر سے کراہتی جاتی ہوئی روحوں کو نہیں دیکھا؟؟

یہ سب سن کر بوڑھے مسکرائے اور کنکھیوں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر آگے بڑھ جاتے۔ "یہ پہلی منزل ہوتی ہے نا۔" اکثر ان میں سے کوئی ایک دوسرے سے پوچھ بیٹھتا۔

جب کہ دوسرے ڈھورے اسے خوف اور نفرت سے گھورنے لگتے۔ اکثر تو ان کے بدن میں کپکپی آ جاتی —— ڈھورن نہ جانے کہاں سے اپنی آنکھوں میں شہد بھر لاتی تھی —— اسی وقت انڈیلنے لگتی۔

ہائے —— کتنا اچھا ہے یہ —— کہیں سچ میں ایسا نہ ہو —— موٹی چھپکلیاں کتنی

زہریلی ہوتی ہیں۔ اور وہ اسے کچھ ڈھورنوں کے سامنے سمجھانے لگتا۔

تم خود سوچو۔ کیا تم میرے لائق ہو۔ کیا تمھیں کوئی کمینی کہتا ہے۔ کوئی تم کو ہیبت زدہ، رشک زدہ، نفرت زدہ نظروں سے دیکھتا ہے؟ تم بہت کم زور ہو۔ میرے لائق نہیں ہو۔

وہ خاموشی سے رونے لگتی اور دوسری ڈھورنیں اس پر افسوس کرتی بڑبڑاتی چلی جاتیں۔

لیکن رات کو وہ اسے بلا کر کہتا۔ دیکھو چاندنی کتنی اچھی ہے۔ دراصل یہی اس کو کہنا ہوتا۔ بھلا کوئی کس سے کہتا؟ تم مجھے نہیں جانتیں۔ میں بہت پر اسرار ہوں۔ کہتا کچھ ہوں کرتا کچھ ہوں اور سوچتا کچھ ہوں ___ تم مت ..... ؟

تب تک کوئی ڈھورا کھانستا ہوا پاس سے گزر جاتا اور وہ پوری بات سمجھ جاتی مگر سن نہ پاتی تھی۔ وہ اپنی جگہ مسرور رہتا کہ چلو اچھا ہوا کہنا نہیں پڑا۔ بعد میں کہنے کو تو ہوگا کہ میں نے کب کوئی یقین دلایا تھا پھر وہ اوپر چپکی ہوئی چھپکلی کی طرف آنکھیں بند کر کے دیکھنے لگتا۔

ایک روز کافی رات گئے۔ نہ معلوم کیا سوچ کر شاید خوف کا تجزیہ کرنے کے لئے وہ خود ہی آہستہ آہستہ بڑھا اور چھپکلی کے اٹھے ہوئے پنجوں سے ذرا سا بچ کر اس کے ذرا کھلے ہوئے منھ میں کود پڑا۔ (آخر کب تک کوئی بوڑھوں کی کہانیاں برداشت کر سکتا ہے) اور وہاں پہنچتے ہی وہ غرق ہونے لگا۔ ارے۔ یہاں کی غلاظتوں میں کیسا سرور سکون ہے۔ کتنا ہیجان ہے؟ کیسا عجب لجلجا پن ہے اور کیسی بدبو ہے؟ اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں تو روشنی کا عمل بھی محدود ہونے لگا۔ ایک دو ہی لمحوں بعد اچانک چھپکلی کی آنکھ جب پوری طرح کھلی تو وہ اسے پہچان کر بہت خوش ہوئی۔ لیکن تھوڑی ہی دیر بعد اسے اپنے منھ سے اگل دیا۔ جاؤ اپنا علاج کراؤ۔

جب وہ سناٹے میں اوپر سے نیچے غلاظت کے ڈھیر پہ لٹے نشیب میں ٹپک پڑا تو اس کی بھی آنکھ کھلی۔

اوہ یہ۔ یہ حرام زادی مجھ سے بھی زیادہ کمینی ہے۔ پُر اسرار ہے عظیم ہے۔ کیا طلسم شکنی کا کوئی خاص مرحلہ مجھ سے چھوٹ گیا تھا یا میں نے جلد بازی کی تھی۔ اب سات ہی ہلاکت پہنچنے کے لئے مجھے کیا پھر لے بیابان ہستی تک پہنچنا پڑے گا۔

پھر وہ اس چھپکلی کو ہیبت زدہ، رشک زدہ اور نفرت نظروں سے گھورنے لگا۔ صبح کو ڈھورن نے دیکھا وہ ایک چھوٹے سے ننھے ڈھورے کو سمجھا رہا تھا۔ دیکھو۔ اس سے خوف زدہ رہو

یہ بڑی نقصانی ہے ـــــ اور ڈھورن چیخ مار کر رو پڑی۔۔۔ اور دوپہر ہوتے ہوتے ڈھورن اسے نفرت زدہ اور کچھ اکتاہٹ زدہ نظروں سے گھورنے لگی۔

وہ مسمئی ڈھورا سوچ رہا تھا۔ کتنا ہیجان تھا چھپکلی کے نیم وا منھ کی پرسکون غلاظت میں کیسا لجلجا پن تھا۔ کتنی شدید بدبو تھی ـــــ آج میں پھر کود کر اس کھٹی باس کو اپنے سے لپیٹوں گا۔ مگر ـــــ جاؤ اپنا علاج کراؤ۔ ؟؟ حرامزادی۔ اف کتنا سکون تھا۔

یہ سو۔ کی بھی مدھ مکھی نہ جانے کون تھی۔ کہاں گئی۔ خیر چلو اچھا ہوا۔ ڈھورن بور تو ہوئی پیچھا چھوٹا۔ اب چھپکلی کے متعلق سوچوں گا۔

اس رات وہ دوسرے جوان ڈھوروں کے ساتھ مل کر بوڑھوں کی چوپال کی تاریکی میں چھپ کر چھپکلی کی کہانی سننے کے بجائے شرمایا شرمایا سا چوپال میں چلا گیا اور ایک طرف بیٹھ کر سر سے غلاظت کے ایک حصے کو کریدنے لگا۔ ایک بوڑھے نے آگے بڑھ کر حقے کی نال اس کے ہاتھ میں تھما دی۔ دوسرے بوڑھے ہنسنے اور زیر لب مسکرانے لگے اور اس کا سر جھک گیا۔

صبح بوڑھے ڈھورے آخری فرض کی ادائیگی کے لئے اس کو تلاش کرنے آئے۔ کیا تم نے ڈھورن کو کوئی یقین دلایا ہے ؟

نہیں تو ـــــ ! ـــــ اس کے جواب پر ڈھورن کا چہرہ بالکل سفید ہو گیا ـــــ ارے ـــــ اتنا بڑا جھوٹ تم کہتے نہیں تھے کہ میں کہتا کچھ ہوں، کرتا کچھ ہوں اور سوچتا کچھ ہوں۔ تم مت ـــــ! لیکن اس کے بعد تو اس نے کچھ نہیں کہا تھا۔ ہاں ہاں اس نے مجھے کبھی کوئی یقین نہیں دلایا میں ہی جھوٹی تھی۔۔۔۔ اور وہ مسکراتا ہوا ان بوڑھوں کو کچھ دور SEE OFF کرنے چلا گیا۔

اسی دوپہر کو غلاظت کی ایک اونچائی پر قدم رکھتے ہی اسے خبر ملی کہ ایک ڈھورا غلاظت کے ایک نادر تحفے کے بدلے میں اسے اپنے ساتھ لے جا رہا ہے لیکن وہ اپنے کو ہلکا محسوس کر کے پھر غلاظت پیمائی کرنے لگا۔ اس لئے کہ یہی ضروری تھا۔ شاید ارتقار کے اس عمل کے بعد ہو سکتا تھا وہ نر مدھ مکھی بن جائے اور اس کی تلاش اور حصول آسان ہو جائے۔۔

وہاں اس وقت بھی بڑے بوڑھوں اور ڈھورن کو انتظار ہی رہا کہ شاید وہ روش کے اس عمل سے خود ہی اکتا کر اور خود ساختہ مفروضے کی عدم صداقت سے واقف ہو کر واپس آئے اور اپنی خوشبو کو جو فرد کی اصل ہوا کرتی ہے۔ پہچان لے۔ (یہ خوش فہمی بھی انھوں نے فرض کی تھی۔)

اوپر دیوار پر چپکی چھپکلی بھی آج بالکل زرد اور سہمی سہمی سی تھی اور اکثر اپنی نیند بھری آنکھوں کو کھول کر دیکھ لیتی کہ وہ آیا کہ نہیں۔

جب کافی رات گئے وہ تھک کر اعضا میں درد کی ٹیس سمیت اونچائیوں سے واپس آیا تو ڈھورن کو پکارنے لگا۔

چھپکلی پھر تازہ دم ہونے لگی تھی۔ اچانک ڈھورے کی نظر اس پر پڑی تو اسے وہی پچھلا خوف لرزتا دکھائی دیا اور وہ ڈھورن کو اس کے ملنے کی تمام جگہوں پر تلاش کرنے نکل پڑا۔ جب وہ اپنے اگلے حصے کو غلاظت کے ایک ڈھیر پر چپکا کر پچھلے حصے کو ڈھیلا چھوڑ کر اپنے پاس کھینچ لیتا تو آس پاس ہلچل مچ جاتی جیسے کچھ ہی دور پر دوسرے ڈھورے کے ساتھ بیٹھی ہوئی ڈھورن محسوس کر کے رو رہی تھی۔ اور دوسرا ڈھورا اس سے کہہ رہا تھا دیکھو! چاندنی کتنی اچھی ہے۔ (دراصل اس وقت اسے بھی یہی کہنا تھا۔)

اس نے چھپ کر دیکھا۔ صبح تک ڈھورن کے جسم کے ہر عضو سے اس کا وجود جھانکا کرتا تھا اور اب اس کے ہر بچاؤ میں کسی دوسرے کی زبردستی تھی۔ جیسے کوئی میٹھی دوا کسی بچے کو کھلا دی گئی ہو۔ گیس آلود.... اٹھتی ہوا میں اسے ایسا لگا جیسے ڈھورن میں چھپکلی کا زہر آگیا ہو یا یہ بھی اس کے منھ میں گذشتہ رات صرف خوف کا تجزیہ کرنے کو دی ہو اسے بالکل ویسی ہی بدبو محسوس ہو رہی تھی۔

کچھ دیر تو وہ نتھنے اٹھائے رہا پھر چیختا ہوا بھاگا۔ ارے میں نے تو اسے یقین دلا دیا تھا۔ کچھ بوڑھی ڈھورنیں غلاظتوں سے نکل کر اسے ہمدردی کی آنکھیں لگا کر دیکھنے لگیں۔ اور ان کے پیچھے کھڑے ڈھورے اسے کچھ ہیبت زدہ، نفرت زدہ نظروں سے گھورنے لگے۔ تھوڑی ہی دیر بعد وہ مدھ مکھی کو گالیاں بکنے لگے۔

اسی طوفان میں ہزاروں ڈھورے اس پر سے گذر گئے لیکن وہ اس مخصوص جگہ پر جما رہ گیا اس لئے کہ اس بار وہ اس مخصوص زاویہ کو نہیں کھونا چاہتا تھا۔ جہاں....

یک بیک اسے ایسا لگا جیسے اس کے اوپر سے ڈھورن گذری ہو۔ ارے رکو۔ اے گذرنے والی نے رک کر دیکھا۔ چہرے سے غلاظت کی تہیں ہٹائیں۔ پھر مسکرائی۔ پھر ہنس پڑی اور جلدی جلدی رقیق سا لجلجا مادہ اس کے پاس بائیں طرف انڈیلتی ہوئی گذر گئی۔

ڈھورے کو ایک جانی پہچانی خوشبو کا احساس ہوا۔ مگر اس ڈھورن کی دیکھا دیکھی سارے

گذرنے والے ڈھوروں نے اپنا اپنا لجلجا اور رقیق مادہ اس پر انڈیل دیا اور گذر گئے۔

وہ ڈوبتے ہوئے بڑبڑایا۔ میری ساری بربادی کے ذمہ دار یہ سب ڈھورے ہی تھے جو کہتے تھے کہ میں بڑا پراسرار ہوں۔ کمینہ ہوں اور عظیم ہوں۔ وُ۔وُ۔ں۔

جب کافی دیر گذر گئی تو وہاں صرف لجلجے رقیق مادہ کا ایک ڈھیر پڑا تھا۔ جہاں صبح کو ایک جرثومہ دیکھا گیا حالاں کہ اس وقت وہ بے جان اور مردہ تھا۔ لیکن سورج بلند ہوتے ہی اس میں جان آگئی پھر اس کی دم بھی اس کے جسم میں مدغم ہونے لگی۔ شام ہوتے ہوتے سارے باقی ماندہ ڈھورے گردنیں اٹھا اٹھا کر اسے ہیبت زدہ نفرت زدہ اور رشک زدہ نظروں سے گھور رہے تھے۔

بڑا پراسرار ہے یہ۔ بڑا کمینہ ہے۔ بڑا عظیم ہے یہ۔

اور وہ ایک مختصر سے ڈھیر پر چپکا سوچ رہا تھا۔ پہلے کون سے عناصر آئے ہوں گے۔ ہمارے پاس کون کون سے حواس ہیں۔ کیا کوئی مجھ سے پہلے بھی تھا۔ وہ کون ہے جس کے لعاب (رقیق مادہ) سے میں پیدا ہوا ہوں۔ کوئی تو ہوگا۔ پھر اس نے اس نامعلوم سے انتھاہ پیار اور بے انتہا نفرت محسوس کی۔ ساتھ ہی خوف بھی۔ نہ جانے کیوں وہ مجھے اس مختصر سی غلاظت کے ڈھیر پر اکیلا چھوڑ کر چلا گیا۔ میں اتنا اکیلا کیوں لگ رہا ہوں۔؟ کہیں وہ نہ آجائے اور مجھ سے اپنا سود مانگنے لگے۔ ابھی میرے پاس کیا ہے۔ میں اسے کیا دے سکوں گا۔ لیکن اس کی نشانی؟ ارے میں نے اپنے وجود سے پہلے اس کے وجود کو پہچانا کیوں نہیں؟ اب کیا ہوگا۔ اس نے بے چینی سے ادھر ادھر کی غلاظتوں پر نظر اٹھا کر رکھی لیکن وہ بے دلی سے واپس آگئیں تو اس نے انھیں سمیٹ کر منھ کا غبارہ بنا کر سوچا۔

نہ جانے کب وہ بڑا چمکتا ہوا چاند نشیب سے فراز کی طرف ابھرے گا اور اسے ہم اپنا نجات دہندہ تسلیم کرکے جزا پائیں گے۔

اسی وقت پاس کے ایک ڈھیر سے آواز ابھری۔

خوفزدہ ہو جاؤ۔ تم سب اس یقینی آنے والے دن سے جب زمین تپ کر چیپڑوں کی شکل روتی ہوئی اپنے بڑے رب کی طرف پلٹ جانے والی ہوگی۔

اس نے جلدی سے سمٹی ہوئی نظروں کو پھینکا تو دور غلاظت کے پاس جا گریں جہاں ایک جھلسی ہوئی نیم کی سینک پڑی تھی ـــــ سیاہ اور بدصورت۔ ☐

ہوزا میم ۔ فہ

بات دراصل یوں شروع ہوئی تھی کہ

جب عدم اتنے گہرے تاریک غار میں سیواتی کا ایک پر اثر قطرہ گرا تو مٹر کی بیلوں میں ہیجان پیدا ہو گیا اور پھر آپس میں جنگ شروع ہو جانا ناگزیر تھا۔ اور شاید جنگ کا ابتدائی شعور یہیں سے پیدا بھی ہوا ــــ ہر جنگ کے نتیجے کی طرح جب یہاں بھی ایک گہرا ہیبت ناک سناٹا طاری ہوا اور اوپر اوپر دھوئیں کے مرغولے منڈلانے لگے تو ان پارکھی نظروں نے پہلی لکیر کی لڑکھڑاہٹ سے ہی اندازہ لگا کر خوشی کا اظہار کر دیا ــــ اور اس نے خواب دیکھا ــــ نہ جانے یہ سانپ ہے یا بچھو؟ پھر اس کی شناخت کی بھی کوشش کی جانے لگی ــــ آخر جب وہ اس قابل ہوا کہ کہیں ٹھہر سکے یا تاریکیوں اجالوں کی شناخت کر سکے۔ تو میعاد ختم ہو چکی تھی۔ اور اسے بیلوں کے سہارے رینگتے ہوئے کھلیان کی طرف آنا پڑا جہاں پہلی نظر میں ہی اسے مٹر کا ایک انبار دکھائی دیا ــــ اس نے خوشی کا اظہار کیا اور اپنی کمزوریاں چھپانے کے لئے آگے رینگ گیا، اور رینگتا ہوا جب وہ امام باڑے کی حدود میں آیا تو کچھ غیر مرئی طاقتوں نے اسے محبوس کر دیا ....

یہ تھا جناب اس حادثہ کا ابتدائیہ

"اور جب شہزادہ قید و بند کی مصیبتیں برداشت کرتا ہوا تھک گیا اور رو رو کر اپنی موت کی دعائیں مانگنے لگا ــــ اور بہت بڑھے ہوئے ناخنوں سے اپنے بے کھرنڈ کے زخموں کو نوچنے لگا تو کسی نے اوپر کا بھاری پتھر ہٹا کر دیکھا" .... مگر وہ بے ہوش ہو چکا تھا۔

جب وہ محبوس ہوا تو دار الامن جانا اور خوشی کے اظہار میں ہاتھ پاؤں پھیلا کر لیٹ گیا۔
لیکن بے خبر ہونے سے پہلے ہی اسٹریچر کے نیچے ڈھلکے ہوئے تسمے بلند ہو ہو کر اس کے جسم پر گر پڑے۔ وہ ان تسموں کے بارے میں سوچنے لگا۔ جب وہ تسمے ایک دوسرے سے لپٹ کر گرہ بن گئے تو اس نے سعیٔ عبث کی۔ اور پھر پانچ انچی صفحات پر چیخنے لگا۔ مگر کچھ نہ ہو سکا۔ چیختے چیختے چیختے چیختے ــــ اس نے جان لیا کہ وہ محبوس نہیں ہے۔ مگر خوشی میں اچھلے کیسے ؟؟ اس لئے کہ ساری ریت اس کے ہونٹوں پر آکر جم چکی تھی اور اس کے سرخ اعضا سامنے طشت میں رکھے تھے اور وہ اب بھی محبوس تھا ــــ ٹنکچر آیوڈین، اسپرٹ اور اسٹرپٹو پنسلین کی خوشبو جب بہت گراں گذری تو اسے نیند آنے لگی ــــ اس نے دیکھا کہ ذرے بڑی تیزی سے اڑ اڑ کر جھنجھریوں میں جمع ہو رہے ہیں اور سارا وینٹی لیشن بند ہوا جا رہا ہے۔ ذرے آخر میں بھیگ گئے اور جھنجھریوں میں پلاستر ہو گیا۔ اس نے خواب دیکھا کہ وہ چیخ رہا ہے۔

"یہ حبس بے جا ہے"

(لیکن کیا آپ کبھی اس منزل سے گذرے ہیں جب صرف آپ کا شعور بیدار ہوا ہو اور سارا جسم سو رہا ہو اور آپ یہ محسوس کریں کہ میری کمر میں کھجلی ہو رہی ہے۔ مجھے کھجلانا چاہئے، یا آپ اس کیفیت میں سامنے شیر کو دیکھ لیں۔ اور صرف چیخنا چاہیں بھاگ جانا چاہیں مگر آپ تو سو رہے ہوتے ہیں۔)

اس نے اپنے کو تڑپانا چاہا۔ گیلے پلاستر کو اکھاڑنا چاہا ــــ مگر بوتلوں شیشوں اور بیگوں میں سے لاتعداد آنکھیں نکل کر اسے گھورنے لگیں۔ اور اس پر پھر وہی کیفیت طاری ہو گئی۔
آخر ایک دن اوپر سے برستے ہوئے ٹکڑوں نے شور مچایا۔ مگر ان کی آواز خم کھاتی ہوئی ڈھلوان پر پھسلتی گئی اور دیواروں پر لایعنی نقش بننے بگڑنے لگے۔ اب ریت کی باس اور دوا کی بدبو میں پرانی سڑی ہوئی مٹی کی بو بھی ملتی گئی اور کسی کونے سے ایک چھچھوندر تھوتھنی رگڑتی ہوئی الماری کے نیچے گھس گئی۔ یک بیک خوشی سے اس کی باچھیں کھل گئیں۔ نہ جانے کیسے ذرات دھوکہ کھا گئے تھے۔ کہ دیوار میں ایک مہین سا سوراخ چھوٹ گیا تھا۔ وہ تیزی سے لپکا ــــ اس وقت اسے احساس بھی نہیں ہوا کہ سارا بوجھ اس کے شانوں سے آچکا ہے۔ اور لاتعداد آنکھیں اپنی اپنی شیشیوں بوتلوں اور بیگوں سے اسے گھور رہی تھیں۔ جب وہ اس سوراخ تک اپنی آنکھوں کو پہنچانے کے لئے لپکا تب اسے بوجھ کا احساس ہوا مگر اس نے دیکھا ــــ سامنے

کی دیوار پر لکھا تھا

مسلمانوں کا بیڑا غرق طوفاں ہو نہیں سکتا
نبی کا چاہنے والا پریشاں ہو نہیں سکتا
مسلمانو نماز پڑھو
ہر درد کی دوا ہے صل علیٰ محمد
ایک ووٹ صدیقیو کو بھی دینا مت بھولو

اس کے دل میں شدید خواہش ابھری کہ وہ دیوار کے اس حصے کے علاوہ بھی کچھ دیکھ لے۔ کئی بار زاویہ بدلا۔ کئی بار جسم کے سارے بوجھ کو اوپر اٹھایا اور کئی بار آنکھوں کو ملا۔ مگر یہ فریم اس کی پتلیوں سے ایسا چپکا کہ ہٹایا نہ گیا۔ آخر جب وہ کراہتا ہوا اوپر اٹھا تو آنکھوں میں ہلچل پیدا ہو گئی۔ اور ان سب نے اپنی آنکھوں کو بند کر لینا چاہا، اس لئے کہ اس روزن کی ہی روشنی ان تاریکی گزیدہ آنکھوں میں چکا چوند پیدا کرنے کے لئے کافی ہوتی جا رہی تھی۔ اچانک وہ غصہ سے ابل کر اپنے مسکنوں سے باہر آگئیں اور اپنی رونما زدہ پلکوں سے ذرات کو نوچنے لگیں — تاکہ وہ اپنے غیظ و غضب کا اظہار کر سکیں۔

یہی ان کی موت کا سبب بنتا گیا۔ یعنی اسے وہ تریاق مل گیا تھا جس سے ان بھیانک آنکھوں سے چھٹکارا مل سکتا تھا۔ پہلے تو اس نے بے اعتنائی برتی اور کتنی ہی آنکھیں اس کی آنکھوں سے خوف زدہ ہو کر پیچھے ہٹ گئیں اور بدبدانے لگیں۔

پھر جب اس نے دیکھا کہ اب ذرات بڑی تیزی سے نوچے جا رہے ہیں تو وہ اپنی پلکوں کو لے کر اپنے جسم کو گھسیٹتا ہوا پھر اسی مہین سوراخ کے پاس آیا اور اس کی پلکیں بھی وہی عمل دہرانے لگیں جو آنکھیں دہرا رہی تھیں۔ بس فرق بنیادی تھا کہ وہ روزن سے دور تھیں اور یہ روزن کے پاس۔

پلاسٹر نہ ہوتے روزن کی بھربھری ریت بہت تیزی سے گرنے لگی۔ گرتی گئی۔ کئی بار اس کے دل میں خیال ہوا کہ لاؤ روزن بڑا ہو گیا ہے۔ عمل روک کر ذرا اب تو دیکھا جائے۔ مگر وہ اس خواہش کو عملی جامہ نہ پہنا سکا۔ ایک وجہ تو یہی تھی کہ ایک وقت میں ایک ہی کام کیوں نہ ہو، دوسری وجہ یہ تھی کہ بوتلوں، شیشیوں اور ہیگوں میں زندہ محفوظ آنکھیں کہیں اسے تھکن نہ سمجھنے لگیں۔ حالانکہ بڑھتے ہوئے روزن سے اس نے پرچھائیاں دیکھی تھیں۔ شاید باہر دھوپ

بہت تیز ہے۔ یہ خوف اس کے دل میں بھی پیدا ہوا۔ مگر کیا کرتا ؟ یا تو صرف سوچتا یا روزن بڑھاتا۔
مختلف چیزوں کی پرچھائیوں کی شناخت کے لئے اس نے کچھ نشانات مقرر کر لئے تھے جنھیں ریت کے ڈھیر پر بناتا جارہا تھا ـــــ اور یہیں وہ دھوکا کھا گیا ـــــ

بعد میں ـــــ بہت بعد میں اسے آخر یہ محسوس بھی کرنا پڑا کہ بنیادی غلطی اسی سے ہو گئی تھی یا ان آنکھوں کا خوف اور حبس کا احساس اتنا بڑھ گیا تھا کہ اس نے اتنے غلط قدم اٹھا لئے بہت بعد میں سہی، اسے کہنا پڑا کہ عناصر جو کچھ چاہتے ہیں وہی مطابق فطرت ہے۔ جو کچھ جس طرح ہوتا ہے۔ اسے ہونے دو۔ لیکن ایک جھوٹا گھمنڈ آج بھی سر پر سوار رہا کہ روزن بڑا کر لیا تھا۔ خواہ اس کے بعد جو بھی درپیش ہوا ہو۔

درپیش یہ ہوا کہ جب وہ روزن بڑھاتا قد آدم تک لے آیا تو خوشی سے چیخ پڑا۔ اور فتح کے احساس میں لیٹ کر دیکھا کہ ساری آنکھیں آہستہ آہستہ معدوم ہوتی جارہی تھیں ـــــ کہ ایک نازک سی آنکھ ڈری ڈری، سہمی سہمی سی اٹھی کبھی وہ ان معدوم ہوتی ہوئی آنکھوں سے خوف محسوس کرتی۔ کبھی اس کے بڑھائے ہوئے روزن میں اسے اپنی موت دکھائی دیتی۔ مگر وہ اٹھی تو ساری معدوم ہوتی آنکھوں نے بڑی نفرت وحقارت سے اسے دیکھا۔ اس آنکھ نے چھت پر جاکر پہلا کام یہ کیا کہ ایک دوسری دھندلائی اور گڈھے میں دھنسی آنکھ کو چپکے سے اشارہ کیا۔ اس دوسری آنکھ نے ادھر ادھر دیکھا، ایک بار اٹھنے ہمت کی مگر اسے صرف یہ خیال ہی روک لے گیا کہ دوسری آنکھیں دیکھ کر کیا کہیں گی۔ ادھر یہ کشمکش جاری رہی ادھر تباہی آگئی۔

روزن کے بڑے ہوتے ہی جب وہ فتح مندی کا احساس لئے اٹھا تو بوجھ روشنی سے اتنا بھاری ہو گیا تھا کہ وہ لڑکھڑا کر گر پڑا ـــــ اس کے گرتے ہی پہلے تو سارے تسمے اپنی اپنی گرہ کھول کر خود ہی لڑھک گئے۔ پھر طشت سے سارے اجزا اڑ اڑ کر آئے اور اسٹریچر پر اس کے جسم میں پیوست ہوتے گئے۔ اور ساری ریت اپنے آپ اس کے ہونٹوں سے اڑ کر پھر ایک جگہ ڈھیر ہو گئی۔

جب اس کے نتھنے اس قابل ہو گئے کہ وہ سونگھ سکے تو اسے معلوم ہوا کہ اب چاروں طرف خود اسی کے پسینے کی بدبو ہے۔ ورنہ پنسلین، اسپرٹ، ٹنچر آیوڈین اور فنائل کی مہک اڑ چکی تھی۔

جب وہ اس قابل ہوا کہ سر گھما کر دیکھ سکے تو دیکھا کہ ساری پلاسٹر شدہ جھنجھریوں سے ریت کے ذرات اتنی ہی تیزی سے واپس آتے جارہے ہیں اور وینٹیلیشن دوبارہ خشک ہوتا

جا رہا تھا... اس نے خراب سا دیکھا کہ وہ افسوس کر رہا ہے۔ مگر وہ تو واقعی افسوس کر رہا تھا کہ بلا وجہ اس نے اتنا بڑا روزن بنانے میں اتنی تکلیف کی۔ کاش پہلے ہی معلوم ہوتا کہ یہ حبس اتنے بج کر اتنے منٹ پر ختم ہو جائے گا۔ افسوس... افسوس...

جب اس کی آنکھیں اس قابل ہو گئیں کہ وہ اوپر دیکھ سکے تو اس نے دیکھا کہ چھت پر دھاگے سے ٹنگی ہوئی آنکھ لمحہ بہ لمحہ معدوم ہوتی جا رہی ہے اور دھاگے پر سیاہ رنگ جمتا جا رہا ہے۔ اس نے دیکھا کہ بوتل والی آخری آنکھ موت کی ہچکیاں لے رہی ہے۔ تب اسے بڑی زور سے چیخنے کی خواہش ہوئی۔ مگر وہ تو سو رہا تھا۔ اتنے میں ایک چھچھوندر اپنا تھوتھن رگڑتی ہوئی الماری کے نیچے سے نکلتی ہوئی ریت میں گھس گئی۔ اور اس کا شعور چیخ اٹھا "ارے مجھے ان آنکھوں سے محبت ہے۔ انھیں بچا لینا چاہئے۔" جب اس نے حرکت کرنا چاہی تو معلوم ہوا کہ وہ بوجھ سے دبا ہے۔ بڑی مشکل سے اپنے آپ کو گھسیٹ کر جب وہ کھڑا ہو سکا تو اندھیرا پیدا کرنے کے لئے خود ہی اس بڑے روزن کو بند کرنے لگا۔ مگر بھر بھری ریت اس کی مٹھیوں سے ہی نکل جاتی۔ ہیجانی کیفیت میں وہ خود اس روزن میں لیٹ گیا کہ شاید اب کچھ اندھیرا ہو جائے مگر کوئی فائدہ نہ ہوا...

اس نے ساری الماری توڑ ڈالی۔ اسٹریچر تباہ کر ڈالا اور پھر انھیں زنگ خوردہ کیلوں سے اس نے ایک تابوت بنایا اور روئی کے گالوں پر جلدی سے اسپرٹ، اسٹرپٹو بینسلیس اور آیوڈین چھڑک کر تابوت میں پھیلا دیا اور بوتل میں سے آنکھ نکال کر اسے پھاہے پر رکھ دی پھر جلدی جلدی اس دھاگے کو کھینچنے لگا جس میں نیم مردہ آنکھ بندھی ہوئی چھت سے لٹک رہی تھی ـــــ جب وہ آنکھوں کو تابوت میں روئی کے ٹکڑوں پر رکھ کر تابوت بند کرنے لگا... تو .... تو (یہیں سے اس کی پراگندگی شروع ہو گئی) اس لئے کہ ان چاروں آنکھوں نے اسے بے یقینی سے دیکھا تھا ـــــ

بس یہ تھی اس جنوں کی ابتدا جس کی ہی بنا پر وہ اپنے تمام بوجھ کے ساتھ ہی اب تابوت کو لے کر ایک طرف بھاگ نکلا.... بھاگتا گیا... بھاگتا گیا ـــــ

بہت دور جا کر ایک نیم کے پیڑ کے نیچے بیٹھ کر اس نے سوچا کہ اپنے پیچھے کیا چھوڑ کر آیا ہوں۔ تو کچھ نہ ابھر سکا۔ جب غور کیا تو راستہ بھی بھول چکا تھا۔ آخر وہ اپنے ہی نقشِ قدم پر پاؤں رکھتا ہوا کراہتا پھر واپس چلا۔ لیکن اب گردن اور کمر میں کافی درد ہونے لگا تھا۔

جب اسی روزن سے نکالی گئی ریت کے ڈھیر پر وہ آ گرا تو اسے اپنے ہی بنائے ہوئے کوڈ ورڈس کے پڑھنے میں دقت ہونے لگی ــــ

اُفوہ ... یہ کیا تھا ... ایک مکھی اڑتی ہوئی گذری ــــ فریم کے نیچے ہی ایک گرگٹ آ گیا ہے ــــ کوئی اپنے سر پر کچھ لادے ہے ۔ اس کی صرف پرچھائیں دیکھ سکا ہوں ۔ ایک شخص کان پر ہاتھ رکھے کچھ کر رہا ہے ــــ

جب بعد میں میں اس روزن سے اس تابوت کو لئے نکلا تھا تو میں نے کیا دیکھا تھا، لاحول ولاقوۃ ۔ بدحواسی اتنی تھی کہ شدید خواہشات بھی دب گئی تھیں ۔ اور اب جو کچھ میں دیکھوں گا وہ، وہ نہ ہوں گی جو مجھ سے چھوٹ گئی تھیں ۔ افسوس .... نہ جانے کیا رہی ہوں گی ــــ ان کے بارے میں میرے کیا کیا تاثرات رہے ہوں گے ــــ

پھر اس نے پاس ہی سے ایک ٹھیکرا اٹھا کر اس پر لکھا ۔"تیرے علاوہ کوئی نہیں ۔ میں بے شک اپنے پر ظلم کرنے والوں میں تھا ۔" اور ٹھیکرے کو اوپر اچھال دیا ۔

کافی دیر بعد جب ٹھیکرا واپس آیا تو اس پر لکھا تھا ۔" اب ہم نے تابوت سکینہ تمھارے حوالے کر دیا ہے ۔ جب تک یہ تمھارے سروں پر باقی ہے فتح و ظفر تمھاری ہم رکاب ہے ۔"

اس نے سامنے کے راستوں سے نظریں بچا لینی چاہیں ۔ اف ! کتنا بڑا دھوکا ہوتی ہے، باخبری ــــ کاش ! اتنا بڑا انقلاب نہ آیا ہوتا .... اور وہ آنکھیں مجھے گھورا کرتیں .... پھر میری بے اعتنائیوں سے معدوم ہوتی رہتیں ــــ اور مجھے یہ تابوت نہ ڈھونا پڑتا لیکن اب تو فتح و ظفر.... ؟

وہ کراہ کر اٹھ بیٹھا تو دیکھا کہ وہ آنکھیں اپنا اپنا نقش تابوت پر بھی بناتی جا رہی ہیں ۔ اور ان کی چمک اب اور بڑھنے لگی ہے ۔ ساتھ ہی ان میں بے اعتنائی کی جگہ احساس فتح مندی و ظفر مندی پیدا ہوتا جا رہا ہے اور دھیرے دھیرے پیچھے سے کوئی چیز بھی ابھر رہی ہے ۔

جب وہ اس کو لے کر بڑھا ــــ تو اوپر سے برسنے والی چیز نے آواز کے ساتھ ہی امام باڑے کے سارے روزن اور جھنجھریاں بند کر دیں ــــ تو اب میں یہاں واپس بھی نہیں آ سکتا یا آؤں تو پھر وہی عمل دہراؤں ۔ یعنی پلکوں سے راستہ بناؤں ۔ یہ حکمار نے کیسا دستور بنا دیا ہے کہ ــــ

دشتِ قراقرم کو عبور کرو تو سانپ کی طرح رینگو ــــ وادیٔ آب کے لئے تمھیں روغنِ زوفار اپنے جسم پر ملنا ہوگا ــــ آگ کے دریا کے لئے تمھیں کشتی کا انتظار کرنا ہوگا ــــ

اس نے سوچا کہ شاید ابھی سوچنے کا دور باقی ہے۔ لیکن کتنا اچھا ہوتا جب اس نے پہلے ہی فیصلہ کر لیا ہوتا۔

اس نے اپنے انگوٹھے کو دیکھا تو تازہ دم ہونے کا احساس ہوا۔ وہ چل پڑا۔ کافی دور نکل جانے پر جب اس کے حواس پر راہ کی گرد کی تہہ جما چکی تو اس نے جانا کہ پیچھے بہت کچھ ٹھہر کر دیکھنے کی چیزوں کو چھوڑ چکا ہے ــــ وہ ٹھٹکا ــــ لیکن وہ کیا چیزیں تھیں ــــ مجھے تو اب یہ بھی نہیں معلوم۔ کچھ شک سا ہی تو ہوتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ نہ رہی ہوں۔ لیکن اگر رہی ہوں تو ــــ جب وہ اپنے مالیخولیا کو نہ دبا سکا تو چلنے کے لئے مڑ گیا، ارے میرے نقشِ قدم؟ آنکھیں اگ تا رہی تھیں اور نقشِ قدم مٹ چکے تھے، کوئی ساتھ تو نہیں آرہا ہے ــــ اس نیم کے درخت سے ہی ساتھ ہو سکتا ہے۔ اس لئے کہ اس سے پہلے کے بارے میں مجھے کچھ یاد نہیں۔ اس کے بعد میں نے رومال میں ریت باندھ لی تھی ــــ جب اس نے کمر ٹٹولی تو خالی رومال باہر نکلا۔ ایک بہت بڑا سوراخ۔ ساری ریت کہیں ایک جگہ گرا چکا تھا۔ وہ ہچکیاں لے کر روتا ہوا پھر آگے بڑھا اور ایک نشان پر پہنچنے کے بعد اچانک ہی اپنے میں تبدیلی محسوس کرنے لگا ــــ یہ آنکھیں میرے اس غم کے بارے میں پر طنز رویہ کیوں اپناتی ہیں، شکایتوں سے جب کوئی فائدہ نہیں تو کیوں نہ ان سے پیچھا چھڑا لیا جائے۔ اس لئے کہ کتنی شکایتیں اب تک بے کار ہو چکی ہیں ــــ مگر ــــ

"اس طرح چیتا نامی خیمہ میں جب نمدے کے خیموں میں رہنے والی قوم ایک فرد کی ماتحتی میں مل کر ایک ہو گئی تب دریائے زمان کے سر پر وہ سب جمع ہو گئے اور نو بیروں سے اپنے پرچم کو استادہ کر کے ان لوگوں نے تموجن کو کاگن کا لقب دیا۔"

جب مجھے کاگن بنا دیا گیا تو مجھے سرداری کا حق کیوں نہیں دیتے ــــ لاؤ اس تابوت کو پھینک ہی دوں۔ فتح وظفر یقینی کب ہے۔ اور میں ان تین بڑے پتھروں اور ایک گوبھن کا بار اٹھانے کے لائق ہی کب رہ گیا ہوں ــــ اور ۳۰۰ کا انتظار کب تک کرتا رہوں۔

جب اس نے بڑی ہمت کر کے تابوت کو اپنے سر سے اتار پھینکنا چاہا تو چیخ مار کر دوڑنے کی حد تک اسے تیز چلنا پڑا۔ اس لئے کہ آنکھوں نے ان روٹی کے ٹکڑوں پر سے ہٹنا نامنظور کر دیا تھا اور تابوت سے نکل کر چیخنے لگی تھیں۔ وہ انھیں گالیاں، کوسنے دینے لگا۔

آگے بڑھتے ہی اس نے دیکھا کہ اسی طرح بہت سے تابوت کسی نہ کسی جسم پر لدے چلے آرہے ہیں۔ اور ان میں سے باہر نکلی ہوئی آنکھیں مکمل فتح وظفر مندی کا اظہار کر رہی ہیں اور

بار اٹھائے ہوئے جسم جگہ جگہ سے پھٹ کر چیخ رہے ہیں " ہم پر جبر کیا گیا ہے ۔ ہم مجبور ہیں ۔"
کیا میرے تابوت کی آنکھیں بھی یہی تاثرات رکھتی ہیں ۔ کیا میرا جسم بھی جگہ جگہ سے پھٹ کر چیخ رہا ہے ۔ اور جب اسے صداقت کا یقین ہو گیا تو چیخ چیخ کر رونے لگا ۔ لیکن تابوت جو فتح و ظفر مندی کا نشان تھا اب بھی اس کے کاندھے پر رہا ۔

سارا مجمع ایک دریا کی طرف بڑھا لیکن وہ خاموش روتا رہا تو ایک برہنہ اور خالی شخص نے آکر کہا ۔

" راستے تین طرح کے ہوتے ہیں ۔ ۱ ۔ بہت سیدھا ، چکنا ، آسان اور فرح بخش ۔ ۲ ۔ بہت تکلیف دہ ، کھردرا ، پرخار اور نشیب و فراز سے بھرا ہوا ناہموار و پرخطر ۔ ۳ ۔ موت ۔ اور بس ـــــ تابوت اور آنکھیں سب کے ساتھ رہیں گی ۔ اس لئے کہ بنیادی غلطی ہر ایک سے ہو گئی ۔ یعنی روزن کو پلکوں سے ہر شخص نے کھودا ہو گا اور اس پر نشانات مقرر کئے ہوں گے ۔ پھر نیم کے درخت سے واپس جا کر انھیں پڑھا ہو گا "

جب تم یہاں تک آگئے ہو تو اس کا مطلب یہ ہے کہ تم دوسرے راستے پر چل رہے ہو ۔ ورنہ تم تیسرے پر ہوتے ـــــ اور مجھے دیکھو میں نے روزن نہیں کھودا تھا ۔ آج کوئی سفر نہیں لاحق ہے ۔ بس تیسرا راستہ ہے پرسکون اور واضح ـــــ

لو ۔ یہ تعویذ رکھ لو اور گذر جاؤ ۔ الوداع ـــــ اس لئے کہ اب تمھاری واپسی ناممکن ہے ۔ کیونکہ تمھارا نقش قدم بھی مٹایا جا رہا ہے ۔ جس کے اسباب تمھیں اکیسویں منزل پر معلوم ہوں گے کہ حکماء نے وہی وقت مقرر کر رکھا ہے ۔

وہ بہت تیز بھاگتا ہوا وہاں سے گزر گیا اور کئی منزل آگے آنے کے بعد جب اس تعویذ کا خیال آیا تو کھول کر پڑھنے کی خواہش ہوئی ـــــ لیکن اس شخص نے تو منع کیا تھا کہ کھولنا نہیں ورنہ اثر زائل ہو جائے گا ـــــ نہ جانے وہ کون شخص تھا ۔ سرمد تھا یا کوئی ہپّی ۔

جب اس نے تعویذ کھولا تو اس میں لکھا تھا :

" ہوئے زامیم فہ مزداں ہزہز ماس وزماس
ہرشیو رہر دیور فہ شید شمستاتے ہرشندہ
ہرششگر زمریان فرد ہیدرد ۔

شام	کا	دیپک	جلا	من	کا
دیا	بجھنے	لگا	یا	ربوس،	شام
کا	دیپک	ج	من	کا	دیا

یہیں سے اس نے تیسری تباہی میں قدم رکھا۔

یعنی جب وہ دشت قراقرم کو عبور کر کے ۲۱ ویں منزل میں آگیا تو احساس ہوا جیسے اس کے پیچھے پیچھے کوئی گھسٹ رہا ہو۔ اس نے یہ بھی سوچا کہ چوں کہ میں اتنی دور رینگتا آیا ہوں اس لئے اس بار تو میرے نشانات واضح ہوں گے۔ لیکن جب مڑکر دیکھا تو لگاتار چیخوں سے دوسروں کی نیندیں اچاٹ ہونے لگیں ــــ

نہ جانے کس منزل سے ایک لاش اس کے ساتھ گھسٹتی آرہی تھی، جو اس کے رک جانے کے بعد بھی گھسٹ رہی تھی۔ اور نشانات دونوں کے مٹ چکے تھے ــــ اس عریاں لاش کے کھلے منھ میں بہت سی بڑی والی مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں۔ اور سیاہ رسی اس کی گردن میں پھنسی تھی، جس کا دوسرا سرا تابوت میں جاکر غائب ہو گیا تھا۔ اس نے گنگنا کر اسی رسی کو توڑ دینا چاہا۔ مگر اس کا ہاتھ شل ہونے لگا اور آنکھیں تابوت سے باہر آکر اسے گھورنے لگیں ــــ

جب اس نے یہ محسوس کیا کہ اب راستہ بہت زیادہ ناہموار ہوتا جا رہا ہے تو ایک جگہ ٹھہر گیا ــــ جب میں دوسری راہ پر چل ہی رہا ہوں تو پھر رموز کو جان لینا یا فتح وظفر کی امید کرنا یا انھیں بنیادوں پر سوچنا میرے لئے کتنا بے معنی ہو گیا ہے۔ لیکن اب تو تابوت ساتھ نہ چھوڑے گا۔ اس لئے کہ بنیادی غلطی ہو چکی ہے۔ اب صرف تین صورتیں ممکن ہیں ــــ

۱۔ کوئی دوسری لاش بھی اس بوجھ میں شامل ہو جائے (یہ میں برداشت نہ کر سکوں گا۔ اس لئے کہ تابوت بھی نہ برداشت کر سکے گا۔)

۲۔ ان سارے بوجھوں سے چھٹکارہ پا جاؤں۔ (اب یہ ناممکن ہے۔)

۳۔ کوئی پیچھے سے آکر اس لاش کو سنبھال لے۔ اور تابوت کو کاندھا دے سکے۔ لیکن ایسا کون ہو گا؟ میری محرومیاں اور میری ناکامیاں؟؟

کاش میں ایک راجہ گرڑیے کا لڑکا ہوتا اور بھٹکتا بھٹکتا کسی محل کے پائیں باغ میں پہنچ جاتا۔ اور وہاں سونے کے رتھ سے ایک شہزادی اتر کر آتی۔ میں اس کو دیکھ کر اپنے

میلے کپڑوں اور بڑھے ہوئے بالوں کو دیکھتا لیکن وہ مسکرا کر میرا ہاتھ پکڑ لیتی اور مجھ سے کہتی "تم مجھ سے دوستی کروگے"۔ اور میں آہستہ سے اقرار میں گردن ہلا دیتا۔ بس ـــــ پھر وہ مجھے اپنے ہاتھوں کا سہارا دے کر ساتھ میں بٹھا لیتی اور محل میں لا کر مجھے نہلواتی اور خود تولیہ لئے باہر کھڑی رہتی... یا... خود گلاس اٹھا کر مجھے پانی پلاتی"

کیا تیسری صورت کبھی ممکن نہ ہوگی۔ چلتے چلتے اس نے کن انکھیوں سے تابوت کو دیکھا تو خوف سے گھگھی بندھ گئی ـــــ وہی آنکھیں تابوت سے نکل کر اس کے نقوشِ پا کو مٹا رہی تھیں۔ ارے تم کون سی دشمنی نکال رہی ہو ـــــ میں نے تمھارے ساتھ کون سی ناانصافی کی ہے ـــــ تم کیوں نہیں مجھے آزاد رہنے دیتیں ـــــ اب تو میں تمھارا تابوت بھی ڈھونے کو تیار ہوں ـــــ کم از کم میرے نقوش تو نہ مٹاؤ ـــــ وہ آنکھیں اپنی خفت مٹانے کے لئے غیظ و غضب کا اظہار کرنے لگیں ـــــ تو مجبوراً اسے سفر جاری رکھنا پڑا ـــــ مگر قدموں کی لڑکھڑاہٹ اور بہتے ہوئے آنسو اب خود نقوش پامال کر رہے تھے۔ اور اس کی ورم شدہ گردن شانوں سے الگ ہوتی جا رہی تھی۔

آنکھوں کے تمام تر غیظ و غضب کے باوجود وہ کراہا۔ شہزادی!! ـــــ اب دوسری منزل وادیٔ آب اور تیسری منزل آگ کا دریا عبور کرنے کی ہمت کھو بیٹھا ہوں۔ کیا تم اب بھی نیچے نہ اترو گی؟ ـــــ پھر وہ وہیں ٹھوکر سے پھٹتے ہوئے تلووں کے گوشت کو گھورنے لگا۔ اب میں اپنے آپ کو کس کے حوالہ کر دوں۔ یا کاش!! مجھ سے بنیادی غلطی نہ ہوئی ہوتی۔ نیم کا درخت اب کتنے پیچھے چھوٹ چکا ہوگا۔ کاش!! میں بھی تیسری اور واضح راہ پر چل سکا ہوتا۔ یا کوئی تیسرا آ کر میری بھی آنکھیں نکال کر کسی تابوت میں روئی کے ٹکڑوں میں سجا دے اور میرے جسم کو وہیں چھوڑ دے... یا... ایک بھاری چٹان اس تابوت پر لا کر رکھ دے تاکہ میری شریانوں کا لہو بھی منجمد ہو جائے اور میں ان آنکھوں کا غیظ و غضب اور پر طنز رویہ کم کر سکوں۔

ایک موڑ پر مڑتے ہوئے اسے ایک آواز سنائی دی لیکن وہ یہ سوچ کر بڑھنے لگا کہ یہ وہ نہیں ہو سکتا ـــــ جب وہ کافی آگے نکل گیا تو خیال آیا کہ کہیں وہ وہی نہ ہو۔

ایک کھڑکھڑاتا ہوا پنجر میلی رسی کے ساتھ پیچھے پیچھے گھسٹ رہا تھا ـــــ مگر یہ وزن ـــــ اس نے غور سے دیکھا تو ـــــ وہ آنکھیں اب اس پنجر سے لپٹی تھیں ـــــ وہ کراہ کر وہیں لڑھک گیا ـــــ اوپر چیلیں منڈلا رہی تھیں ـــــ اور تیسرے شخص کا دور دور تک نشان

نہیں تھا

یہ تو تھی اب تک کی کہانی ــــ

اور واقعہ یہ ہے دشت قراقرم کی جھلسا دینے والی دھوپ میں آشوب چشم کی شکار دو پتھرائی ہوئی آنکھیں اب بھی آگے کے لئے کسی تیسرے شخص کا انتظار کر رہی ہوں گی ــ لیکن چیلیں اب بھی منڈلا رہی ہوں گی اور رتھ کی کوئی گڑگڑاہٹ نہ ہوگی ــــ

اور وہ بڑبڑا رہا ہوگا ــــ

موت پکارے گی تمھیں ــــ تم سنو گے اسے مجبور ہو تم ۔ ہم بھی ہیں ۔

غار کی گہرائیوں سے جب کبھی اٹھے گی آواز تو تم چپ ــــ نہ رہ پاؤ گے ۔

یک نفس سانس تو روکو گے ۔ کھو گے اب ــــ

جانے کا وقت آ ہی گیا .... ہم چلے .... □

الاؤ

بریدہ جسموں کو چمکانے والا بوڑھا

چٹانوں پر سہ پہر کی سنہری دھوپ پھیل چکی تھی۔ پہاڑی گھاس کے چھوٹے چھوٹے تختوں میں کیڑے پھدک رہے تھے۔ پاس کے ایک چھوٹے درخت کی سب سے اونچی شاخ پر ایک کوا مسلسل چیخ رہا تھا۔

دور سے ناہموار راستوں پر اچکتا پھلانگتا ایک بوڑھا راستہ میں کچھ تلاش کرتا چلا آرہا تھا۔ بوڑھا کچھ دور چلتا پھر جھک کر دیکھتا۔ اور پھر چلنے لگتا تھا۔

اس کی کمر پر چمڑے کے تسمے سے ایک تھیلا بندھا ہوا تھا۔ داہنی طرف بھی ایک تھیلا لٹک رہا تھا۔ سر پر دہقانوں جیسی ایک پگڑی تھی۔ جسم کے اوپری حصہ پر ایک میلی سی صدری تھی۔ نچلے حصہ میں ایک بڑے گھیر کی شلوار جس کے ٹخنوں میں دو پیوند لگے تھے جو جیب کا کام بھی دے رہے تھے۔ اس کے اندر کچھ کھڑبڑاہٹ ہو رہی تھی۔

اس کے داہنے ہاتھ میں ایک سیاہ چمکدار ٹیڑھی سی لکڑی تھی۔ بائیں ہاتھ کی انگلیوں میں بہت سی انگوٹھیاں پھنسی تھیں۔ جن پر عجیب ڈراؤنی سی شکلیں بنی تھیں۔ دونوں ہاتھ کی کلائیوں میں فیروزی رنگ کی تسبیح نما مالائیں پڑی تھیں۔ ایسی ہی ایک سیاہ دانوں کی مالا اس کی گردن میں بھی تھی۔ جس کے درمیان میں دو تصویریں لٹک رہی تھیں۔ ایک جانور کچھ سور سے مشابہ تھا دوسرا بلی یا بڑا نیولا معلوم ہو رہا تھا۔ ہار کے ایک حصہ میں ایک پرانی نعل اور ایک جگہ کسی پرند کا سیاہ پر لگا ہوا تھا۔

بوڑھا ایک نظر زمین پر ڈالتا اور مطمئن انداز میں سامنے دیکھتا ہوا بڑھتا چلا آرہا تھا۔

گھاس کے تختوں میں چھپے ہوئے کیڑے اس کی آہٹ پر پھدک کر دور چلے جاتے تھے۔

بوڑھے کے سر پر بہت سے مچھر چکر لگا رہے تھے۔

کوّا اسے دیکھتے ہی اور زور سے چیخنے لگا۔ کبھی بے چین ہو کر درخت کی سب سے اونچی شاخ پر بیٹھتا اور کبھی درخت کے آس پاس چکر لگانے لگتا۔ پھر شور مچاتا درمیانی شاخوں تک آتا اور اچانک ہی فضا میں تیرتا ہوا چیخنے لگتا۔

دور سے ایک بادامی رنگ کا کتا بھونکتا ہوا ادھر ہی آ رہا تھا۔ جیسے ہی وہ بوڑھے کے پاس پہنچا ایک دم ٹھٹھک گیا۔ کچھ ثانیوں تک آنکھیں میچ کر بوڑھے کو دیکھتا رہا۔ پھر ہلکی سی بھف کر کے جدھر سے آیا تھا اسی طرف بھاگ نکلا

اس تمام وقفہ میں بوڑھا بڑھتا چلا آ رہا تھا اور کوّا اسی طرح چیخ رہا تھا۔

جب بوڑھا درخت کے نزدیک آ گیا تو بے چینی سے زمین پر کچھ تلاش کرنے لگا۔ پھر درخت کے نیچے آ کر ٹھہر گیا۔ پھر پشت سے تھیلا اتار کر وہیں بیٹھ گیا۔ بغل والا تھیلا اب اسی سیاہ لکڑی پر رکھا تھا۔ اور پگڑی اس کے زانو پر رکھی تھی۔ وہ خاموشی سے اپنی شلوار میں کچھ تلاش کرنے لگا۔ پھر تھیلے سے کچھ نکال کر چبانے لگا۔ اس کے بعد ایک بوتل نکال کر اس کا سیال پینے لگا۔

اوپر والی شاخ سے کوّا بوڑھے کو دیکھ رہا تھا۔ گھاس میں چھپے کیڑے اب آہستہ آہستہ بوڑھے کی طرف رینگ رہے تھے۔

اچانک درخت کی اندھیری شاخوں میں حرکت ہونے لگی۔ بوڑھا چونک کر اوپر دیکھنے لگا۔

کوّا چیختا ہوا فضا میں تیر رہا تھا۔

کک۔ کون۔ کون ہو تم ؟؟ بوڑھا شاخ بہ شاخ نیچے ہوتے ہوئے وجود کو دیکھ کر بولا۔

وہ سایہ اب درخت کی سب سے نچلی شاخ پر آ کر رک گیا تھا۔

بابا۔ مجھے بہت زور سے پیاس لگی ہے۔ اور بھوک بھی۔

بوڑھے نے ایک لمحہ اس لڑکی کو دیکھا پھر سر ہلاتا ہوا اپنے تھیلوں پر جھک گیا۔ ایک تھیلے سے اس نے کچھ ٹکڑے نکالے۔ دوسرے تھیلے سے بوتل نکال کر اس شاخ سے لپٹی ہوئی لڑکی کو تھما دی۔

لڑکی نے جلدی سے دو تین ٹکڑے منہ میں ڈالے اور بغیر کچلے ہوئے انھیں نگلنے لگی۔ جب آنکھوں سے پانی بہنے لگا تو بوتل سے سیال اپنی حلق میں انڈیل لیا۔ پھر اپنی ابکائی کو روکنے کے لئے درخت سے چمٹ گئی۔

بابا یہ ٹکڑے کتنے خشک کڑوے اور بدبودار ہیں۔ اور سیال سے بھی عجیب سی بدبو آرہی ہے جیسے بوچڑ خانہ سے آتی ہے۔

بوڑھا خالی خالی نظروں سے لڑکی کو دیکھ رہا تھا۔

کوا سامنے کی چٹان پر بیٹھا خاموشی سے دیکھ رہا تھا۔

گھاس کے کیڑے رینگتے رینگتے بوڑھے کے سامان میں گھسے جارہے تھے۔

دور ایک چٹان کی آڑ میں وہ پہلا والا بادامی کتا پانچ اور کتوں کے ساتھ بڑے غور سے بوڑھے کو گھور رہا تھا۔ سب کے رؤیں کھڑے تھے۔ رہ رہ کر چاروں طرف دیکھ بھی رہے تھے۔

بوڑھے نے لڑکی سے پوچھا۔ بیٹی تم کون ہو۔؟ کہاں سے آئی ہو۔؟ یہاں پہاڑی پر کیوں بیٹھی ہو۔؟

لڑکی نے زور سے ابکائی لی۔ اور سرخ سرخ گوشت کے سالم ٹکڑے سرخ قے کے ساتھ باہر نکل پڑے۔ وہ تھوڑی دیر تک اوع اوع کرتی رہی۔ پھر دامن سے منہ خشک کر کے دانتوں سے زبان کھرچ کر تھوکنے لگی۔

بوڑھا سوالیہ انداز میں اسے دیکھ رہا تھا۔

لڑکی نے پوچھا۔ بابا پانی نہیں ہے؟

بوڑھا خاموش رہا۔

لڑکی نے کہا۔ میں شہر دخانیہ کی شہزادی ہوں۔

شہر دخانیہ۔ وہ تو بہت دور ہے۔ بوڑھے نے حیرت کا اظہار کیا تو لڑکی رونے لگی۔

ہاں بابا۔ (وہ بڑبڑانے لگی) کیا انجام ہوگا۔ کیا انجام ہوگا۔ کیا اس سے کچھ مختلف جو میرے اہل شہر کا ہوا۔

بوڑھا اب بھی خاموش رہا۔

لڑکی بڑبڑاتی رہی۔ ہمارے پاس کوئی ایسا عمل ہوتا کہ ہم مستقبل کے بارے میں جان کر قدم اٹھا سکتے۔ کیا ہم ہمیشہ تاریکی کو نور فرض کرتے رہیں گے۔ پھر وہ بوڑھے سے مخاطب ہوئی۔ بابا۔

کیا تمام موجودات کا وجود صرف ہمارے فرض کر لینے سے ہے۔ ورنہ موجود واقعی موجود نہیں ہوتا۔

بوڑھا اب بھی خاموش رہا۔

تو کیا جب ہم نہ ہوں گے تو بھی کسی کے فرض کر لینے سے موجود ہو سکتے ہیں۔ اور وہ درختوں سے لپٹی ہوئی پرچھائیاں جنھیں ہم مفقود سمجھ چکے ہیں۔ پھر موجود ہوں گی۔؟

پرچھائیاں۔؟؟ بوڑھا حیرت سے لڑکی کی طرف دیکھنے لگا۔

ہاں بابا۔ پرچھائیاں۔

وہ شہر پرچھائیوں کا تھا۔ سارا دن پرچھائیاں موجود رہتیں۔ لیکن رات ہوتے ہی ان سب کی آنکھوں، کان اور ناک سے گاڑھا کثیف، سیاہ دھواں خارج ہونے لگتا جس کا سلسلہ کئی گھنٹوں تک رہتا اور سب سکون سے میٹھے دھوئیں کا اخراج کرتے رہتے۔ پھر اپنے قریب کسی درخت، کسی ستون اور برج سے چپک کر رات بسر کر لیتے اور صبح ہوتے ہی وہ سب پھر اپنے قالب میں واپس آنے لگتے یہاں تک کہ دوپہر دن گذر جاتا۔

اچانک ہم میں سے ایک، ایک دن چیخ پڑا۔

دوڑو۔ تیار ہو جاؤ۔ کہ آج یوم جمعہ ہے۔ دجال اپنی اکلوتی آنکھ لئے نمودار ہوگا۔ اس کے ایک ہاتھ میں تلوار اور دوسرے میں شہد بھری ہوئی روٹیاں ہوں گی۔ اب ہمارا بین الممالکی دور ادبار آچکا ہے۔ اس لئے کہ آفتاب، وہ دیکھو، سوا نیزے کی طرف مائل ہے۔ ہاں۔ ہوکے رہے گا ظہور، چمکے گی پھر برق طور۔ یاغری۔ ی ب۔ نوا۔ آ۔ آ۔ آز۔ ہوگا۔ ہے کرم۔ کرم نگاہ کرم۔ کرم نگا۔ یقین نہ ہو تو دیکھ لو ـــ آج ابھی سے گاڑھا سیاہ دھواں سرسوں کے پھولوں پر محیط ہے کہ نہیں؟ ہم سب خوف کے بادل سے بھیگتے ہوئے سرسوں کے پودوں کی تلاش میں نکل پڑے کہ شاید واقعی ـــ لیکن درمیان میں ہی رات آگئی۔ اور ہم سب اپنی اپنی جگہ ٹھہر کر اپنے مسامات سے دھواں خارج کر کے درختوں سے لپٹ گئے۔

اسی رات تیسرے پہر کی نوبت بجے خاصی دیر ہو چکی تھی کہ اچانک شہر کے ایک حصہ سے کھڑ کھڑ کی آواز ابھری۔ پھر گھنگھروؤں کی آواز آئی۔ چھن چھنن۔ اور ہمیں لگا کہ بہت سے ستارے فضا میں کوندے۔ لپکے اور سمٹ کر غائب ہو گئے۔ کچھ ہی لمحوں بعد بہت سی خواب آمیز سسکیاں ابھرنے لگیں۔ ذرا ذرا سے وقفہ کے ساتھ تمام رات یہ ہنگامہ جاری رہا۔

صبح جب ہم سب متشکل ہونے لگے تو یہ دیکھ کر ہم سب اپنی بے ساختہ چیخوں کو نہ دبا سکے کہ

ہم میں سے بہت ۔ اب ہم میں نہیں ہیں ۔ اور بہت سے ساتھی ۔ بریدہ —— حیران و پریشان ہمارے گرد و پیش نظریں دوڑا رہے ہیں ۔ جیسے وہ اپنی کچھ اشیاء ہم میں تلاش کر رہے ہوں ۔ ان میں کسی کے صرف ایک کان ہے ۔ کسی کے دونوں نہیں کسی کا ایک ہاتھ غائب ہے کسی کے دونوں ۔ کسی کی ایک ٹانگ ہے ۔ کسی کی کمر سے نچلا حصہ غائب ہے ۔ کسی کا صرف کمر کے نیچے کا حصہ موجود ہے ۔ کسی کا سر غائب ہے ۔ کسی کا آدھا سر لگا ہوا ہے ۔

ہمیں بعد میں محسوس ہوا کہ ہم سورج بلند ہو جانے تک مسلسل چیختے رہے ہیں ۔ جب دوپہر ہونے لگی تو سارے شہر میں کہرام مچ گیا ۔ بہت سے بریدہ جسموں کے مالک اپنے ادھورے پن کے ساتھ ہمیں دیکھتے ۔ ہمارے ساتھ ساتھ گھومتے رہے ۔ تنگ آکر ہم رات کا انتظار کرنے لگے ۔ خوف زدہ اور بے چین انتظار ۔ کیا یہ سب یوں ہی رہیں گے یا ان کے باقی ماندہ اعضاء وہی عمل دوہرا سکیں گے ۔ یعنی دھوئیں کا اخراج کر کے ہی شب بسری کریں گے ۔

رات ہوتے ہی جب ہمارے اعضاء دھواں اگلنے لگے تو ہم چیخ چیخ کر پراگندہ ہو گئے ۔ اس لئے کہ وہ سب بریدہ لوگ اسی طرح کھڑے حیرت سے ہماری طرف دیکھ رہے تھے ۔ اور ان کے اعضاء رات کی سیاہی میں دمادم چمک رہے تھے ۔ ہم سب نے اسی ہیجان میں رات کے دو پہر گذار دیئے ۔ تیسرے پہر کی نوبت بجتے ہی اچانک شہر کے مختلف حصوں سے پھر وہی کھڑکھڑاہٹ گونجنے لگی ۔ گھنگھرو بجنے لگے اور اسی طرح وقفوں کے ساتھ روشنی کے جھماکے ہونے لگے ۔ پھر ایسا لگا جیسے سارا شہر مل کر باآواز بلند سانس لے رہا ہو ۔

ہم سب گڑگڑا کر نہ جانے کیا دعائیں کرنے لگے ۔ سنسناہٹ ، گھنگھروں کی آواز اور روشنیوں کے جھماکے سارے شہر کا گشت لگا رہے تھے ۔ دبی دبی سسکیاں ہمارے اردگرد حصار سا بنا رہی تھیں ۔

اچانک ایک قریبی درخت کی طرف ایک بہت طویل و عریض شے لپکتی ہوئی نظر آئی ۔ سیاہ و پر اسرار ۔ سنسناہٹ کے ساتھ ہی گھنگھرو بھی بڑھتے چلے آرہے تھے ۔ درخت کے پاس آکر ایک دم وہ شے نیچے کی طرف جھپٹی ۔ گھنگھروؤں میں شور اٹھا اور روشنیوں کے بہت سے جھماکے ہوئے ۔ پھر ایک ساتھ بہت سی سسکیاں ابھریں ۔ ہم نے دیکھا کہ وہ سیاہ و پر اسرار شے گھسٹتی ہوئی ایک دھبہ کی طرح دور ہوتی جا رہی ہے ۔

تھوڑی دیر بعد جب ہم اپنے اعصاب کو قابو میں لاکر دیکھنے کے قابل ہوئے تو دور

اندھیرے میں ویسے ہی بہت سے بریدہ جسم چمک رہے تھے اور بے چینی سے ادھر ادھر دوڑ رہے تھے۔

ہم صبح کی آمد کے لئے منتیں ماننے لگے اور صبح اپنے اپنے قالب میں لوٹتے ہوئے سب ہی دعاخواں ہو گئے کہ اب ہمارے شہر میں کبھی کوئی رات نہ آئے۔

سارا دن ہم تحفظ کے بارے میں صرف سوچتے رہ گئے۔ اور پھر شام آگئی۔ ہم نے پوری کوشش کی آج ہم اپنے عمل کو روک سکیں یعنی دھوئیں کا اخراج ہی نہ ہو۔ تاکہ ہم پرچھائیں بن کر درختوں سے لپٹنے پر مجبور نہ ہوں۔ اور اس ہیبت ناک سیاہ دھبے کو پھر نہ دیکھنا پڑے۔ تاکہ ہم خوف زدگی کے اس نیلے دریا سے باہر آسکیں۔

لیکن شام ہوتے ہی دھوئیں کا اخراج ہونے لگا ــــ اور سارا شہر چیخ چیخ کر رو پڑا۔ روک دو۔ روک دو۔ ہمیں رات نہ دو۔ رات کا عذاب ہم پر سے ساقط کر دو۔ لیکن ہم سب اپنے عمل میں مصروف رہے۔ رات کو ہماری قوت سامعہ نوبت کی تیسری آواز کو ہی گھیرے رہی۔

اور تیسری نوبت کے ساتھ ہی شہر کے ایک حصہ سے سنسناہٹ اٹھنے لگی تو ہم خاموش و بے بس ایک ٹک فضا میں گھورنے لگے۔

اچانک دور سے ایک پرچھائیں بھاگتی ہوئی نظر آئی۔ وہ اپنے راستہ کے تمام درختوں، ستونوں اور برجوں کے نیچے ٹھہر ٹھہر کر کچھ کہہ رہی تھی لیکن ہم صرف اس کے ہلتے ہوئے ہاتھ ہی دیکھ رہے تھے۔ اسی طرح وہ اس اونچے درخت تک آئی جو ہم اہل قلعہ کے لئے مخصوص تھا۔ وہ نیچے سے ہی ہاتھ ہلا ہلا کر چیخنے لگی۔ پھر ہیجان سے رونے لگی۔ ہم نے سامنے دیکھا تو تمام پرچھائیاں پراگندہ ہو کر اپنے مسکنوں سے باہر آگئی تھیں اور مختلف سمتوں میں بھاگ رہی تھیں۔ نیچے کھڑی ہوئی پرچھائیں ان کی طرف دوڑ پڑی۔ جب وہ تمام پرچھائیاں غائب ہو گئیں تو وہ پھر ہماری طرف پلٹی اور چیخنے لگی۔

یقین کرو۔ میں نے خود دیکھا ہے۔ ہماری مکمل تباہی آچکی ہے۔ اس سے فرار ناممکن ہے۔ وہ ــــ ایک بوڑھا شخص ہے۔

کون ایک بوڑھا ہے۔ ہم نے پوچھا۔

وہ ــــ وہی گھنگھروؤں والا۔ روشنی کے جھماکوں والا۔ جسموں کو بریدہ کر کے چمکانے والا۔ اس کے سر پر پگڑی ہے۔ جب وہ چلتا ہے تو شور ہوتا ہے۔ اس کے پاس دو تھیلے ہیں۔

تیسری نوبت پر وہ ظاہر ہوتا ہے اور فصیل شہر کے پاس ٹھہر کر پشت سے ایک جال نکالتا ہے۔ اس جال میں چھوٹے چھوٹے بہت سے چاندی سونے کے گھنگھرو بندھے ہیں۔ جال کی گھنڈیوں میں ہیرے اور لعل شب چراغ ٹنکے ہوئے ہیں۔ وہ اپنا جال فضا میں لہراتا ہے تو سنسناہٹ ہوتی ہے۔ ساتھ ہی گھنگھرو بجنے لگتے ہیں۔ پھر اندھیرے میں وہ ہیرے اور لعل آگ کی چنگاریوں کی طرح چمکنے لگتے ہیں۔ تب وہ جال کو ہاتھ سے چھوڑ دیتا ہے۔ وہ سنسناتا ہوا معینہ نشانہ کی طرف لپکتا ہے۔ پرچھائیاں اس جال میں قید ہو جاتی ہیں تو وہ ڈوری کو اپنے پاس کھینچنے لگتا ہے۔ پھر وہ اپنے داہنے گھٹنے سے ایک چمکتی ہوئی ڈبیہ نکالتا ہے اور جال میں سے ایک ایک پرچھائیاں نکال کر اس میں بند کر لیتا ہے۔ میں نے خود دیکھا ہے۔ پرچھائیاں بہت حسرت سے اس کی طرف دیکھ رہی تھیں۔

جب اس کے پاس ڈبیاں ختم ہو جاتی ہیں تو وہ دوسرے تھیلے سے ایک کوڑا نکالتا ہے اور جال میں مقید پرچھائیوں کو بے تحاشا مارنے لگتا ہے۔ پرچھائیاں بے بسی سے اپنے مختلف اعضا کھوتی رہتی ہیں۔ جہاں سے وہ درہ ان کے اعضا کاٹ دیتا ہے وہاں چمک پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ انھیں رات میں چمکنے بھٹکنے کے لئے جال سے باہر نکال دیتا ہے اور خود نہ جانے کہاں غائب ہو جاتا ہے۔

میں نے خود سنا ہے۔ وہ کہہ رہا تھا کہ کل وہ آخری بار اس شہر میں آئے گا اور تمام پرچھائیوں کو گرفتار کرلے جائے گا۔

درختوں سے لپٹی ہوئی تمام پرچھائیاں اپنے مسکنوں سے کود کر مختلف سمتوں میں بھاگ چلیں۔ صرف میں اس اونچے درخت پر رہ گئی تھی۔

صبح ہوتے ہی جب میں متشکل ہونے لگی تو قلعہ کی سمت جانے کی بجائے دروازہ کی سمت دوڑی۔ پھر مجھے ہوش نہیں۔ کیا ہمارے اہلِ شہر اپنے بریدہ جسموں کو سنبھالے کسی فیصلہ کے منتظر ہیں؟ کیا وہ پرچھائیاں ہمارے فرض کر لینے سے موجود ہو جائیں گی۔ کیا وہ کسی تجربہ یا عذاب کا شکار ہوئی ہیں؟

بوڑھا خاموشی سے آسمان دیکھ رہا تھا۔

کوا سامنے کی چٹان پر بیٹھا تھا۔

پہاڑی گھاس کے کیڑے اب ایک قطار میں واپس جا رہے تھے۔ بادامی رنگ کا کتا

اپنے پانچ ساتھیوں کے ساتھ اور نزدیک آچکا تھا۔ سورج چٹان کے آخری سرے پر لرز رہا تھا۔

کوا۔ دور افق کی طرف اڑ گیا۔

بادامی رنگ کا کتا۔ مع پانچ ساتھیوں کے کچھ دیر بوڑھے کو دیکھتا رہا پھر ہلکی سی 'بف' کرکے ایک سمت بھاگ نکلا۔

لڑکی۔ شاخ پر بیٹھ گئی۔ اس کے منھ۔ کان۔ ناک اور آنکھ سے سفید سفید بھاپ نکلنے لگی۔ پھر وہ بھاپ گاڑھے کثیف دھوئیں میں تبدیل ہو گئی۔ اور تیزی سے اخراج ہونے لگا۔

بوڑھا ــــ اپنے تسمہ لگے ہوئے تھیلہ پر جھکا ہوا تھا۔ ▯

پہلا چہرہ + چوتھا چہرہ = دوسرا چہرہ

شرجیل کا سارا المیہ یہی تھا کہ سارے مناظر اس کے جانے پہچانے معلوم ہوتے تھے۔ حالاں کہ اکثر اکتا کر اس نے نظر پوشی بھی کرنی چاہی لیکن اپنی ہی جلائی ہوئی برف کے پگھلے ہوئے گلیشیر سے نظر پوشی اب خود اس کے بس کی بات نہ رہ گئی تھی۔

یہاں۔ یہیں۔ آکر اسے وہ تمام مناظر یاد آرہے تھے جو اس نے کبھی خواب میں دیکھے تھے۔ رات کے پچھلے پہر کے خواب اف واقعی اتنے سچ ہوا کرتے ہیں۔ یہ احساس اسے یہاں آنے سے قبل کبھی نہ ہوا تھا۔ اور اسی لئے اس نے سوچا کہ اسے یہاں نہ آنا چاہئے تھا کہ یہاں کے سارے مناظر نہ جانے کب کے دیکھے ہوئے لگتے ہیں۔ نہ جانے کب کے ؟؟

یہاں۔ یہیں۔ ایک ٹھوہڑ کا بدنما درخت رہا ہوگا جس کے شمال کی سب سے نچلی شاخ کسی ضرورت کے تحت کاٹ لی گئی تھی۔

یہاں ایک نہر رہی ہوگی۔ جہاں شاید خواب میں کبھی سفید چاندنی اچھلی تھی۔

اور یہیں کہیں وہ تین دروازوں والا مہیب و بدہیئت قلعہ رہا ہوگا جس کے تینوں دروازوں سے ہمیشہ تین مناظر ابھرے رہتے ہیں وہی تین یکساں ازلی مناظر ـــ

شرجیل کی ذات نے یہاں آکر عجیب سا پہلو بدلا تھا کہ وہ سارے خواب جو اس نے کبھی دیکھے تھے یہاں آکر منظر میں تبدیل ہو گئے تھے۔

دیکھو یہاں ایک پوسٹ آفس رہا ہوگا اور اس کے سامنے ایک سپستاں کا درخت۔ اسی کے پاس ایک بند کرمٹ والا گھر ـــ ؟ جہاں کبھی جھربیری کے پودے اگ آئے تھے ؟؟

اور یہاں ایک

اب سارے ہی مناظر تو جانے پہچانے ہیں آخر کتنوں پر شناختی چپیاں لگاتا پھروں ؟

اس نے انھیں مناظر پر اپنی آنکھیں گھمائیں کہ شاید کہیں کوئی نیا پن آجائے لیکن اچانک ہی جب گلیشر پھر دماغ سے اڈنے لگے تو اس نے آہستگی سے نظریں واپس لے لیں۔

ہاں میں نے یہ بھی تو دیکھا تھا کہ وہ مجھے یہیں اور اسی وقت ملے گا لیکن ابھی گرد تو اٹھی ہی نہیں کیا خواب کی طرح یہاں بھی وہ مجھے لوگوں کے مجمع میں نہ پہچان سکے گا اور مجھے خواب ہی طرح پھر تاسف کی سانس لینا ہوگی لیکن میں اس سے پوچھوں گا ضرور۔

سنو! کیا تم نے رات کے دو بجے کے بعد کبھی کسی کی کراہ سنی ہے ؟ کیا تمھیں کبھی اپنے اردگرد کسی نمی کا احساس ہوا ہے ؟ ہاں ہاں وہ میری یاد تھی۔ اور تم نے نمی کو بھی ضرور پہچان لیا ہوگا۔ ہے نا ؟

یہ حقیقت ہے کہ وہ یہاں آکر اپنی ہی جلائی ہوئی برف کی آگ سے بچنا چاہتا تھا لیکن اب یہی بات اس کے بس کی نہ رہ گئی تھی اور وہ سوچنے لگا کہ کیا ماقبل کی طرح یہاں بھی شکست قبول کر کے وہ اپنی ہی بکی کا سبب بنے گا۔ اونہہ! آخر اکیلا کوئی کب تک محبت کرتا رہے۔ چیختا اور جھنجھلاتا رہے یا ہنستا اور بہلتا رہے۔ یہاں تو کوئی بھی کسی کو وہ نہیں دے سکتا جو اسے چاہئے۔ تو پھر کیوں وہ مانگ کر کچھ اور الفاظ کو رسوائی کی آزادی دے۔

حالاں کہ اب وہ ضبط نفس کی اس منزل پر آچکا تھا کہ کسی بھی صحیح جذبے کا اظہار نہ ہونے دیتا تھا۔ پھر بھی وہ خوب جانتا تھا کہ دماغ سے اڈنے والا گلیشر اس کے اعصاب کو مفلوج کر دیتا ہے اور وہ سحر زدگی کے عالم میں ہی سارے افعال انجام دیتا رہتا ہے۔ سارے اعتقادات پگھل کر نہ جانے کہاں بہہ جاتے تھے۔

اس نے کئی بار اس سحر زدگی کے عالم میں چاہا کہ میں جانے کو تیار رہوں اور کوئی مجھے زبردستی روک لے۔ لیکن ہر بار وہی ایک منظر کہ دوسرے خود پر طاری کردہ خوش اخلاقی سے اسے خدا حافظ کہنے کے لئے تیار نظر آتے اور اسے یاد آتا کہ ...... ایسے ہی کسی منظر پر کہیں ــــ وہ مختلف صورتیں آپس میں گڈمڈ ہوئی تھیں جنھیں اب وہ شناخت نہ کر پا رہا تھا۔ بس ایک احساس تھا کہ شاید شعور کا کوئی پیرا سائیٹ رہا ہو جو دکھا تو نہیں جا سکتا مگر سارے کا سارا موجود رہتا ہے اور اپنا کام کرتا رہتا ہے۔ اسی نے بتایا کہ ــــ

وہ دیکھو۔ وہ چھپا ہوا چہرہ — ! اسے پہچاننے کی کوشش کرو۔ وہ تمھاری بہن بھی ہو سکتی ہے۔ پھر اس کے پیچھے والے چہرے کو دیکھو۔ پھر اس کی داہنی طرف۔ اسے پہچانو! اور وہ جو ایک دھندلا خاکہ ہی ہے۔ یہ سب تمھارے جانے پہچانے ہیں۔ بس نام اور رشتوں کا لیبل چسپاں کر دینا ہے۔ وہ تم کر دو۔ یا تم نہ کر سکو گے تو کوئی دوسرا کر دے گا۔

ایک منظر پر لکھا تھا — کہ — جب ہم کسی سے محبت کرتے ہیں تو در حقیقت ہم اسی وقت اس سے محبت نہیں کرتے۔ بلکہ ہم اس محبت کی تجدید کر رہے ہوتے ہیں جو کافی عرصہ قبل اس کے لئے ہمارے دل میں موجود تھی۔ اور ہم نہ جانتے ہوئے بھی اس کے منتظر تھے — اور شاید اسی لئے مختلف شخصیتوں پر اس کے وجود کا دھوکا بھی کھاتے رہے۔

جیسے اس وقت وہ پیرا سائٹ ساری کہانی سنا رہا تھا — کہ —

جب شرجیل نے اس کئی ہزار سال پرانے غار میں پہلا قدم رکھا تو اس کا سارا خوف اور وسوسہ ان تمام جانے پہچانے مناظر میں غائب ہو گیا — اور اس نے بے دھڑک ان تہذیبی یادگاروں کو چھو لیا — ارے — یہ تو بالکل بھربھری ہیں — ؟ حالاں کہ بقول پیرا سائٹ اسے پہلے ہی بتایا جا چکا تھا کہ سوچ لو — ! اگر وہ تہذیبی یادگاریں بھربھری ہوئیں تو — کیا وہ کرب تم برداشت کر سکو گے — ؟؟

لیکن اس نے سوچا تھا کہ نہیں ایسا نہیں ہو سکتا۔ اس لئے کہ دراصل اسے اس وقت اتنا ہوش ہی نہ تھا کہ وہ ان دیواروں میں پوشیدہ دیمکوں کا تصور کر سکتا یا ان چاٹی ہوئی مٹیوں کے ہلکے پن کو محسوس کر سکتا۔ اسے تو سفر کی خواہش تھی اور کسی قدیم تہذیبی یادگار کی تلاش۔ اس کے سارے مناظر شناسا ہوں گے۔ یہ بھی اسے بعد میں ہی معلوم ہو سکا تھا۔

جب شرجیل کو علم ہوا کہ وہ سارے گلیشیر جو اسی کے بنائے ہوئے تھے آج خود اسی کے قلب میں دھنسے آ رہے ہیں تو اس کا پراگندہ ہو جانا غیر فطری بھی نہیں تھا۔ نہ ہی اس میں اس کی کوئی غلطی تھی کہ یہاں کے سارے مناظر اسے شناسا لگ رہے تھے۔ گو کہ اس نے کہا مجھے نئے مناظر کی کبھی بھی کوئی خواہش نہیں تھی لیکن اندر ہی اندر وہ نئے مناظر کا بصری اور لمسی حظ محسوس کیا کرتا تھا۔ اور خواہش مند رہتا تھا کہ کوئی ہاتھ بڑھے اور اس کے پپوٹوں کا سارا درد اور آنکھوں کی ساری کنکریاں چن لے۔ لیکن وہ ٹھٹھرا سا ان جانے پہچانے مناظر کو مجبوراً دیکھتا رہتا۔ دیکھتا رہتا —

یہ کہانی تو بعد میں نہ جانے کہاں سے اڑتی پڑتی چلی اور دیو مالا میں لکھ دی گئی کہ شرجیل نامی ایک دیوتا تھا ـــــ برف کا دیوتا ـــــ

جس کا باپ جگہ جگہ سرسبز میدانوں کی بہتی ہوئی نہروں کی تلاش میں سرگرداں رہتا۔ کہ وہ اپنے گلے کو زیادہ سے زیادہ آرام اور غذا پہنچا سکے اور زیادہ سے زیادہ صحت مند رکھ سکے۔ تاکہ کل وہ ان سے زیادہ سے زیادہ اون گوشت اور چمڑا حاصل کر سکے یا کسی اور شہر جاکر وہ ان سے خاصی رقم کے خواب بھی دیکھا کرتا۔

لیکن شرجیل کا باپ بھول گیا کہ اس کے ہمراہ شرجیل بھی لگا رہتا ہے۔ اس کی بھیڑوں اور اس کی امیدوں کا دشمن۔ حالاں کہ شاید اسے شک ہو گیا تھا اور اکثر راتیں گئے تک جاگ جاگ کر اپنی بھیڑوں کی رکھوالی کرتا رہتا تھا۔ اس لئے کہ شرجیل اور اس کے باپ میں پوری ایک نسل کا فرق تھا۔ لیکن کسی بھی لمحہ کوئی آہٹ یا کراہ نہ سنائی دیتی تو وہ مطمئن ہو کر سو جاتا ـــــ اور صبح اٹھتے ہی اسے کم از کم ایک بھیڑ ضرور غائب ملتی تو نہ جانے کیوں اس کا شک اپنے بیٹے ہی کی طرف جاتا۔ حالاں کہ اپنی دانست میں وہ اسے بہت پیچھے چھوڑ آیا تھا ـــــ شاید اس کے دماغ میں بھی شک کا کوئی پیراسائٹ تھا جو اسے کسی بھی انوکھے پن کا احساس دلا دیتا تھا۔

یوں ـــــ جیسے جیسے شرجیل بڑا ہونے لگا اس کا گڈریا باپ اس کی طرف سے ناامید اور اپنے گلے کی طرف سے پرامید ہونے لگا۔ چلو کچھ نہ سہی وہ اس گلے کو اپنا نہ سمجھے پھر بھی تباہ تو نہ کرے گا لیکن اس کا پیراسائٹ یہاں بھی مات کھا گیا کہ اسے آیندہ خطرات سے آگاہ نہ کر سکا۔

یہیں سے شرجیل نے کامیابی حاصل کرنا شروع کی۔ اپنے باپ سے علاحدہ ہوتے ہی اس نے اپنے ہی جیسے کئی جسم اور تیار کئے جو مختلف مواقع پر مختلف جگہوں پر موجود ہو کر اس کے باپ کو یقین دلایا کرتے۔ اور شرجیل تہذیبی یادگاروں کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔ ادھر شرجیل کا باپ ان مصنوعی اجسام سے دھوکہ کھاتا رہا اس لئے کہ وہ سب جب اس کے سامنے آتے تو اس کی منشا کے مطابق ہی قدم اٹھاتے اور اسے یہ اطمینان ہی لے ڈوبا۔ کہ اصل شرجیل تو ان سے بہت دور اپنے دوسرے روپ کی تلاش میں اپنے کو تہذیبی یادگاروں کی بھربھری مٹی میں کھو چکا تھا اس لئے کہ ان دونوں میں پوری ایک نسل کا فرق تھا۔ اس سے اس کے گڈریے باپ نے خود ہی کہا تھا کہ اپنے دوسرے روپ کی تلاش۔ عرفان کی دوسری

تیسری منزل ہوا کرتی ہے۔
اسی سفر میں شرجیل کو وہ حس کبھی ملی جس سے وہ سارے آیندہ مناظر کو دیکھ لیا کرتا تھا۔ اب یہ کون جانتا تھا کہ یہی حس اس کی ذات کا المیہ بن جائے گی۔
جب وہ ان تمام شناسا مناظر اور بوسیدہ قلعوں کے دیمک خوردہ سپنوں میں اپنے دوسرے روپ سے ملتا تو بہت خوش ہوتا تھا۔ اتنا خوش کہ رونے لگتا اور سوچتا کہ کل رات جب میں اس سے نہیں ملا تھا تو اس نے مل کر کیا کہا ہو گا اور کچھ ہی دنوں بعد وہ دیکھنے لگا کہ کل جب وہ مجھ سے ملے گا تو کیا کہہ رہا ہو گا۔ اس وقت کون سے مناظر ہماری آنکھوں کے سامنے لہراتے ہوں گے۔
اس طرح وہ خود بہ خود اپنے ہی بنائے ہوئے مصنوعی جسموں سے بہت آگے نکل گیا جو اپنی جگہ دو نسلوں کے درمیانی خلا کو پر کرنے میں منہمک تھے۔ ایک دن جب اس نے اپنے ہی آیندہ چہرے کو نئے مناظر میں دیکھا تو چیخ اٹھا ـــــ ارے میں یہ کب بن گیا جو بن جانا کہ میں نے کبھی خواب میں بھی نہ سوچا تھا۔ اب یہ حس میرے ہی لئے کرب کیوں بنتی جا رہی ہے؟ کاش میں سارے مناظر کو پہلے ہی نہ دیکھ لیا کرتا۔
دراصل وہ ان بھربھری مٹیوں کے درمیان اپنے مفروضہ دوسرے روپ سے بلاوجہ ہی متاثر ہو گیا تھا۔ حالاں کہ شاید اس دوسرے روپ کو معلوم ہی نہ ہو کہ وہ کسی کا دوسرا روپ ہے۔ شاید وہ یہ چاہتا بھی نہیں تھا کہ اس دوسرے روپ کو معلوم ہو۔ یا شاید درپردہ وہ خواہش مند رہا ہو ـــــ کہ کاش وہ دوسرا روپ جان لے کہ اب شرجیل برف کا دیوتا ہے جو برف پر چلتا ہے۔
بہت سی ندیاں آئیں اور اس کے قدموں میں اپنے آپ کو انڈیل کر اس کے فیصلے کی منتظر رہیں۔ لیکن وہ ان کی طرف دیکھ ہی نہ سکا۔ اس لئے کہ اب وہ برف کا دیوتا تھا۔ تند غصیلا اور قہر و جلال والا۔ جس کا راستہ خود راستے والے چھوڑ دیا کرتے تھے۔ اور وہ اپنی تندی، غصیلاپن اور قہر و جلال پر ایک پیار بھری نظر ڈال کر آگے بڑھ جاتا تھا۔ خوش اور مطمئن۔
لیکن یہ بات برف کا دیوتا شرجیل اپنے ایک پچھلے پہر کے خواب میں دیکھ چکا تھا کہ جب اس کے دوسرے روپ سے اس کا سامنا ہو گا تو یہ کچھ بھی نہ رہ جائے گا اور وہی ندیاں تب اسے طنز اور مضحکہ خیز نظروں سے دیکھیں گی۔ وہی راستے والے تب مضبوطی سے راستہ روکیں گے۔
لیکن آنکھ کھلنے پر وہ مطمئن رہتا کہ اس نے کبھی بھی کسی ندی کو کوئی اشواسن نہیں دیا تھا۔ نہ ہی

اس نے اپنے کو کسی راستے سے کم تر یا خوف زدہ محسوس کیا تھا۔ اس کا یہی اطمینان اس کی ابتدائی فتوحات کا ضامن بھی تھا۔

جب یہاں آکر اسے اچانک احساس ہوا کہ اب تو سارے ہی مناظر اپنی شناخت کی وجہ سے بے معنی ہوتے جارہے ہیں۔ ساری ہی آنکھیں اپنا کنوارپن زائل کرتی جارہی ہیں اور تمام راستے اپنی طاقت گنوا چکے ہیں، ندیوں کی پیاس بڑھتی جارہی ہے تو اس نے سوچا اے کاش اس وقت میرا دوسرا روپ (جو ہر لمحہ میرے پاس رہتا ہے) میرے سامنے آجائے اور میری ان فتوحات کو دیکھ لے۔ یا میں ہی فخریہ ان روندے ہوئے راستوں کو دکھاؤں۔ ان قدموں میں پڑی ہوئی ندیوں کی کہانی سناؤں، اپنے سفر ناموں کے اوراق اسے خود بتاؤں اور تب نہ صرف دادطلب بلکہ اجر طلب انداز سے اسے دیکھوں۔ خواہ وہ اجر ایک اکتاہٹ ہی کیوں نہ ہو۔ لیکن واقعی اکتاہٹ ہی اجر ملا تو۔ ؟ اس لئے کہ اکثر ایسا ہوا ہے کہ دوسرے روپ نے اپنا بھی کوئی دوسرا روپ بنا لیا ہے۔ شاید وہ بھول جاتے ہیں کہ وہ خود کسی کا دوسرا روپ ہوتے ہیں۔ غالباً اکثر المیے یہیں سے شروع ہوتے ہیں۔

وہ مجھ سے دور رہ کر بھی اتنا قریب کیوں ہے۔ وہ مجھ سے اتنی نزدیک رہ کر بھی دور کیوں ہے کہ میں اسے اپنے آنسو بھی نہیں دکھا سکتا۔ شرجیل بڑبڑایا۔

اکثر وہ اپنی تمام تندی، غصیلے پن اور قہر و جلال سمیت خود اپنے ہی بنائے ہوئے گلیشر میں دب کر ختم ہونے لگتا اور کچھ دیر بعد اس کی حنوط شدہ لاش باہر آجاتی جسے سنوارتے بناتے اس کی انگلیاں ہی پگھل کر بہنے لگتیں۔ پھر بھی اسے اپنے معصوم گڈریے باپ کو دھوکہ دینے پر کسی پشیمانی کا احساس نہ ہوتا اور وہ مطمئن رہتا کہ اس کے تین چہرے اپنی غرض تخلیق کو پورا کر رہے ہیں۔

اور چوں کہ اسے اپنے چہرے کے دوسرے روپ سے عشق تھا اس لئے اس نے تہذیبی یادگاروں کی تلاش کو ہی ترجیح دی۔ اس سلسلے میں نہ کسی کا مشورہ تھا نہ ہی کوئی نفسیاتی فلسفہ۔ بس وہ اس کے سامنے گڈریے کا لڑکا بن کر نہیں آنا چاہتا تھا۔ گو کہ اس نے اپنے رگ وپے میں تمام رشتوں سے انقطاع کا اعلان کر دیا تھا۔ پھر بھی نئے مناظر کی طرح کچھ لکیریں تنہائی میں ذہن کے نہ جانے کون سے کھلے دریچے سے عود کر آتیں۔ ایک بار ایک لکیر ابھری۔

عورت سب کچھ بن سکتی ہے۔ بہن نہیں۔ یہ لکیر بہت دیر تک کوندتی رہی۔ پھر دوسری

لکیر ابھری۔ لو۔ ؟ کل تک کی تمھاری محبوبہ نے آج تمھیں اپنا بھائی کہہ دیا۔ اب کر لو دل بھر کے محبت۔ یہ لکیر گوندی تو ذہن میں دوسرے سر ابھارنے لگے۔ شاید ایسا نہ ہو۔ لیکن اگر ایسا ہوا تو۔ ؟ وہ فرض کر لیتا کہ یہ تحریر جھوٹی ہے۔ کیا پتہ آنے والے مناظر بالکل ان دیکھے ہوں۔ کوئی ضروری تو نہیں ہے کہ ساری باتیں سچ ہی دیکھی جائیں۔ لیکن اسے حق کیوں نہ ملا کہ اپنی منھ بولی بہن کو بہن کہہ سکے۔ یا پھر کیا یہ ضروری تھا کہ کسی رشتے کا لیبل لگا کر ہی ملا جائے۔ جب کہ وہ مفروضہ بہن اس کا پہلا روپ بننا چاہتی تھی۔ وہ دوسرے روپ سے قریب تر بھی تھی۔ اس نے بھی دلچسپی سے دیوتا شرجیل کے بارے میں جاننا چاہا تھا جو کبھی بے نیازانہ برف پر چلتا تھا اور گلیشیر کھاتا تھا۔ برفانی ہوائیں پیتا تھا اور تند غصیلہ نیز قہر و جلال والا تھا اور شرجیل کے نزدیک اب تمام تہذیبی یادگاریں بھربھری اور دیمک زدہ تھیں دوسرے روپ کے علاوہ کوئی اس قابل نظر ہی نہ آیا تھا جسے وہ اہمیت دیتا۔ اس لئے کہ دوسرے روپ کی ساری اچھائیاں اسی کے ذہن کی پیداوار تھیں۔

لیکن کہیں اس دوسرے روپ نے اپنا کوئی دوسرا روپ نہ بنا لیا ہو۔ جو اس کے نزدیک برف کا دیوتا ہو جس کے لئے ہی اس کے ذہن نے ساری اچھائیاں فرض کر لی ہوں۔ ورنہ اس سے قریب تر پہلا روپ شرجیل سے سوالات کیوں کرتا۔ بینک کے لاکر میں محفوظ اصل چہرہ کی تلاش کیوں ہوتی اور اگر وہ واقعی پہلا روپ ہے تو اس نے سوال کیوں کیا۔ کیا اصل شرجیل اپنے ہی بنائے ہوئے دوسرے روپ سے دھوکہ کھائے گا۔ تب بھی کیا وہ شرجیل رہ جائے گا۔ تند غصیلہ اور قہر و جلال والا۔

یہ الیسوں کی ساری پوشیدہ اور تہ در تہ خراشیں اسی کے حصے میں کیوں آئی ہیں۔ سارے مناظر اسے ہی کیوں جانے پہچانے لگتے ہیں۔ کیا پچھلے پہر کے خواب ہمیشہ یوں ہی لوٹ کر ملتے ہیں۔ تو وہ منظر کیا ہوا کہاں ہے ؟ جسے اس نے بار ہا دیکھا تھا یا صرف فرض ہی کر لیا تھا کہ۔ کوئی۔ رات دو بجے کے بعد اس کی کراہ سن سکا ہوگا جو نمی محسوس کر چکا ہوگا وہ کہاں ہے کون ہے۔ کیا ہے ؟؟ اب تو آ جائے کہ پیروں کے آبلے بھی خشک ہو چکے ہیں۔ آنکھوں کی بینائی بھی واپس آتی جا رہی ہے یا یہ سب میرا مفروضہ ہی ثابت ہوگا۔ ؟ کاش کوئی دوسرا روپ موجود ہوتا۔ وہ میرا ہوتا۔ میرے پچھلے پہر کے خوابوں جیسا ہوتا (اگر ایسا نہ ہوا تو کیا ہوگا۔ ؟) یہ نہ جانتے ہوئے کہ وہ کسی کا دوسرا روپ ہے اس نے کوئی دوسرا روپ نہ بنایا ہوتا۔ وہ کیسا ہوگا؟

اے کاش منزل مقصود پر پہنچنے سے قبل میں ایک بار ہی سہی اس منظر کو دیکھ لیتا۔ کاش ــــ!
تب میں اپنا تمام قہر و جلال تندی اور غصیلہ پن اس کے دامن میں انڈیل سکوں گا۔ ورنہ تب بھی مجھے دیوتا بنے رہنا ہوگا اور اب رگ وید کا بوجھ، وحی و الہام کا تمام کرب مجھے برداشت کرتے رہنا پڑے گا۔ جانے کب تک۔ نہ جانے کب تک۔ کاش۔ !! تاکہ اب شرجیل کو کوئی بھی منظر جانا پہچانا نہ لگے اور خود اس کا مفروضہ دوسرا روپ اسے احساس کمتری میں مبتلا کر کے اس برفیلی گلیشر کے نیچے نہ لڑھکا دے انھیں ندیوں کے قدموں میں جنھیں وہ کب کا ٹھکرا چکا تھا۔ انھیں راستوں کے لئے جو اس سے لجاتی ہی سہی شکست قبول کر چکے تھے۔ اس لئے کہ بہر حال وہ اب بھی شرجیل تھا۔ برف کا دیوتا صاحبِ قہر و جلال دیوتا۔

اچانک ایک دن اسے علم ہوا (بہت بعد میں) کہ اس کے گڈریے باپ کا سارا گلہ تباہ ہو چکا ہے اور شرجیل کی غیر موجودگی نے جھونپڑی کی پھونس گلا دی ہے اور دیمکوں نے دیواروں کو اندر سے بالکل کھوکھلا کر دیا ہے جو اب آہستہ آہستہ زمین بوس ہوتی جا رہی ہیں۔ وہ چیخ اٹھا

اف۔ کیا میرے بقیہ جسموں سے اتنا بھی نہ ہو سکا کہ انھیں محفوظ کر لیتے اور میرے گڈریے باپ کی مرضی کے مطابق ہی افعال انجام دیتے رہتے۔ کیا۔ وہ دیوتا شرجیل بن جانے کے خواب میں اپنا مصنوعی جسم وہاں چھوڑ گئے تھے مصنوعی ماش کے پتلے اور برف کا دیوتا شرجیل؛
یہ ایک ایسا پیش آمدہ منظر تھا جو اس کا شناسا نہیں تھا۔ جسے اس نے کسی بھی رات کے پچھلے پہر نہ دیکھا تھا۔ ارے۔ کسی نئے۔ اچانک نئے منظر کا کرب بھی اتنا شدید ہو سکتا ہے کہ سارے دیکھے ہوئے مناظر کے رنگوں کو ختم کر دے اور آدمی اپنا سارا فلسفہ بکھرتا ہوا محسوس کرنے لگے۔ کاش ! اے کاش ! اس نے یہ منظر کبھی نہ دیکھا ہوتا۔ بلکہ ساری زندگی انھیں شناسا مناظر میں کھویا رہتا۔ اور گلیشر اٹھ اٹھ کر اسے اپنے نیچے دبائے رہتے۔ وہ دبتا رہتا تاکہ اسے اپنی عبادت کی ناجائز اولاد تو دیکھنے کو نہ ملتی۔

کوئی بتاؤ کب میرے دل میں واقعی کھوٹ آئی تھی۔ میں تو ہر ایک کے لئے کھلی ہوئی کتاب تھا۔ میں نے کب ناشناسا مناظر کو اپنے سے قریب دیکھنا چاہا اور انھیں اپنے حظِ نفس کے لئے مس کرنا چاہا۔ میرے پاس میرے اپنے صرف تین ہی مناظر تو تھے۔ بقیہ مناظر تو ان منظروں کے دوسرے تیسرے روپ تھے۔ پھر میرے باپ کو یہ سزا کیوں ملی کہ اس کا تمام گلہ

تباہ کر دیا گیا۔ وہ توان کی اجرت میں بہت زیادہ اون، گوشت اور دودھ کی آس لگائے تھا۔ یہ دیمک زدہ جھونپڑی ہی اس کا منتہی کب تھی۔ میں نے بھی اس کے لئے قصر حمراء کی بنیاد رکھنی چاہی تھی۔ اب اسے ابوالہلول کے مسکنوں میں کیوں پھینک دیا گیا — ؟؟

(تم سب خوب جانتے ہو کہ میں کس سے مخاطب ہوں) وہ سارے ناآشنا مناظر میرے ہی تو نہ تھے۔ تم بھی توان میں شریک تھے پھر تم میں شعور کا وہ پیراسائٹ کیوں نہ آسکا جو بتا سکتا کہ تمہارا دوسرا روپ یہ نہیں ہے جسے تم نے بنا لیا ہے۔ بلکہ تمہارا اصل دوسرا روپ وہ ہے جس کی حدود کشش میں کسی بنیادی غلطی کی وجہ سے تم آہی نہ سکے تھے۔

تمہارا اصل شرجیل تو وہ ہے جو اب بھی گلیشر کے سہارے زندہ ہے اور مستحکم تہذیبی یادگاروں کا متلاشی ہے۔ جسے تم نے شرجیل فرض کر لیا ہے وہ تو اس شرجیل کے دھوکے میں ہی فرض کیا ہوگا۔ شاید تمہارا پیراسائٹ ابھی شرجیل کے پیراسائٹ اتنا جری، طاقتور، تند، غصیلہ اور قہر و جلال والا نہیں ہو سکا ہے۔

اصل شرجیل تو ۱۱ برس سے متلاشی ہے لیکن ہر جگہ شناسا منظر ہی دیکھتا آرہا ہے۔ جیسے یہ تمام مناظر اس کے پچھلے پہر کے خوابوں سے گزر چکے ہوں۔ جو اب اس کی ذات کا ایک المناک پہلو بن چکا ہے اور برف کے دیوتا کی زندگی کا ایک اہم عنصر۔ وہ سوچتا تھا کہ جس دن اسے چوتھا منظر دکھائی دیا اسی دن اس کی موت ہوگی (جو سراسر جھوٹ ثابت ہوا) اب شرجیل کو یقین ہو رہا ہے کہ اس نے چوتھا منظر دیکھ لیا ہے۔ اسے بتاؤ کہ نہیں یہ چوتھا منظر ۲۷-۲۸ ستمبر کی اولیں شب کا خواب ہی ہے۔ محض بے معنی خواب جس کا پچھلے خوابوں سے کوئی ربط نہیں ہے ورنہ اب برف کا دیوتا شرجیل تہذیبی یادگاروں کو چھوڑ کر اپنے اجداد کی جھونپڑیوں کی دیمک خوردہ مٹیوں کو اپنی قوت ارادی کی مضبوط مٹھیوں میں جکڑ کر ریزہ ریزہ کر دے گا اور وہ چیخ چیخ کر اپنے پہلے روپ کو پکارے گا۔ پھر چوتھے روپ کو آواز دے گا۔ گلیشر اسے دباتے جائیں گے۔ دباتے جائیں گے۔

اور ایک ہی لمحہ بعد اس کی ساری تندی، قہر و جلال اور تمام غصیلہ پن ایک سرد لاش کی صورت میں اسے چوتھے منظر کا یقین دلا دے گا —— اور چوتھا منظر۔

شرجیل برف کا دیوتا اپنے دوسرے روپ کو گواہ بنا کر اپنے رگ وید میں لکھ چکا ہے — کہ — میں دوسرے دن کے سورج کا پہلا منظر کبھی نہ دیکھ سکوں گا۔

تب —! اس کا پہلا چہرہ + چوتھا چہرہ = دوسرا چہرہ - اور اس کا پہلا روپ + چوتھا روپ = تیسرا روپ —— اپنے تیسرے چہرے اور دوسرے روپ کی تلاش میں کھو جائیں گے۔

لیکن برف کا دیوتا شرچیل تو دوسرے جنم کا بھی منکر ہے۔ ◻

سانپ

کسی غیر مرئی جھٹکے کی وجہ سے اس کی آنکھ کھل تو گئی لیکن وہ سمجھ نہ سکا کہ کیا ہو گیا ہے۔ گھپ اندھیرا۔ چاروں طرف بکھرا ہوا اندھیرا۔ وہ طے نہیں کر سکا کہ وہ ہے کہاں؟ آسمان کدھر ہے اور زمین کتنی دور۔ وہ کھڑکی کہاں گئی جو میرے داہنے ہاتھ کے بالکل قریب تھی۔ مشرق، مغرب، جنوب شمال اب کدھر ہوں گے۔ بہت دیر تک دماغ صرف سائیں سائیں کرتا رہا۔ پھر آنکھ کے اندر پٹ پٹ کچھ بولنے لگا۔ اس کے ساتھ اندھیرے میں مٹیالے رنگ کے چھوٹے چھوٹے پروانے اڑنے لگے۔ سر کے نیچے آسمان اوپر زمین۔ یا کہیں نہیں۔ اس نے جلدی سے آنکھیں بند کر لیں۔ دل اور تیزی سے دھڑکنے لگا اور بہت سے دائرے گڈمڈ ہو کر اسے اوپر کی طرف اٹھانے لگے۔ اوپر۔ اور اوپر۔ کیا یہ کل رات کی زبردست بارش اور طوفان کا اثر ہے۔ میں یہاں کب آیا۔ کب سے اس طرح پڑا ہوں۔ پتہ نہیں ٹرین گذر گئی کہ نہیں۔ اس نے آنکھ کھول دی اور اندھیرے میں گھورنے لگا۔ ان گھونسلوں سے پھر تنکے اڑ گئے ہوں گے۔ جمع کر دیا جائے۔ اچھا۔ لیکن دروازہ تو باہر سے بند ہو گا۔ آنکھیں اندھیرے سے مانوس ہونے لگیں۔ دیواروں پر عجیب عجیب سے دھبے واضح ہونے لگے۔ کچھ پرچھائیاں ان دھبوں کے اوپر رینگ رہی تھیں۔ اس نے بے ساختہ مخالف سمت دیکھا۔ وہاں بھی دھبوں پر ویسی ہی پرچھائیاں تھیں۔ مکڑی کے جالے ہیں۔ وہ ان دھبوں اور پرچھائیوں کو گھورتا رہا۔ پھر وہ دھبے بڑے ہونے لگے اور بڑے ہوتے ہوتے سارے کمرہ میں بکھر گئے۔ اس کے چاروں طرف سب کچھ رینگنے لگا۔

دریچے لڑتے ہوئے اوپر سے اس کے سینہ پر ٹپک پڑے تو اچانک ہی وہ گھگھیاتا ہوا اٹھ بیٹھا لیکن اٹھتے ہی اسے محسوس ہوا جیسے اس کی پیشانی سے "نور ساطع" ہو رہا ہے۔ وہ خوفزدہ ہو کر ایک طرف کھسک سا گیا۔

جہاں اس کا سر تھا وہیں سے تیز روشنی پھوٹ رہی تھی۔ وہ ایک ٹک اس روشنی کو گھورنے لگا۔ پھر روشنی کے ساتھ ہی ساتھ اس کی نگاہ بند کھڑکی کی اس جھری کی طرف چلی جہاں سے چاندنی کی کرن ایک لکیر بناتی ہوئی اس کے سرہانے گر رہی تھی۔ وہ بیٹھ کر اس دو انچ کی زرد روشنی کو گھورتا رہا جو غیر محسوس طریقہ سے آگے کھڑکی کی ہی سمت بڑھتی جا رہی تھی۔

پو پھٹے جب اس کا کمرہ کھلا تو وہ کھڑکی کے پاس سر جھکائے کھڑا تھا۔ اس کے رخساروں پر آنسوؤں کی واضح لکیریں بنی ہوئی تھیں۔ کھڑکی کے باہر ہوا خشک و زرد گھاس میں پھنسی ہوئی پھڑک رہی تھی۔

صبح بہت سویرے جب افسر جگایا گیا تو اس کا چہرہ غصہ کی وجہ سے سرخ ہو گیا۔ کون بھاگ رہا تھا؟

وہی۔ اس سے پوچھ لیجیے۔ وہ کھڑکی تک پہنچ چکا تھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں کیل تھی اور دوسرے میں ریشم کی ڈوری۔ یہ تو کہیے کہ میں بر وقت ....

اس کے پاس کیلیں اور ڈوری کہاں سے آئی۔ افسر نے گرج کر پوچھا تو سب خاموشی سے بکھرنے لگے۔ میں آتا ہوں۔ اسے نظر میں رکھو۔ کہہ کر وہ گون کی ڈوری باندھتا ہوا اندر چلا گیا۔

وہ امرود کے درخت کے نیچے تھوڑی ہاتھوں پر ٹکائے بیٹھا ہوا اوپر دیکھ رہا تھا۔ گرد و پیش سے بے خبر اور چڑیاں آہستہ آہستہ باتیں کر رہی تھیں۔ رات کے طوفان نے بہت سی امرود کی ٹہنیاں چاروں طرف بکھرا دی تھیں جنھیں وہ بالکل اپنے پاس ڈھیر کر چکا تھا۔

بہت سے لوگ اسے دور دور سے گھیرے ہوئے تھے۔ خاصی دیر کے بعد جب سورج کی کرنیں درخت پر گرنے لگیں تو دونوں چڑیاں اڑ گئیں۔ لیکن وہ دیر تک اسی سمت گھورتا رہا۔ سورج کی کرنیں پڑنے سے امرود کی ایک شاخ کی اگلی سرخ پتی پر رکا ہوا اوس کا ایک قطرہ دمک اٹھا جسے اس نے آنکھوں کے کئی زاویے بدل بدل کر دیکھا۔ آسودگی اور طمانیت کی زندہ سی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر پھیل گئی۔ اس نے آہستہ سے وہ شاخ جھکائی اور زبان باہر نکال کر قطرہ زبان پر روک لیا۔ دور کھڑے ہوئے لوگوں میں سے ایک نے اس کی طرف ایک

ڈھیلہ مارا ۔ وہ چونک اٹھا۔ پھر دونوں ہاتھ سے منھ چھپا کر سسکیاں لینے لگا۔ میں اسے دیکھنے کے لئے اور قریب چلا گیا۔ وہ سب لوگ چیخنے لگے۔

اس نے ہاتھ ہٹا کر پہلے ان شور مچاتے ہوئے لوگوں کو دیکھا پھر مجھے گھورنے لگا۔ مجھے ایک شدید جھٹکا محسوس ہوا اور کئی بار کوشش کی کہ میں اس کی آنکھوں میں دیکھ سکوں لیکن نہ دیکھ سکا۔ دھیرے دھیرے اس کے ہونٹوں پر پھر مسکراہٹ پھیلنے لگی۔

دور کھڑے ہوئے لوگ شور مچانے لگے۔ بھاگ آؤ۔ بھاگ آؤ۔ اس کی آنکھوں کی طرف دیکھنے کی کوشش نہ کرو۔ اس کے کھل کر مسکرانے سے پہلے پیچھے ہٹ آؤ۔ میں خوف زدہ ہو کر پچھلے پیروں ہٹتا ہوا ان کے ساتھ آکھڑا ہوا۔ لیکن آتے ہوئے میں نے اس کی وہ ہنسی دیکھی تھی جسے وہ روکنے اور چھپانے کی کوشش کر رہا تھا۔ پھر وہ گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر اٹھا اور ٹوٹی ہوئی ٹہنیوں کو ان کی اکھڑی ہوئی جگہ سے ملانے کی کوشش کرنے لگا۔ بہت دیر تک وہ ایک ایک ٹہنی اٹھا کر امرود کے درخت سے لگاتا رہا لیکن وہ پھر گر جاتی تھی۔

دور سے افسر آتا ہوا دکھائی دیا تو سب ادھر ادھر بکھر گئے۔ جب اس نے افسر کو دیکھا تو ہونٹوں پر پھر وہی مسکراہٹ اُمڈ پڑی جسے اس نے فوراً چھپا لیا اور چونک کر تمام ٹہنیوں کو امرود کی سالم شاخوں میں پھنسانے لگا۔ جب افسر بہت نزدیک آگیا تو اس نے منھ پھیر کر ہنسی چھپائی اور جلدی سے آنکھوں کے کونوں سے دو قطرے خشک کر لئے۔ پھر امرود کے درخت کو تھپتھپانے لگا۔ جیسے جدا ہوتا ہوا باپ اعصاب زدگی کے عالم میں اپنے اکلوتے بچے کے تمام جسم کو تھپتھپاتا رہتا ہے۔ اور بھرّائی ہوئی آواز سے اسکول جانے، شام کو جلدی لوٹ آنے پھر اپنی ماں کا خیال رکھنے کی تاکید کرتا رہتا ہے۔

جب افسر بہت نزدیک آگیا تو وہ درخت کو مس کرتا ہوا کمرہ میں گھس گیا۔ افسر نے درخت کے پاس آکر ٹہنیوں کو ٹھوکر ماری "یہ سب ٹہنیاں اور پتے صاف کرو۔ اس نے مڑ کر اپنے پیچھے والے آدمی سے کہا جس کے ہاتھ میں چھوٹی بڑی کیلوں کا ڈبہ اور ہتھوڑا تھا۔ دوسرا آدمی گردن ہلاتا ہوا اس کے ساتھ ہی ساتھ کمرہ میں داخل ہو گیا۔

میں نے وہاں کھڑے ہوئے لوگوں میں سے ایک شخص سے پوچھا "یہ — یہ کون آدمی ہے ؟"

"کون آدمی ؟"

"وہی وہ امرود والا"۔

"وہ ــــ وہ پاگل ہے سالا۔ ہم لوگوں نے تمھیں منع کیا تھا کہ اس کے نزدیک نہ جاؤ۔ کیا تم اس کی آنکھوں میں دیکھ سکے تھے؟"

"نہیں۔ ایک لمحہ بھی نہیں"۔

ہاں اس کی آنکھوں میں کوئی نہیں دیکھ سکتا۔ کوئی بھی نہیں۔ بڑے سے بڑا افسر بھی مات کھا گیا لیکن کوئی بھی، باوجود خواہش کے اس کی آنکھوں میں نہیں دیکھ سکا کہ ان کی رنگت کیسی ہے۔ ایک آدمی نے بتایا کہ وہ گہری سرخ رنگ کی ہیں۔ پتلیوں کے گرد زرد رنگ کا دائرہ بھی ہے۔ دوسرے کا کہنا ہے کہ سرخ نہیں کبودی رنگ کی ہیں۔ اور دائرہ کا رنگ بھی سیاہ یا گہرا نیلا ہے۔ خدا جانے۔ کیا تم نے اس کی مسکراہٹ دیکھی تھی۔ ایں۔ ؟

ہاں!

تمھارا کیا خیال ہے اس کے بارے میں۔ یعنی کہ وہ کیسی مسکراہٹ تھی، مطلب یہ اس مسکراہٹ کا مطلب کیا تھا مطلب کہ.... ؟

اب میں نے غور کیا واقعی وہ تھی تو مسکراہٹ لیکن عجیب وغریب۔ یعنی کوئی بات اس کی مسکراہٹ میں عجیب ضرور تھی۔ ایسی کہ اب تک نہ دیکھی گئی ہو۔ کچھ کچھ پر اسرار کچھ ڈرا دینے والی۔

وہ آدمی جس نے سوال کیا تھا اب بھی جواب طلب نظروں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ مطلب، مطلب یہ کہ یا تو اس مسکراہٹ کو بیان نہیں کیا جا سکتا۔ یا پھر کئی برس تک اس کے بارے میں باتیں کی جا سکتی ہیں۔ یعنی ؟

بالکل یہی۔ یہی باتیں تمام ماہرین نفسیات نے بھی کہی تھیں جو اس کا علاج کرنے آئے تھے۔

لیکن یہ ہے کون ..... مرض کیا ہے ؟

میں نے کہا نا پاگل ہے۔

پاگل ؟

ہاں۔ یہ ایک بار بچپن میں اپنے باپ کے ساتھ سون ندی پر سے گذرا تھا۔ اس وقت صبح ہو رہی تھی۔ اس نے وہ منظر بڑی حیرت اور شوق سے دیکھا تھا اور اس وقت سے اب تک پانچ بار اسی ٹرین سے سون ندی پر سے گذرا ہے لیکن وہ منظر کبھی نہ دکھائی دیا جس کی وجہ سے یہ پاگل

ہوگیا۔

کیسا منظر تھا وہ۔ میں نے کچھ سوچتے ہوئے آہستہ سے پوچھا۔

ہونہہ۔ یہ کہتا ہے کہ وہ منظر اسے بلا رہا تھا۔ اس سے باتیں کر رہا تھا۔ اس کی طرف دیکھ دیکھ کر دوسروں کو اشارے کر رہا تھا مسکرا رہا تھا کھلکھلا کر ہنس پڑا تھا۔ اور یہ بہت دور تک مڑ مڑ کر اسے دیکھتا رہا۔ پھر بہت دیر تک روتا رہا تھا۔ پاگل سالا۔

اندر سے ٹھک ٹھک آواز آنے لگی۔ بیچ بیچ میں کوئی زور سے بولتا بھی تھا۔

یہ اندر کیا ہو رہا ہے ؟

کھڑکی اور اس کی تمام جھریاں بند کی جا رہی ہوں گی۔

کیوں ؟

وہ اس کے سامنے جا کر کھڑا ہو جاتا ہے اور باہر دیکھا کرتا ہے۔ بھاگ جانے کا خطرہ ہے اور ٹرین بھی تو ادھر سے ہی گزرتی ہے۔

تمھیں کیسے معلوم ہوا کہ وہ بھاگ جائے گا ؟

ارے پہلے بھی تو ایسا ہو چکا ہے نا۔ تم نے دیکھا نہیں تھا۔ وہ کمرہ سے نکلتے ہی چڑیوں کے گھونسلے کے تنکے جمع کرنے لگا تھا۔ پھر انھیں اٹھا اٹھا کر ان کی جگہ پر رکھ رہا تھا۔ امرود کی ٹوٹی ہوئی ٹہنیوں اور پتوں کو ان کی مجروح شاخ سے جوڑنے کی کوشش کر رہا تھا۔

در اصل اس کا باپ بہت شریف آدمی ہے۔ ماں بھی صابرہ شاکرہ، پابند صوم وصلوٰۃ عفت مآب بی بی ہیں۔ دادا نانا بھی ایسے ہی تھے۔ اس لئے اسے بھی تمام اچھی اچھی باتیں بتائی جا رہی تھیں لیکن یہ بزرگان دین کے قصوں کے بجائے رانی سارنگا اور راجہ ڈھولا کی کہانی سنا کرتا۔ دوپہر میں گھر کے تہ خانوں میں قیلولہ کرنے کے بجائے بگولے اڑاتے ہوئے قبرستانوں کی طرف نکل جاتا۔ اور مٹھی میں دبے ہوئے آٹے کو چیونٹیوں کی قطاروں کے پاس انڈیلتا رہتا۔ قرآن شریف ختم کرنے سے پہلے اس نے سب سے پہلی کتاب موپاساں کے اردو تراجم پڑھی تھی۔ تمام گھر کی آنکھیں اس پر لگی رہتی تھیں۔ لیکن یہ انھیں دیکھ دیکھ کر زیر لب مسکراتا رہتا تھا اور وہ سب اس کی مسکراہٹ پر چراغ پا ہوتے لیکن جب آنکھیں ملانے کی کوشش کرتے تو خوف کی ٹھنڈی لہر ان کے تمام جسم میں کوند جاتی۔ وہ بڑبڑا کر خاموش ہو جاتے۔ کئی طریقوں سے کوشش کی گئی کہ یہ گھر اہل خاندان تک محدود رہے لیکن وہ کبھی ان کے ساتھ شریک نہ

ہو سکا۔ جب پہلی بار یہ غائب ہوا تو کئی دن تک گھر میں کہرام مچا رہا۔ اس کے جسم پر جاتے ہوئے صرف ایک لمبی سی میلی بنیائن اور ایک انڈر ویر تھی۔ بہت تلاش کے بعد جب لوگ مایوس ہونے لگے تو اچانک معلوم ہوا کہ وہ اس کوڑھی فقیر کے ساتھ رہتا ہے جو چوراہے پر پیپل کے نیچے بیٹھتا ہے۔ لوگ وہاں پہنچے تو دیکھا کہ وہ اس فقیر کی کتھری پیٹے بیٹھا اسے ملا نصیر الدین کے لطیفے سنا رہا تھا۔ گھر والوں نے بہت دعا تعویذ کیا کہ یہ ٹھیک ہو جائے۔ کوئی پیر فقیر اور بنگالی عامل باقی نہ بچا لیکن جب مایوس ہو گئے تو دل پر پتھر رکھ کر بیٹھ گئے اور اسے اس کی قسمت پر چھوڑ دیا۔ اور وہ کسی کونے میں بیٹھا ہوا یا تو مکڑی اور اس کے جالوں کو گھورتا یا چیونٹیوں کی قطاروں کے ساتھ ساتھ دن بھر چلتا رہتا۔ اور شام کو اس درخت کی تلاش میں نکل پڑتا جس پر سب سے زیادہ چڑیاں بسیرا لیتی ہوں اور وہی پر اسرار مسکراہٹ ہمہ وقت اس کے ہونٹوں پر ناچا کرتی۔ دوسرے اس کی طرف دیکھتے اور چپ چاپ سر جھکائے مسکراتے ہوئے نکل جاتے۔ ماں باپ بھی شرمندگی اور طعنوں کی وجہ سے کمزور ہو گئے تھے۔ دو دو تین تین دن بعد جب وہ چڑیوں کے غول کے ہمراہ واپس آتا تو اس کے سامنے کھانے کی سینی رکھ کر اس کی ماں دوسرے بھائیوں کو دور بھگا دیتی۔ اس کے ہونٹوں پر پھر وہی مسکراہٹ آجاتی۔

باپ دروازہ کے پیچھے چھپ کر اس کی باتیں سنتا اور ماں اسے کچھ بھی بولنے پر اکساتی رہتی۔ وہ کہتا۔

اب مجھ میں مشورہ کرنے خود فیصلے کرنے اور خود ہی عمل کرنے کی صلاحیت بالکل نہیں۔ بالکل نہیں۔ مجھے صرف ایک ماہ کے لئے آزاد کر دو۔ صرف ایک مہینہ کے لئے۔ تم سب لوگ۔ سب لوگ۔ مجھے چھپ کر نوحہ و ماتم کرنا ہے۔

ماں دیکھتی رہتی اور وہ بغیر امام ضامن بندھوائے نکل جاتا۔

باپ دروازہ کے پیچھے سے نکل کر پر اسرار انداز میں کہتا۔ اسے مت چھیڑو۔ اس میں زہر ہے۔ وہ بہت زہریلا ہے۔ اس سے ملتے وقت ہمیشہ ایک فاصلہ مدنظر رکھو..... کل رات میں نے خواب میں دیکھا تھا۔ یہ گائے کے پچھلے دونوں پاؤں باندھ کر اس کا دودھ پی رہا تھا۔ کیا تم اس کی آنکھوں میں دیکھ سکتی ہو یا کبھی اس کے اگلے دونوں دانت دیکھے ہیں.....؟؟

خدا اسے اپنے حفظ و امان میں رکھے۔ میرے بچے پر کسی نے ضرور کچھ کر دیا ہے۔ اس کی ماں آہستہ سے کہتی۔

جب وہ آخری بار گھر سے نکلا تو پھر لوٹ کر نہ جاسکا۔ بہت دنوں تک اس کی بہن اس کے لیے بھنے ہوئے چنے اور سونٹھ ملا ہوا گڑ چھپا چھپا کر رکھتی رہی ۔ اکثر راتوں میں بہت دیر میں کھانا کھاتی۔ اس کی بچیاں بھی اکثر اپنی ماں سے اس کی باتیں کیا کرتیں.... اور انتظار میں بہت دیر تک جاگ کر عجیب سی لذت محسوس کرتیں اور جب.....

اندر کوئی زور سے گرجا اور دھڑ سے دروازہ کھول کر ایک آدمی باہر نکلا اس نے بات کاٹ کر اس باہر نکلنے والے سے پوچھا "کیا بات ہے ؟"

"پلاس بھول گیا تھا" کہہ کر وہ جلدی سے چلا گیا۔

"یہ پلاس کیا ہوگا ؟" میں نے جلدی سے اس سے پوچھا۔

شاید اور دانت توڑنا پڑے ۔ یا پھر ناخن نکالنے کی نوبت آگئی ہو۔ وہی لوگ جانیں۔ اس نے لاپروائی سے کہا۔ ہاں تو جب کبھی شام ہوتے ہوئے وہ گھر پہنچتا تو سب چپ چاپ اس کے اردگرد کھڑے ہو جاتے اور یاس وحسرت سے اسے تکنے لگتے ۔ وہ ان سے وعدے کرتا۔

"ماں کے لیے ٹوتھ پیسٹ اور پائل لاؤں گا۔ بہن کے لیے کنگن اور ڈائریاں ۔ باپ کے لیے دوائیں۔" پھر کہتا۔ "اس بار تو نہیں ہاں جب اگلی بار آؤں گا تو انشاء اللہ ابا کے مصنوعی دانت لگوا کر ہی جاؤں گا۔ صحت بہت گرتی جارہی ہے۔ بھائیوں سے کہتا کہ ان کے لیے فٹ بال پرانے بلیڈ، کپڑے رکھنے کا بکس اور رنگ کے ڈبے لائے گا۔ چچی کے لیے باترجمہ قرآن شریف مطبوعہ پاکستان۔ کسی سے قمیص اور موزوں کے وعدے کرتا۔ کسی کو یقین دلاتا کہ اس بار اس کے کھیتوں میں زیادہ پیداوار کے لیے کسی سے تعویذ لکھوائے گا ـــ اور ـــ بچے گئی رات تک اس کے پاؤں دباتے اور فرمائشیں سوچتے رہتے ۔ جب وہ دوسری بار جاتا تو پھر سب اس کے گرد جمع ہو جاتے اور شوق وتجسس سے اس کے سامان کی طرف دیکھا کرتے ۔ وہ باہر نکل کر پھر مسکرانے لگتا۔ زہریلی اور مکروہ مسکراہٹ۔

وہ آدمی تیزی سے آتا دکھائی دیا۔

"ملا ـــ ؟"

"ہاں !" وہ جلدی سے دروازہ کھول کر اندر چلا گیا۔ اندر سے کئی بار زور زور سے بولنے کی آواز آئی۔

اس نے دھیرے سے مجھ سے پوچھا "دیکھو گے ؟"

میرے انکار پر وہ مجھے ٹھہرنے کا اشارہ کر کے دروازہ کی طرف چلا گیا اور سوراخ سے دیکھنے لگا۔

کچھ دیر بعد ہنستا ہوا لوٹا تو میں نے پوچھا۔

کیا کر رہے ہیں؟

دو دانت اور توڑا ہے۔ اب ناخنوں میں کیل ٹھونک کر اسے گوشت سے علٰحدہ کریں گے۔

کیوں؟

اس لئے کہ زمین نہ کھودنے پائے۔

لیکن وہ چیختا کیوں نہیں؟

وہ ہنس پڑا۔ چیخے گا تو اور درد ہو گا۔

کیوں؟

پہلی بار جب اس کے دانت توڑے جا رہے تھے تو بھی یہ خاموش کھڑا مسکرا رہا تھا۔ جب اس سے منہ کھولنے کو کہا گیا تو سب منتظر تھے کہ اب یہ اپنے دانت جکڑ لے گا اور سخت اذیتوں کے بعد بھی نہ کھولے گا۔ جب اس کے دانت توڑے جانے لگے تو سب مشتاق تھے کہ اب چیخے گا۔ گالیاں دے کر فریاد کرے گا۔ آخر آفیسر نے جھنجھلا کر زنبورہ اس کی حلق میں گھسیٹر دیا "منہ بند کر"۔ لیکن وہ اپنے قدموں میں تھوک کر پھر مسکرانے لگا۔ چیختے کیوں نہیں حرامزادے ــــ چیخو

پھر ــــ اس کے حلق میں انگارے ڈال دیئے۔ تمام حلق اور زبان میں اسی وقت سے چھالے پڑے ہوئے ہیں۔ اب چیخے گا تو تازہ خون ابلنے لگے گا۔

تو کیا اس کے ہاتھ پیر باندھ لئے ہوں گے۔

کیوں ــــ نہیں تو!!

کیا کر رہا ہے؟

مسکرا رہا ہے۔ چلو دیکھو اگر اس وقت بھی تم اس کی آنکھوں میں دیکھ سکے تو سو روپے دوں گا۔

جب وہ یہاں لایا گیا تھا تو بھی مسکرا رہا تھا۔ اس کے خلاف ہزاروں خطوط آئے تھے۔ اتنے خطوط اب تک کسی کے لئے نہیں آئے جس میں سب سے طویل خط اس کے والدین کا تھا۔ اور سب میں یہی لکھا تھا کہ وہ دراصل بچپن سے ہی اپنی یادداشت کھو بیٹھا ہے اور ہر ایک سے اس طرح ملتا ہے جیسے پہلی اور آخری بار مل رہا ہو۔ بالکل رسمی طور پر۔ اس کی روشنی میں جب

ماہرین نفسیات بلائے گئے تو انھوں نے متفقہ فیصلہ کیا کہ اسے اس جگہ لے جاؤ جہاں اس نے اپنی یادداشت ضایع کی تھی۔ جب اسے اس کے گھر لے گئے تو تمام خاندان میں کہرام مچ گیا۔ عورتیں سینہ کوٹ کوٹ کر رو پڑیں اور مرد آنکھوں پر رومال رکھے سسکیاں لینے لگے۔ اس کے بھائی دوڑ کر اس کی ٹانگوں اور کمر سے لپٹ گئے لیکن یہ کم بخت اسی طرح چپ چاپ کھڑا مسکراتا رہا۔!

ماہرین سوال کرتے۔

یہ کون ہے ؟

باپ !

کس کا ــــ تمھارا ؟

نہیں اس کا۔

یہ کیا ہے ؟

گھر۔

کس کا ؟

پتہ نہیں ! اور یہ کیا چیز ہے ؟ باغ۔ یہ ؟ کنواں۔ یہ کیا ہے ؟ مسجد۔ اور یہ سب ؟ کھیت۔ یہ کس کے ہیں ؟ معلوم نہیں۔ کیا تمھیں یقین ہے ؟ ہاں۔ اور یہ تصویر کس کی ہے ؟ پتہ نہیں۔ تب ماہرین نفسیات اسے پھر سون ندی کے پار لے گئے اور اسی مخصوص ٹرین سے واپس ہوئے۔ ان کا قیاس ہے کہ اس وقت بالکل وہی منظر تھا جو اس نے دیکھا تھا لیکن یہ شخص اسی طرح مسکراتا رہا اور خاموش .....

اندر سے پھر گرج دار آواز آئی۔ اس نے دوڑ کر دروازہ سے آنکھ لگا دی اور میں امرود کے درخت کے نیچے کھڑا ہو گیا۔ چڑیاں پھر واپس آ گئی تھیں۔

وہ آدمی بہت دیر تک دروازہ سے آنکھ لگائے کھڑا رہا۔ کبھی مسکرانے لگتا اور کبھی جھنجھلا کے منھ بنانے لگتا۔ آخر اکتا کر ہٹ آیا۔

کیا کر رہے تھے ؟ میں نے یوں ہی پوچھا۔

ارے یہ سالا ابھی کچھ نہیں جانتا۔ ناخن تو خیر اکھیڑ لیے ہیں اور دوسرا آدمی انگلیوں میں کیل پھنسا کر اسے دبائے ہوئے ہے۔ لیکن افسر الو کا پٹھا ہے۔ ماچس جلا کر اس کے منھ کے چھالوں کو داغ رہا ہے جو اس کی سانس سے ہی بجھ جاتی ہے۔ اس سے تو اچھا تھا کہ وہ ماچس

کی جلتی ہوئی تیلی ناک میں گھسیڑ دیتا یا کم از کم نیچے کے تمام دانت ہی توڑ دیئے ہوتے۔

دروازہ زور سے کھلا۔ تو یہ شخص جلدی سے آگے بڑھ گیا۔ افسر اور دوسرا آدمی کمرہ سے نکل کر جلدی سے ایک طرف چلے گئے۔ میں نے کھلے دروازہ سے اندر جھانک کر دیکھا تو وہ ایک خون آلود ہاتھ ٹھوڑی کے نیچے رکھے اکڑوں بیٹھا ہوا زمین کی طرف دیکھ رہا تھا۔ زمین پر گرے ہوئے خون کے لختوں کے آس پاس بہت سی چیونٹیاں رینگ رہی تھیں۔ پاس ہی ایک چھپکلی کی دم پھڑک رہی تھی اور وہ بیٹھا مسکرا رہا تھا۔

میں نے پلٹ کر دیکھا تو میرا ساتھی امرود کے پاس کھڑا مجھے اشارے کر رہا تھا۔

دیکھ لیا نا؟

ہوں!

اچھا۔ ہاں میں ایک ضروری بات بتانا بھول ہی گیا۔ جب یہ شخص اپنی ماں کے پیٹ میں تھا تو اس کی ماں نے خواب میں دیکھا تھا کہ اس کے پیٹ میں کوئی سانپ ہے۔

سانپ ــــ؟ میں نے حیرت سے اپنے ساتھی کے پوپلے منہ کی طرف دیکھا۔ ☐

رو میں ہے رخشِ عمر

لگتا ہے جسم کے اندر ہی اندر بہت تیزی سے کچھ پک رہا ہو اور رس رس کر کہیں دفن ہوتا جا رہا ہو۔ سامنے سے تو کھجور اور تاڑ کے درختوں کا تنا بھی نظر آجاتا ہے۔ مکانوں کی بنیاد تک مسجد امام باڑے کے مٹیالے سفید نقوش

آس پاس تیز سرخ دھوپ پھیل چکی تھی۔ اس نے نیم کی موٹی شاخ اپنی ادھوری لنجی ہتھیلیوں کی ڈھیلی گرفت سے آزاد کر دی اور ٹخنوں سے دور کھسکانے لگا۔ پھر پاجامہ کا ازار بند کھول کر جھک جھک کر جھانکنے لگا۔ ایک پھول اٹھایا اور پاجامہ کے اندر ہاتھ ڈال کر اسے گھمانے لگا۔

سامنے آم کے درخت پر کوئی بڑا سا پرندہ آکر بیٹھ گیا تھا۔ کئی آم بہت شور کرتے ہوئے نیچے ٹپک پڑے۔ اس کے گھٹنوں میں عجیب سا درد ہونے لگا۔ آنکھوں میں کھنچاؤ بھی پیدا ہو گیا تھا۔

اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھنچ گئی۔ جو بڑھی ہوئی غلیظ ادھوری داڑھی میں ضایع ہو گئی۔ اس نے پیروں کی طرف دیکھا۔ جہاں جہاں انگلیاں ہونی چاہیے تھیں وہاں کی زمین نم ہو چکی تھی اور ہلکے ہلکے پانچ خاکے ابھر آئے تھے۔ پھر اس نے اپنی ہتھیلیوں کے نیچے ادھوری انگلیوں کو دیکھا۔ موٹی، ورم زدہ، غلیظ اور پھٹی ہوئی ادھوری ہتھیلیوں کے نیچے۔ دوسرے ہاتھ کی ادھوری ہتھیلی سے انھیں چھونے لگا لیکن کچھ بھی نہ محسوس ہو سکا۔

کیا حرج ہے۔ ہماری ساری تاریخ ہتھیلیوں میں آگئی ہے۔ اتنا طول طویل عرصہ۔ اتنا ہنگامہ۔ سمٹ کر دو لنجی ہتھیلیوں کے ادھورے پن میں جمع ہو گیا ہے۔ کہیں یہ اس زبردستی کی

نیم کی شاخ کا تو اثر نہیں ہے ہا ـــــ بیروں کے نیچے سخت آسمان اوپر زمین ۔ اس نے کراہ کر لمبی سی سانس لی اور ابھری ہوئی شکستہ قبروں کے درمیان نظر دوڑانے لگا ۔ نہ جانے یہ آنکھ کمبخت کب ادھوری ہو گی ۔

کیا جب ہم اپنے کو محسوس کرنے کی حس ضایع کر دیں گے تو بھی یہی عالم ہوگا یا ہمارے وجود کے ہاتھوں میں بھی کوئی نیم کی وزنی ، کھردری ، کڑوی شاخ زبردستی تھما دی گئی ہے ۔ شکستہ دیوار و در ، اکھڑے ہوئے نقوش اور چہار طرف اگی ہوئی خودرو جھاڑیاں ۔ ہم کب تک ان حقائق سے چشم پوشی کر کے زندہ رہنے ، خوش رہنے اور پر امنگ رہنے کی اداکاری کر سکتے ہیں ۔

گاؤں پہلے کتنی نزدیک تھا ۔ ایک قدم پر مسجد ، دوسرے پر امام باڑہ طہارت کا فرضی سکون ۔ ہماری وابستگی اور قید و بند کے لئے کیسے کیسے پیارے نام تلاش کر لئے گئے تھے ۔

اس نے پھر پائجامہ کے اندر ہاتھ ڈالا اور ادھوری ہتھیلیوں سے اپنی ران کھجلانے لگا ۔ آنکھیں اسی طرح سرخ ویران راستہ کو دیکھتی رہیں ۔

گاؤں کے سارے لوگ ایک ایک کر کے غائب ہوتے جا رہے ہیں اور جلوس اپنی شوکت کھوتا جا رہا ہے ۔ مشعلوں کی تیز جگمگاہٹ کی جگہ اب اکا دکا روشنی کی لکیریں ہی ابھرتی ہیں اور چمک کر غائب ہو جاتی ہیں ۔ نقاروں کی آواز کتنی ٹھہر ٹھہر کر آتی ہے ۔ ہر شخص چپ چاپ خاموش گذرتا رہتا ہے اور دیواروں پر سائے لرز لرز کر ادھورے ٹکڑے میں تقسیم ہو جاتے ہیں ۔ اس طرف اب کوئی نہیں آتا ۔

کھنڈر کی محرابوں میں ہوا بول رہی تھی اور سرخ مٹی کا بگولہ چکر لگا رہا تھا ۔ ہی ہی ہی ۔ اس کی خشک مکروہ ہنسی خانقاہ کی قبروں پر دوڑی تو وہ مریل کتا جو ایک پرانی قبر کے ایک گوشہ میں چھپا بیٹھا تھا چونک پڑا اور بہت سے سیاہ رنگ کے مہین مہین پسو اس کے خشک لکڑی ایسے جسم سے اڑ کر فضا میں چکرانے لگے ۔ اس نے کئی بار اپنے جسم کو زاویۂ معکوس میں لاکر اپنی دم کو چبانا چاہا لیکن ادھوری ننگی دم اس کی گرفت سے دور ہی رہی ۔ اس نے کھڑے ہو کر پوری قوت سے اپنے جسم کو ہلایا تو اذیت کی سرد سلاخ آنکھوں میں تیر گئی بہت سے پسو جگہ جگہ سے پھٹی ہوئی جلد سے اٹھے ـــــ فضا میں لہرائے ۔ کتا رینگ کر قبر سے باہر آگیا اور پسو اس بھیگے ہوئے خاکہ پر ٹوٹ پڑے جو کتے کے لیٹنے سے بن گیا تھا ۔ کتا

اپنی ادھوری ٹانگوں سے رینگتا ہوا اس کے قریب آیا تو وہ پائجامہ کھول کر جلدی جلدی گردن ہلانے لگا ــــ آؤ آؤ لنجے ــــ کوڑھی ــــ ادھورے ــــ تم پھر وہیں جاکر سوئے تھے، حرامزادے، جہاں تعزیہ دفن ہوتا ہے۔ نجس ناپاک۔ تمھیں کتنی بار سمجھایا گیا تھا کہ میرے پاس نہ آؤ۔ میرے عمامہ اور قبا کو نہ سونگھو لیکن تم نہیں مانے تھے۔ لو اب بھگتو بیٹا۔ ہی ہی ہی تمہارے پیروں کی انگلیوں سے پہلے پانی رسنے لگا تھا۔ پھر گوشت نے ٹیڑھے ہوتے ہوتے ناخنوں سے اپنا رشتہ جلد از جلد توڑ لیا۔ تم پھر بھی میرے پاس آتے رہے۔ اور تمہارا جسم جگہ جگہ سے پھٹنے لگا۔ اس میں سے پانی اور مواد رس رس کر بہتا رہا۔ پھر تمہاری دم بھی جھڑ گئی اور جسم کی دراڑوں میں پسو آ بسے۔ تم تو کوئی آئینہ بھی نہ چرا سکے تھے۔ ہی ہی ہی۔ ابے دیکھ! جب گاؤں والوں نے زبردستی یہ نیم کی موٹی شاخ میرے ہاتھ میں دی کہ اس سے جراثیم مرجاتے ہیں تو میں اپنے صندوقچے سے اپنا آئینہ بھی چرا لایا تھا اور یہ سرمہ کی شیشی بھی۔ ہی ہی ہی ....

جہاں وہ بیٹھا تھا وہاں کی زمین بالکل نم ہو چکی تھی۔ وہ کھسک کر اور آگے بڑھ گیا۔

ہی ہی ہی۔ یہ اب سوکھ گئی ہے۔ آؤ آؤ حرام زادے۔

کتا گھسٹتا ہوا اس کے پاس آگیا اور پائجامہ میں منھ ڈال کر اس کے زانو پر بیٹھ گیا اور اپنا نچلا دھڑ اس کے زانوؤں سے رگڑنے لگا اور زبان سے اس کے زانوؤں کا تمام اندرونی حصہ چاٹنے لگا۔ وہ ہنستا رہا ہی ہی ہی۔ اور اچک اچک کر کتے کے پچھلے جسم کو اپنی ران سے دبانے لگا۔ پھر اس کی ادھوری ہتھیلیاں تیزی سے کتے کے پچھلے حصہ کو سہلانے اور نرم جگہوں پر دباؤ ڈالنے لگیں۔ پھر وہ کتے کی دم کے نچلے حصوں کو اپنی ادھوری ہتھیلیوں سے تیزی سے اچک اچک کر رگڑنے لگا ــــ ہی ہی ہی۔ سالے تیرے دانت بھی جھڑ گئے بڑا اچھا ہوا۔ ورنہ کاٹ لے جاتا ــــ ہی ہی ہی۔ کتا لاپرواہی سے اس کی رانوں کے نچلے حصہ کو اپنی کھردری ادھوری زبان سے چاٹ رہا تھا۔ آم کی اونچی شاخ پر ایک چیل زور سے چیخی تو وہ جھنجھلا گیا۔ آؤ آؤ حرام زادی تم بھی آؤ ازاربند کھلا ہے۔ نوچ لو سب کچھ مجھے کیا قبر میں لے جانا ہے ــــ؟

اس نے کتے کو دھکا دے دیا۔ کتا رینگتا ہوا قبروں کے درمیان چلا گیا۔ اس نے ٹٹول کر آئینہ نکالا اور بغیر انگلیوں کی ہتھیلی میں جکڑ کر چہرہ کے قریب لایا ــــ

ادھوری داڑھی رستے ہوئے پانی سے بھیگی ہوئی تھی۔ کنپٹیوں سے بہتے پانی کی دھار

کا باقاعدہ نشان بنا تھا۔ ماتھے اور رخسار کی جلد پر ابھرے ابھرے سرخ چکتے پڑے ہوئے تھے جن سے پانی نکل کر ایک بلبلہ کی شکل اختیار کرتا پھر جمع ہو کر آہستہ سے ڈھلک پڑتا لیکن چہرے کی دوسری دراڑیں انھیں فوراً اپنے میں جذب کر لیتیں۔ پھر سب جمع ہو کر سانپ کی طرح رینگتے۔ داڑھی کے بہت کم بالوں سے گذر کر گردن کے نشیب میں آتے اور وہاں سے پھیل جاتے تھے۔ اس نے دوسری ہتھیلی سے پانی کے ایک قطرہ کو روکا اور مسل کر ناک کے پاس لے گیا تو ناک کی نوک سے دوسرا قطرہ بھی اس سے آملا۔ عجیب کھٹی سی بدبو اس کی ناک میں گئی تو وہ جھک کر اپنے پائجامہ میں جھانکنے لگا پھر چہرہ کی دراڑوں سے رستے ہوئے پانی کو دبا دبا کر باہر نکالنے لگا۔ پانی نکلنے سے بیٹھی ہوئی ناک اور بیٹھ گئی اور منھ کا زاویہ کچھ اور ٹیڑھا ہو گیا۔ اندر دھنسی ہوئی آنکھ سے بھی جلد کا سرخ پھٹا ہوا ابھار نظر آرہا تھا۔

اس نے گریبان میں جھانک کر دیکھا تو بازو بھی گلتے ہوئے نظر آئے۔ اس نے سانس لے کر آئینہ چھپا لیا۔

عود و عنبر کو چھوڑ کر لوبان اور دھوپ تک آتے آتے ہمیں کتنے جیحون اور کتنی گنگاؤں کا سامنا کرنا پڑا تھا۔

ہم مشہد مقدس کے مجاور کفار کو دین مبیں کی تعلیم دینے کے چکر میں کہاں سے کہاں بھٹکتے پھرے۔ ٹھٹھ۔ بھٹنڈا۔ کمپالی۔ بہرائچ، کچھوچھہ اور گیا۔ مندر توڑ توڑ کر ہم نے کتنے بت خانے سجائے لیکن انھیں یا غ لگانا کبھی نہ آیا — اب اگر ہم سے گاؤں چھوٹ گیا تو کیا ضرور کہ ہم اداس بھی ہوں۔ وہ کیا سامنے سب کچھ نظر آرہا ہے ..... دل چاہتا ہے کہ چیل کی طرح زور سے چیخوں بے پناہ چیخ کہ اب مجھے سب سے گھن آتی ہے۔ تمام وابستگیوں اور تعلقات سے۔ اپنے سے بھی۔ اس کتے سے بھی۔ مخدوم غلیظ۔ یا کیا پتہ وہ چیخ بھی ادھوری رہ جائے۔ تو؟

وہ گھسٹتا ہوا قبر تک آیا اور بیٹھ کر بے ہنگم انداز میں رونے لگا — اپنی ادھوری ہتھیلیوں سے ادھر ادھر بکھرے پھول چن چن کر اس قبر پر انڈیلنے لگا — لو — اب اسی قبر پر بسیرا لو۔ ایک لامتناہی سکوت۔ کاش زندگی اسی ایک بے معنی بوجھل سکوت کی نذر ہو جائے یا یہ لمحہ محیط ہو جاتے اور ادھوری رستی ہوئی حیات سمٹ کر اسی میں سما جاتے۔ اذیت کا یہ ادھورا مجذوم لمحہ۔ ساری زندگی ایک ادھوری بے جان چٹان۔ اور باقی ماندہ ادھورا وجود تدریجاً رستا ہوا۔ آہستہ آہستہ مائل بہ زوال۔ پچھلے تمام علائق سے کٹا ہوا۔ رشتوں کا کیا۔ انھیں کوئی نام

دے دو مکہ۔ مدینہ۔ ماں۔ باپ۔ بھائی۔ بہن۔ کوثر۔ ثریا۔ زیبا۔ فیروزہ اور بلو۔ سفر کی تمام ادھوری نشانیاں ذہن کے ادھورے محراب وطاق میں سیاہ ماتمی لباس پہنے رہیں گی۔ اور سرخ ریت اڑا اڑ کر زبان کو کرکرا بناتی رہے گی۔ ہائے کربلا۔ وائے تم۔ دیوار گل مہرے اپنے آپ تک، اپنے سے دریا طوفان سیلاب لو، اور آندھی تک کون کب تک ادھوری نشانیاں فرض کرکے ان کا ماتم کرسکتا ہے، لیکن رشتوں کے گرد سیاہ لکیریں بھی تو نہیں کھینچ سکتا۔ خواہ وہ کتنے ہی ادھورے اور بے نام ہوں۔ کیا جانے کل کا مورخ قنوطی کہنے لگے تو؟

گاؤں کی سمت سے اچانک ڈھول تاشا، نقارہ اور جھانجھ کی آوازیں آنے لگیں۔ طویل برسوں سے یہاں قبرستان میں قید ہوں۔ جلا وطنی کی سزا کیسی عجیب ہے۔ کتنی بار یہ آوازیں ادھورے کان کے پردے پھاڑتی ہوئی گزر گئی ہیں۔ اب تو تمام بچیاں جوان ہوگئی ہوں گی۔ اس نے سسکاری لی۔ اگر کوثر نے شہر جاکر اپنا حمل ضایع نہ کرایا ہوتا تو آج میرا بچہ / بچی بھی جوان ہوتی۔ اس نے ایک اور طویل سسکاری لی۔ کم بختوں نے میری تمام جائداد پر قبضہ کرلیا ہوگا۔ کھیت۔ باغات مکان اور تمام اثاثہ مال غنیمت کی طرح لٹ گیا ہوگا۔ عراق کی تسبیح۔ مکہ کی جانماز۔ فیروزہ۔ ثریا۔ زیبا اور کوثر۔ کاش مجھے گاؤں سے اتنی نزدیک نہ لا پھینکا ہوتا۔ کم از کم یہ سوکھے درخت اور قبریں تو یہاں سے ہٹا دیتے یا مسجد کے مینارے گرا دیئے ہوتے۔ اس نے اپنے کو ایک شکستہ قبر میں چھپا لیا۔ عمامہ قبا قرات اور کتابیں ہم پر جذام کے عذاب کی طرح نازل کر دی گئی ہیں۔ چیخو اور زور سے چیخو اور زوروں سے ڈھول بجاؤ۔ تاشا نقارہ اور جھانجھ۔ تاک دھنا دھن۔ تاک دھنا دھن۔ پھر اسی تاریک قبر میں اپنے ادھورے وجود کو لئے اچکتے رہو۔ تاک دھنا دھن۔ پیاس اور تپش سے پراگندہ ہوکر بے معنی الفاظ میں چیختے رہو۔ بے نام خواہشات کا سوالیہ نشان بنائے سرجو۔ ایسے میں کوئی جیم سے آجائے تو اچھا ہے۔ امام باڑہ کی سیاہ زنجیروں سے سیاہی چھڑا کر اپنی سرخ پھٹی ہوئی جلد پر مل لو۔ سیاہ ماتمی لباس پہن کر سروں پر کاغذ کی رنگ برنگی ادھوری دھجیاں جمع کرکے گھسٹتے ہوئے چلتے چلو۔ بانس کی کھپچی میں توپی دنگ پھنسا کر زمین پر قلابازیاں کھاؤ، سروں پر بھوسہ ڈالے تاریک تہ خانوں میں کھڑے انتظار کرو کہ کوئی تمہارے تدریجاً گلتے ہوئے جسم پر آکر پٹیاں باندھ جائے۔ پھر سایوں کی طرح تمام رات دیواروں پر ادھورے پن سے کانپا کرو۔ پھر یہاں میرے پاس آکر گڑگڑاؤ تاکہ تم پر خیر و برکت کی دعائیں کروں۔

ڈھول کی آواز نزدیک آتی جارہی تھی۔ پھر سیاہ لباس والوں کا جلوس سامنے سے رینگتا

ہوا نظر آیا۔ وہ جلدی سے اچک کر تبرے باہر نکل آیا پھر گریبان پھاڑ کر جسم کے ابھرے ہوئے چھلکوں کو دبا دبا کر پانی نکالنے لگا۔ جلوس والوں کی آنکھیں غیظ و غضب سے باہر نکلی ہوئی تھیں اور منہ سے پھین بہہ رہا تھا۔ وہ سب چیختے ہوئے اس کے اور قریب آگئے۔ اور قریب۔ سیاہ لباس والی عورتیں دائرہ بنا کر اسی کے گرد بیٹھ گئیں اور جلوس والے اسے گھورنے لگے۔ باجے رک گئے تھے۔

مانگو دعا ـــ دعا مانگو ـــ ورنہ ......

وہ سمٹا ہوا کانپتا رہا اور پانی رس رس کر زمین نم کرتا رہا۔

اے کوڑھی۔ ہم کہتے ہیں دعا مانگ۔ مانگ نہیں تو ـــ گاؤں کے مرد ایک ایک کر کے غائب ہوتے جا رہے ہیں۔ مانگ دعا۔

دائرہ میں بیٹھی ہوئی عورتیں اپنے پتھرائے ہوئے ادھورے جسم پر دو ہتڑ مار کر چلا چلا کر رونے لگیں۔

اس کی سہمی ہوئی آنکھیں اٹھیں اور ان عورتوں کے سامنے پتھر کے ڈھیر پر جم گئیں۔

مانگو دعا۔ خدا کے لئے دعا مانگ لو۔ مان جاؤ۔

وہ سکڑا ہوا اپنی جگہ بیٹھا رہا۔ پھر سب کے چہروں کو تکنے لگا ـــ ا ـــ مکہ۔ مدینہ۔ زیبا۔ کوثر۔ ثریا اور فیروزہ۔ سب کی جلد سے زرد رستا ہوا پانی نکل رہا ہے اور اندر ہی اندر کھدبد کھدبد کچھ پک رہا ہے۔

مانگ لو نا۔ مانگ لو دعا۔ خدا کے لئے مانگ لو۔

وہ چپ انھیں دیکھتا رہا۔

وہ سب چیخ چیخ کر رونے لگیں۔ وہ گھٹنوں میں سر چھپا کر کانپتا رہا۔

وہ سب تھکے قدموں سے روتے اور سسکیاں لیتے ہوئے واپس ہونے لگے۔ اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ ایک وزنی خشک کھردری نیم کی لکڑی اس کے پیروں کے پاس پڑی تھی۔ دور سے کتا اپنی دو انچ کی ادھوری دم دبائے آنکھیں بند کئے بھاگا آ رہا تھا۔ وہ ہنس پڑا۔ آؤ آؤ حرامزادے، نجس ناپاک۔ تمھاری بھی تمام جائداد غصب کر لی گئی ہے۔ بٹ کر آگئے ہو نا؟

کتے کی آنکھیں خوف اور دہشت سے پھیلی ہوئی تھیں۔ وہ اس کے سامنے آکر بیٹھ گیا۔ اس نے ازار بند کھولا۔ کتے نے ہلکے سے آنکھیں کھول کر دیکھا اور پھر سر جھکا کر ہانپنے لگا۔ اس کے -

ادھورے منہ میں سرخ سرخ دھول بھری ہوئی تھی۔ کتے نے ایک بار اس کی طرف دیکھا۔ غور سے دیکھا۔ دیر تک دیکھا کیا۔ پھر منہ پھیلا پھیلا کر گہری گہری سانس لینے لگا۔ اس دوران اس کا گلپھڑا رہ رہ کر پھولتا پچکتا رہا۔ وہ بڑی غور سے ایک ٹک کتے کو گھور رہا تھا اور دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ کتے نے دو بار زور سے ہچکیاں لیں پھر دیر تک منہ پھیلائے رہ گیا۔ کتے کی اینٹھی ہوئی خشک ادھوری زبان اوپر اٹھ گئی تھی۔ آنکھیں اندر دھنسی جا رہی تھیں۔ وہ بے چینی سے نیچے کی نم زمین پر ادھورے پنجے مارنے لگا۔ زمین پر موٹی موٹی کھرونچیں پڑتی رہیں۔ پھر اچانک ہی اس کی تمام حرکت ختم ہو گئی اور اندر سے ابل ابل کر تمام چیزیں باہر آنے لگیں۔ زرد زرد پانی کے ساتھ گوشت کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے۔ پھر آنت کا ایک بڑا سا پھولا ہوا حصہ، زرد لعاب میں لتھڑی ہوئی آنت نکل کر اس کے جبڑوں میں پھنس گئی۔ کتے نے پھر ایک بار اپنی ادھوری آنکھ کھولی ـــــ زبان سے اس پھولی ہوئی آنت کو باہر نکال دینے کی کوشش کی اور لمبائی میں لیٹ گیا۔

وہ خاموش ایک ٹک کتے کو گھورتا رہا۔ نیچے کی زمین نم ہوتی جا رہی تھی۔ مکمل عدم۔ لا = لا۔ حیات کا لطیف ترلمحہ وہ پتھرایا ہوا سا بیٹھا رہا۔ پھر منہ پھیلا پھیلا کر کانپنے لگا۔

گل مہر۔ گل مہر ہماری خواہشات کا دوسرا نام۔

ذہن کے دریچوں میں بکھری ہوئی نالندہ، مگدھ اور کپل وستو۔ ہر اگلے قدم پر زرد غلیظ پانی کا لجلجا جوہڑ موجود تھا۔ وہ چپ چاپ گھسٹتا ہوا آس پاس کی قبروں سے مرجھائے پھول جمع کر کے نم ادھورے دامن میں جمع کرتا رہا۔

رب اے رب۔ انھیں اپنی بے پناہ نعمتوں سے نواز۔ وحشت ناک سناٹا سانسوں میں گھل کر اسے مسموم بنا رہا ہے۔ کٹ کٹ۔ یہ سب کیا بکواس ہے؟

یہ تھی جناب زندگی کی پہلی محبت۔ کیسی عجیب۔ نہ کبھی گفتگو، نہ اظہار، نہ وعدے، نہ رفاقت، نہ۔ نہ۔ کچھ بھی تو نہیں۔ دراصل یہ بھی میرا OBSESSION تھا۔

وہ تو سدا کی بے حس، ٹھس، بزدل، مکار اور بنت الوقت تھی ـــــ کون مجھ سے کہتا کہ جب تھک جایا کرو تو میرے پاس آجایا کرو۔ میں ادھورے پن کی وجہ سے یہ کبھی نہ کہہ سکا کہ اگر تمھاری مکمل توجہ میری طرف نہیں ہے تو مجھے بقیہ توجہ کے فضلہ کی بھی ضرورت نہیں کہ دل کا ایک حصہ تو ایسا رہ ہی جاتا ہے جہاں تک کبھی کوئی نہیں پہنچتا ـــــ کبھی نہیں۔ اور لوگ یوں گذر جاتے

ہیں۔ جیسے مفتوحہ شہر کی سنسان سڑکوں سے فاتح فوج گذرے اور بعد میں ہیبت ناک سناٹا چھایا رہے، چھایا ہی رہے اور بہت سی سہمی ہوئی آنکھیں دروازہ کی جھریوں سے ان گذرنے والوں کو حسرت اور بے بسی سے دور تک دیکھا کریں۔

کاش فیروزہ کو بھی آئینہ چرا لینے کا وہ موقع ملا ہو یا وہ اتنی بزدل نہ ہوتی کہ اپنی پھٹی ہوئی مجذوم جلد بھی نہ دیکھ سکتی (کیسے مہیب غار ابھر آئے تھے) تو وہ جان لیتی کہ رات کا عذاب اور اشیار کی طرح چہرے بھی مسخ کر دیتا ہے۔

اب تو وہ گھناؤنی حد تک قابل نفرت مکروہ اور غلیظ لگتی ہے۔ بالکل اس ادھورے جسم کے رستے ہوئے زرد پانی کی طرح۔ میرے ادھورے ہاتھ میں زبردستی خشک نیم کی کھردری وزنی شاخ دے دی گئی ہے تاکہ جراثیم پھیلنے نہ پائیں۔ اور میں اپنی غنودہ آنکھوں کو چھپائے ذات کی جانب خاموش واپسی کے خواب دیکھ رہا ہوں.....

کل تک تو سارا گاؤں۔ تمام سب کچھ بس چار قدم پر تھا اور آج دوسروں کو خوف ہے کہ کہیں میں واپس آکر اپنی زمینوں پر لہلہاتی کھیتیوں کا مطالبہ نہ کر بیٹھوں اور اپنا لٹا ہوا اثاثہ خوں بہا کے طور پر ہی سہی نہ مانگ لوں (ہشت۔ ہشت۔ سب بکواس)۔

وہ سب جلوس والے اب کسی اندھیرے امام باڑہ میں چپ چاپ سر جھکائے بیٹھے ہوں گے۔ ان کے بڑے بڑے سائے ایک ٹک دیواروں سے انھیں گھور رہے ہوں گے۔ پھر وہ اچانک یوں ہی بھاگ کھڑے ہوں گے۔ ان کے نیچے کی زمین زرد لسلسے پانی سے نم ہو جائے گی۔ اور انگلیوں کی جگہ زمین خالی رہے گی۔ پھر ان میں سے کچھ لوگ اچانک ہی غائب ہو جائیں گے۔ ہی۔ ہی۔ ہی۔ اس نے نیم کی شاخ اپنے ٹخنوں سے دور کھسکا دی اور پتھروں کو پھلانگ کر گھسٹتا ہوا کتے کے پھیلے ہوئے جسم کے قریب آیا تو مہین مہین پسو اڑنے لگے۔ وہ اپنی خشک ادھوری رانوں کو اپنی ادھوری ہتھیلیوں سے کھجر کھجر کھجانے لگا۔ بہتے ہوئے زرد لسلسے پانی سے اس کا تمام چہرہ اور جسم بھیگتا جا رہا تھا۔ ہی۔ ہی۔ ہی۔ مکروہ سی ہنسی اس کے ادھورے جسم کی دراڑوں سے دانت نکوسے جھانکنے لگی۔ وہ پالتی مار کر بیٹھ گیا اور کتے کے منہ سے نکلے ہوئے زرد لعاب سے اپنی ہتھیلیوں کو مس کر کے اپنے تمام جسم پر ملنے لگا۔ جسم کی دراڑیں پھیلتی جا رہی تھیں اور پانی تیزی سے رسنے لگا تھا۔ ہی۔ ہی۔ ہی۔ اس نے پھولی ہوئی آنت کے ٹکڑے کو اپنی ادھوری ننھی ہتھیلیوں کی مدد سے کتے کے پھیلے ہوئے جبڑے سے کھینچ لینا چاہا۔ لیکن وہ بار بار پھسل جاتی —— □

قولنج

دروازہ کھلتا ہے۔

دروازہ بند ہوتا ہے۔

بائیں جانب بالکل اندھیرا تھا لیکن داہنی جانب تیز چمک اٹھ رہی تھی۔ تمام داخلی عناصر نے اپنا کام بند کر دیا اور چاروں طرف ایک دہشتناک سناٹا چھانے لگا۔ اس کے ہونٹوں سے احتجاج میں تیز کریہہ چیخ نکلی، منجمد گرد کے ذروں سے ٹکرائی اور گر کر رہ گئی۔ داہنا حصہ بالکل انگارہ ہو چکا تھا۔ چڑیاں آنے والی قیامت خیزیوں کو روکنے کی پوری کوشش کر رہی تھیں۔ سارا کمرہ ان کی پے در پے چیخوں سے پھیلتا جا رہا تھا۔ کمرے کی پوری لمبائی گردن سے کمر تک ہانپ رہی تھی اور ہوا اپنا دباؤ بڑھاتی جا رہی تھی۔ چمک ایک لمحہ ماند پڑتی تو سانس باہر نکلنے کی کوشش کرتی لیکن مڑے ہوئے سخت پنجے اسے راستے ہی میں گرفتار کر لیتے۔ گرد کے کچھ ذرے اس تیز روشنی میں چمکے تو چڑیوں نے اور شور مچایا لیکن ان کی مدافعت کی تمام قوتیں ناکام ہوتی رہتی ہیں۔ وہ مردہ ہو کر ایک ایک کر کے گرنے لگیں۔

کڑوا دھواں سا کمرے میں بھر گیا۔ اس نے کھانسنا چاہا تو پنجوں نے زبردستی اس کا منھ بند کر دیا۔ سارا کمرہ کانپنے لگا۔ دیواروں سے پانی بہتا ہوا نیچے تک لکیر بنا رہا تھا۔ کوئی آواز باہر نہیں نکل رہی تھی۔ انگلیاں ٹیڑھی ہو کر ہتھیلیوں کے گوشت میں دھنس چکی تھیں۔ پہلی رگوں پر دباؤ پڑا تو چمک اور بڑھ گئی۔ سارا جبڑا پکے ہوئے پھوڑے کی طرح بھن رہا تھا۔ اس نے ایک بار پھر کوشش کی لیکن سانس باہر نہ آسکی۔ اس نے اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوششیں کی لیکن سارا

کمرہ چمک چکا۔ کراہتا رہا، ضیق النفس اس پر طاری رہا۔ کمرے کے اندرونی حصوں میں وحشی جانور دہشت میں چاروں طرف سر ٹکرا رہے تھے۔ کمرہ کبھی سکڑ جاتا کبھی پھیلنے لگتا۔ چڑیوں نے گھبرا کر ادھر ادھر ہٹنا چاہا۔ راستہ تلاش کرنا چاہا لیکن وہ صرف ہچکی لے کر رہ جاتیں۔ دہشت میں ان کے پنکھ پھڑ پھڑا کر رہ جاتے۔ پھر وہ نیم مردہ ہو کر کانپنے لگتیں۔ وہ اپنے کو بہلانے کے لئے یاد کرنے لگا۔ فاران کی چوٹی۔ غار حرا۔ حلب اور انطاکیہ۔ الحمرا۔ لیکن سارا قصر لرزنے لگا۔ مسجد اقصیٰ تک آتے آتے اس کی مدافعت کی تمام قوتیں جواب دے گئیں۔ وہ یاس وحسرت سے چند لمحوں کے فاصلے کو دیکھتا رہا۔ اس نے چاہا کہ گردن گھما کر اپنے گردوپیش پر نظر ڈالے لیکن دھواں چاروں طرف پھیل چکا تھا۔ ساری آوازیں اچانک نامانوس ہو گئی تھیں۔ اس نے بے بسی سے ہاتھ پیر پٹکے تو وحشی جانور تیزی سے اپنا سر ٹکرانے لگے۔ پھر اچانک چاروں طرف دہشتناک سناٹا چھا گیا۔ اس نے اس لمحے کو غنیمت جان کر اپنی گرفت میں لینا چاہا۔ بے حس انگلیاں اس پر اپنی گرفت رکھنے سے قاصر ہیں۔ وہ لمحہ فوراً ہی پھسل جاتا۔ کمرہ کسی پر اسرار دہشت سے پھر کانپنے لگا۔ خارجی عناصر نے باہر کھڑے ہو کر آنکھوں ہی آنکھوں میں کچھ فیصلہ کیا اور آخری اقدام کرنے کے لئے پوری قوت سے بڑھے۔

یہ ابھی اس حملے کے لئے قطعاً تیار نہ تھا۔ انگلیاں ابھی تک ہتھیلیوں میں پیوست تھیں اور اکڑی ہوئی گردن کوئی چیز اندر داخل کرنے سے انکار کر رہی تھی۔

تیز چمک جب کمرے سے گردن تک لپکی تو سارا کمرہ گھٹن میں اینٹھنے لگا۔ دیواریں تیزی سے پانی کا اخراج کرنے لگیں۔ سرخ لوہے کی دو انچ موٹی اور ایک فٹ لمبی سلاخ جب حرکت کرتی تو سارا کمرہ دائیں سے بائیں گھوم جاتا اور تمام چیزیں الٹ پلٹ ہو جاتیں گھٹن پھر بڑھ گئی۔ سانس۔ سانس۔ سانس۔ نرخروں پر گرفت بہت سخت ہوتی گئی۔ دروازہ بہت وزنی چٹان آپڑی۔ سارا کمرہ گھٹن میں اچھلنے لگا۔ داہنی طرف سلاخ تیزی سے اپنا راستہ بناتی ہوئی اپنا حجم بڑھاتی جا رہی تھی۔ سلاخ کمرے میں پھر گئی۔ اور تمام چیزیں ذرا سی بھی حرکت کرنے سے قاصر ہو کر منجمد ہو گئیں۔ سازش اس کی صبر کی طاقتوں کو، ارادوں کو اور امکانی قوت احتجاج کو سلا دینے کی پیہم کوشش میں مصروف رہی۔ چڑیاں انھیں روکنے کے لئے چونچیں کھولتیں لیکن بے دم ہو کر فوراً گر پڑتی تھیں۔ سینہ لمحہ بہ لمحہ اندر دھنستا جاتا تھا۔ لیکن سوچ جاری رہی....

میرے پاس ایک شکاری کتا تھا، ایک گھوڑا اور ایک جنگلی فاختہ جو نہ جانے کب اور

کہاں مجھ سے غائب ہو گئے۔ عرصہ سے میں ان کی تلاش میں ہوں۔ کئی لوگوں سے ان کے بارے میں دریافت کیا۔ دو ایک نے اس کتے کے بھونکنے اور اس گھوڑے کے ٹاپوں کی آواز سنی تھی۔ فاختہ کو بھی ابر کے پیچھے غائب ہوتے دیکھا تھا۔ پھر وہ خود ان کی بازیافتگی کے لئے اتنے ہی فکرمند ہو گئے جیسے انھوں نے ہی ان جانوروں کو کھو دیا ہو، وہ اب تک رہرؤں سے ان کے بارے میں دریافت کرتے ہیں اور تلاش میں مصروف ہیں۔ ان کے بال گرد سے اٹے ہوئے ہیں۔ جسم کی کھال جگہ جگہ سے پھٹ چکی ہے، آنکھیں بالکل اندر کو دھنس چکی ہیں۔ سرمئی غبار چاروں طرف سے چھا جاتا ہے اور چمک پھر بڑھنے لگتی ہے۔ سارا کمرہ دائیں بائیں ہوتا رہتا ہے۔ دھواں گہرا ہوتا جاتا ہے اور سلاخ پگھل کر پھیلنے لگتی ہے۔ وہ کچھ کہنا چاہتا ہے لیکن لفظ گولا بن کر اوپر اٹھتے ہی پھوٹ جاتے ہیں۔ وہ انھیں اپنی گرفت میں لینا چاہتا ہے لیکن وہ بہہ جاتے ہیں اور حلق میں تیز دانے . ے گھر دہم کر بیٹھ جاتے ہیں۔ وہ بائیں جانب ذرا سا جھٹکتا ہے تو سلاخ اپنا عمل تیز کر دیتی ہے۔ جسم ایک بھیگے ہوئے موٹے رسے سے جکڑ کر باندھ دیا گیا۔ سلاخ لمحہ بہ لمحہ وزنی ہوتی جا رہی تھی۔ کمر سے گردن تک کا راستہ پھیل چکا تھا۔ وہ ہونٹوں کو دانتوں میں جکڑ لیتا ہے۔ ساری دیواروں سے پانی بہنے لگتا ہے اور کمرہ کانپنے لگتا ہے۔ چڑیاں تھکن سے ہانپ رہی تھیں۔ نہ دھواں چھٹتا ہے، نہ موت آتی ہے۔

کمرہ اور دھواں ساتھ ساتھ پھیلنے لگتے ہیں۔ چمک لمحہ بھر کے لئے رکی تو چڑیوں نے ہونٹ سی لئے۔ وہ سلاخ کی ہٹائی ہوئی جگہ پر رینگتا رہا۔ ایک معینہ اور مقررہ راستے کی سمت۔ اس کی کہنیاں پھٹ چکی تھیں اور گھٹنے خون میں لت پت ہو گئے تھے۔ ٹھہر کر دم لینے کی کوئی جگہ نہ تھی۔ گھسٹتے رہنے کی اذیت کے سوا کوئی چارہ نہ رہا۔ چڑیوں کا وجود ہی ایک سہارا تھا یا پھر دروازہ کھلنے کا تصور۔ نہ دھواں چھٹتا ہے نہ موت آتی ہے۔ لوگ باہر دروازہ تھپتھپاتے ہیں۔ یہ انھیں جواب دینے پر آمادہ ہوتا ہے لیکن لفظ پھر ٹوٹ جاتے ہیں۔ چمک پھر بڑھتی ہے اور اسے اپنے شکنجہ میں لے لیتی ہے۔ چڑیاں دم بھر کے لئے منہ کھولتی ہیں، پھڑپھڑاتی ہیں اور بے دم ہو کر، گھٹ کر گر پڑتی ہیں۔ لوگ باہر سے چیختے ہیں، دروازہ توڑ دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس کی گردن اکڑی رہتی ہے، وہ بےبسی سے دیکھتا رہتا ہے۔ ہونٹ پھڑکتے ہیں اور آنکھیں تیزی سے گردش کرنے لگتی ہیں۔ یہ رہ رہ کر بولنا چاہتا ہے لیکن گھوڑوں کے دانے اس کے حلقوم کو سختی سے اپنے شانجوں میں جکڑ لیتے ہیں۔ وہ سلاخ کا سہارا لے کر بیٹھ جاتا ہے اور رونے لگتا ہے۔ لوگ بگڑتے ہیں

بولو، بولو۔ یہ حسرت سے انھیں دیکھتا رہتا ہے۔ دروازہ بند ہے۔

ہمارا تمام اثاثہ ہم سے چھین لیا گیا ہے۔ ہم بے سپر ہو چکے ہیں احتجاج کے تمام داخلی عناصر کسی سازش کے تحت شکست تسلیم کر چکے ہیں۔ وحشی جانور چاروں طرف ٹکریں مارتے ہیں۔ چڑیاں ہانپ ہانپ کر اپنے پنکھ ڈھیلے کر دیتی ہیں۔ سامنے سے کڑوے دھوئیں کی یلغار ہے۔ لفظ جو ہماری ملکیت تھے ہمارا ساتھ چھوڑ چکے ہیں۔ سب ہماری گھات میں بیٹھے ہیں۔ سب ہماری بے بسی کا مذاق اڑائیں گے، ساری خلا دھوئیں سے بھری ہے۔ چیخوں میں بھی اثر نہیں ہے۔ ہم کب تک اپنی ماؤں کی ننگی خون آلودہ چھاتیوں کو چھپا سکتے ہیں۔ سارا لہو ناف سے ابل رہا ہے۔

کوئی آ کر دروازہ کھول کیوں نہیں دیتا۔ دھوئیں سے سانس لینا دشوار ہے۔ دھواں گونجتا ہے اور عجیب عجیب ڈراؤنی شکلیں بنا کر اس کے حلقوم پر حملہ آور ہوتا ہے۔ وہ دونوں ہاتھوں سے دھوئیں کو ہٹانا چاہتا ہے اور چیخنے کی کوشش کرتا ہے۔ یہاں روشنی کب آئے گی۔ دھواں کب چھٹے گا۔ بتاؤ، کوئی بتا

لیکن دونوں ہاتھ اس کی وفاداری سے انکار کر دیتے ہیں۔ سلاخ پھیلتے پھیلتے سارے کمرے میں پھیل جاتی ہے۔ سازش جاری رہتی ہے اور تشنج اس کی گردن کو اپنے شکنجہ میں جکڑے رہتا ہے۔ پھیپھڑے کڑوے دھوئیں کے زہر سے بوجھل ہونے لگتے ہیں، سانس گھٹ کر اندر ہی رہ جاتی ہے۔ وہ سوچتا ہے کہ دھواں اور گہرا کیوں نہیں ہے؟ سلاخ ٹھنڈی نہ ہو جائے۔! پھر وہ زندہ چڑیوں کو اڑا دینے کی کوشش کرتا ہے۔ روشنی تو ہو، سانس تو ملے۔

وہ سلاخ کی بنائی ہوئی جگہ سے رینگتا ہوا نکلتا ہے، دروازے کی طرف بڑھتا ہے۔

میں جانتا ہوں کہ میں نے سورج کو طلوع ہونے میں کوئی مدد نہیں دی ہے لیکن میں سر تسلیم اس کی پذیرائی کے لئے مشرق کی سمت منہ کر کے کھڑا ہو جاتا ہوں۔

وہ کڑوے دھوئیں سے آنکھوں کو بند کئے دروازہ کھولنے کی کوشش میں مصروف ہے۔

صحرا

آخری تنہا درخت

بہت زیادہ سیاہ رات کا شکنجہ اسے بستر پر جکڑے ہوئے تھا۔ سامنے بہت اونچی محراب اور اس کے بعد ایک مدور فصیل، فصیل سے متصل لمحہ بہ لمحہ بڑھتے پھیلتے ہوئے بھیانک درخت کانٹے دار مہیب ــــ اور دو بہت چمکیلی سیاہ آنکھیں ــــ غلیظ اور ہیبت ناک۔

وہ ایک معمول کی طرح اسی مخصوص زاویہ پر دیکھنے پر مجبور تھا۔ آنکھیں پہلے پھیلیں، اوپر اٹھیں اور فضا میں گھل کر معدوم ہوگئیں ــــ اور اچانک بالکل بستر کے پاس مجسم ہونے لگیں۔

دل سرعت سے گہرائی کی سمت دوڑا (لطیف ترین لمحۂ سکون بخش) اور سارا وجود صرف چند لمحوں میں دھڑکن بن کر کسی ایک جگہ دھکنے لگا۔ جسم نے تمام مسامات کھل گئے اور شکست پر آمادہ معمول ذہن آہستہ آہستہ تاریکی میں ڈوب گیا۔ آنکھیں منعکس ہو چکی تھیں۔

"دیکھیے اس میں خفا ہونے کی کوئی بات نہیں۔ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں بہ ہوش و حواس کہہ رہا ہوں کہ یہی تمام المیوں کی بنیاد ہے اور اسی دائرے کے گرد سب گھومتے ہیں ــــ کہ ہم سب آج تک زندہ ہیں۔ کاش ہمارے آبا و اجداد نہ ہوتے۔"

دوسری بار جب وہ اسے نظر آئی تو اس کا دل چاہا کہ مرکب کو کہیں اگی ہوئی ریت کے درمیان چھوڑ کر چھلانگ لگا دی جائے حالانکہ دستور یہ ہے کہ اس کا معمول بن کر ذہن نشیب کی طرف سرعت سے دوڑتا چلا جائے۔

"یقیناً میں جانتا ہوں کہ آپ میری بات نہیں سمجھ سکے ہیں اور یہی المیہ ہے کہ صرف مجھے اس کا علم ہو سکا ہے کہ تمام مرے ہوئے لوگ آج تک زندہ ہیں ــــ اگر پہلے والوں کو یہ علم ہوتا

تو وہ مر چکے ہوتے ــــ کاش! ہم مر چکے ہوتے تو آج زندہ نہ ہوتے یا کم از کم آج زندہ نہ ہوتے تو ضرور مر چکے ہوتے۔"

اس نے نامعلوم کے خوف سے شکست قبول کر لی اور خواہش مرگ کی توانائی تمام رگ و پے میں سرایت کرنے لگی تو غزوہ سے پہلے اس کے تمام بھائیوں نے مل کر اس کے اسلحے چھپا دیئے (گو یہ راز بعد میں کھلا کہ اس میں بھی اس کی مرضی شامل تھی) ورنہ یوں آسانی سے وہ اپنے ہزار ماسک والے چہرے کا اظہار کب کرتا۔

"جب مجھے علم ہوا کہ اب تک کے تمام مرے ہوئے لوگ زندہ ہیں تو میں نے اپنا مزید اخفا نامناسب جانا اور چہرے کی ایک ایک پرت نوچ کر کھانے لگا ــــ یہ ستم تھا کہ جب آباد اجداد زندہ ہیں تو میں اپنے کو تنہا نسب کیسے کہتا اور یہی میرا ذاتی المیہ تھا خود پر طاری کردہ کرب ــــ خود اذیتی کی نادر مثال۔ ؎

ہوس کو ہے نشاطِ کار کیا کیا"

دل اتنی سرعت سے مائل بہ نشیب ہوا کہ جرأت کے تمام جذبات ختم ہونے لگے۔ شکست کے کریہہ آثار جذام بن کر اس کی رگ رگ سے پھوٹ بہے ــــ وہ چیخ کر قہقہہ لگانا چاہتا ــــ کرب میں اپنے کو جھٹکنا چاہتا ــــ بلک بلک کر رونا چاہتا لیکن ــــ... اس نے ڈوبتی ہوئی آنکھیں اٹھائیں اور تھک کر لمبی لمبی گہری سانسیں لینا چاہا ــــ جا ــــ ہا ــــ ھ ــــ ھ لیکن سوکھے ہوئے حلقوم سے صرف کچھ مبہم سی آوازیں ہی ابھر کر رہ گئیں۔

"میری آنکھیں سمندر کی دیوار میں ایک موہوم دھاگے سے باندھ دی گئی ہیں اور اعضا و حواس مجھ سے چھین لئے گئے ہیں ــــ افسوس۔ میری آنکھیں ــــ میرے دوسرے اعضا دور سے مجھے دیکھ کر ترستے رہے ــــ افسوس کرتے رہے۔ اف ــــ سو ــــ س ــــ لیکن یہ تو میرا ذاتی مسئلہ ہے ــــ میں سب کو بہت عرصہ پہلے اظہار ہمدردی اور ترحم سے منع کر چکا ہوں۔ کس نے مجھ پر ظلم کیا میں کس سے جواب طلب کروں۔"

وہ اپنی شکست اور محرومی پر مطمئن ہونے کی کوشش کرنے لگا ــــ تھکا تھکا سا خاموش نجات دہندہ کے دست شفقت کا منتظر ــــ مہدی موعود کی لو لگائے اور بڑبڑاتا۔

میرا لازمی سمندری سفر پورا ہو چکا ہے، اب مجھے گذر جانے دو۔ صحرا میرا انتظار کرتے ہوں گے ــــ میں ان سے وعدہ کر چکا ہوں۔ مجھے کوئی شکایت نہیں۔ ان سے بھی نہیں

جنھوں نے مجھے ساحر جانا۔ نفرت کی یا نظر انداز کر دیا۔ میرے لئے جلتی ہوئی ہتھیلیوں پر چاند اور سورج لائے ـــــ میں تو ریگستانی ببول کی جڑیں کھود رہا ہوں ـــــ پھر اس کے ریشے چوسوں گا۔ خشک بے رس ـــــ مجھ پر لوگوں نے زبردستی نبوت کے الزام لگا دیئے۔ کاش میں ان نااہلوں کو شناخت کر سکتا۔

دور ـــــ آہستہ آہستہ ایک جسم متشکل ہونے لگا ـــــ ایک گہرے سیاہ رنگ کے گھوڑے کا جسم۔ جسم متحرک تھا۔ اس کی پشت پر ایک دوسرا خاکہ ابھرا ـــــ ایک اکہرے لبادہ والا مبہم وجود ـــــ اس نے چاہا کہ اپنی آنکھیں اس وجود اور مرکب سے ہٹا لے لیکن اس کے اعصاب جواب دینے لگے ـــــ آہستہ آہستہ وہ اپنا SUBMISSION کر بیٹھا۔ مرکب سوار اپنی تیز چمکیلی آنکھوں سے اسے گھور رہا تھا مستقل اور متواتر ـــــ مرکب الف ہونے لگا تو وہ لبے چمکارنے لگا ـــــ پھر واپسی کے سفر میں چپکے چپکے املی کے درخت اگاتا چلا گیا۔

"میں نے یہ جانا کہ ہر سبز و شاداب درخت کی جڑوں میں انھی ریگستانی ببولوں کے انگارے ہیں جن کی پتیاں میں نے ان کی شادابی کے لئے عمداً چھوڑ دی تھیں تاکہ دشت میں انھیں اپنی بے برگی کا احساس نہ ستائے ـــــ لیکن وہ مرکب سوار اپنی تیز چمکیلی سیاہ آنکھوں سمیت مجھ پر سوار ہے۔"

اسے اپنی بے اعضائی، بے چشمی، اور بے بسی پر سخت غصہ آ رہا تھا۔ اس نے ایک جگہ ٹھوکر کھائی اور چپکے سے زمین میں دھنسے ساہی کے کانٹے کو اپنی آستین میں چھپا کر لڑکھڑانے لگا۔ مرکب سوار کے چابک کی آواز اس کی ریڑھ پر سرسراتی رہی۔ کہ تمھیں ابھی زندہ رہنا ہے اور سمندر کے کھارے پانی، یرقان زدہ آنکھوں اور بے اعضائی کا کرب سہنا ہے۔ پھر تمھیں نمک بنانا ہے۔ پھر اس کا ذخیرہ کرنا ہے، اسے بڑھا کر پہاڑ بنانا ہے۔

پھر تو مر جانا ہے؟

نہیں! ـــــ پھر بھی زندہ رہنا ہے ـــــ تاکہ سود پر نمک چلا سکو ـــــ

"تب میرے تمام جسم پر درے مارے گئے لیکن مجھے لگا کہ وہ جسم اب میرا نہیں ہے ـــــ میری آنکھوں سے جلتی ہوئی سلاخ لگا دی گئی ـــــ لیکن وہ آنکھیں میری کب تھیں ـــــ میرے پیر کے تلووں میں نیزے چبھوئے گئے ـــــ لیکن کیا وہ میرے ہی تھے؟ ـــــ اس سیاہ تیز چمکیلی آنکھ والے مبہم وجود نے میرا پیٹ چاک کر کے میری لمبی لمبی آنتوں کو چبانا شروع کر دیا۔

اور نیزے کی انی سے دماغ کریدنے لگا ـــ لیکن میں کیوں بولتا ـــ میں بس اسے دیکھتا رہا اور دل سرعت سے مائل بہ نشیب رہا ـــ دور کسی ایک جگہ سارا وجود دھڑک رہا تھا ـــ صحرا کے اس پار ـــ جہاں سے میں کبھی گذرا ہی نہ تھا۔

دیکھئے اس میں خفا ہونے کی کوئی بات نہیں ـــ آپ ذرا میری بات کو سمجھنے کی کوشش کیجئے اگر میرے آبا و اجداد مر گئے ہوتے تو آج زندہ نہ ہوتے۔ وہ دشت میں اپنے عمل کی تکمیل سے قبل ہی بھاگ نکلا اور دورانِ سفر شدت سے خواہش محسوس کی تمام چہروں کو خود ہی کھا جائے۔ پھر خیال آیا کہ یہ تو رجعتِ قہقری ہو گی ـــ یعنی پھر وہیں سے ابتدا جہاں سب کچھ ختم ہو گیا تھا۔

کریدتے ہو جواب راکھ جستجو کیا ہے

کاش سب پہلے ہی مر چکے ہوتے۔

آخر وہ ایک ببول پر چڑھ کر بیٹھ گیا۔ بہت سے پتھر آئے اور جسم کو زخمی کر کے جڑوں میں سما گئے۔ بہت سے تیر آئے اور آنکھیں پھوڑتے اور حلقوم چھیدتے گذر گئے یا جسم میں ہی ترازو ہو گئے۔ نیزے ہڈیوں کو توڑ کر زمین پر گر پڑے۔ اور وہ اعصاب زدگی کے عالم میں مسحور کانپتا رہا ـــ اپنے کو ان تیز چمکیلی سیاہ آنکھوں کی شدید تر گرفت سے آزاد کرا لینے کی کوشش کرتا رہا ـــ ان تمام پتھروں، تیروں اور نیزوں سے بے اعتنار ـــ

"میں مسکراتا ہوا انتظار کرتا رہا ـــ کب یہ نیزے نمو پذیر ہو کر ببول کا درخت بنیں، وہ تیر سبز ہو کر جھاڑیوں کی صورت میں نمودار ہوں ـــ اور وہ پتھر پہاڑ بن جائیں ـــ تاکہ میں اسی طرح متواتر پھر زخمی ہوتا رہوں (اذیت کا لمحہ سکون بخش)" اے کاش! میں اس درخت کی اس مکمل غیر محفوظ شاخ پر بیٹھا لگاتار زخمی ہوتا رہوں ـــ اس لئے کہ واقعی یہ سب میرے کہاں ہیں ـــ دوسرے خود ہی اپنی انرجی ضایع کر رہے ہیں۔"

جب اس سے منسلک لوگوں کی امیدیں اس سے وابستہ ہوئیں تو وہ تمام وعدے بھلا کر انھیں بہلانے لگا ـــ جب اس سے کہا گیا کہ میں گیارہ برس تک تمہارا انتظار کروں گا تو وہ کھلکھلا کر ہنس پڑا۔ جب اس نے کہا کہ میں تمہارے قرب کے لئے جھوٹ بولا تھا تو اس نے حقارت سے دیکھا ـــ لیکن جب وہ اپنے ہزار ماسک والے چہرے اور اپنے انٹی گز لمبے قد کو لے کر آگے بڑھا تو دوسری لاتعداد آنکھیں متحیر ہونے کے بجائے تنفر آمیز انداز میں مسکرانے

لگیں اور خود غرض مکار کا خطاب ملا ـــــ حالانکہ وہ سبھی اس سے خوفزدہ تھے۔

اس کا سفر جاری رہا کہ شاید اس کی پذیرائی ہو ـــــ لیکن گھوم پھر اسی ریگستان میں انھی سیاہ آنکھوں کا معمول بننا پڑا ـــــ

اسی جگہ سب نے اقرار کیا کہ ہاں دراصل وہ سب زندہ ہیں۔ موت کا جھوٹ بولے تھے وہ خوش ہوا ـــــ کہ وہ پہلا شخص تھا جس نے یہ جان لیا تھا کہ وہ سب دراصل زندہ ہیں ۔ وہ دیوانہ وار اس شخص کی تلاش کرنے لگا جس نے سب سے پہلے اس یقین کا اظہار کیا تھا کہ وہ آبِ حیات لے کر ہی پلٹے گا ـــــ

سفر میں وہ اپنے ماسک نوچ نوچ کر کھاتا رہا ـــــ جب آخری ماسک بھی اکھڑ گیا تو اس کی تیز چیخ فضا میں دیر تک لرزتی رہی ـــــ

ارے ! اتنے ہزار ماسکوں میں میرا اصل چہرہ تو نہیں چلا گیا ـــــ یہ جلا ہوا سفید چہرہ جس کی جلی ہوئی چربی کی بدبو آس پاس کی فضا کو بھی مسموم کر رہی تھی ـــــ یہ میرا کب تھا یہ کیسے ہو سکتا ہے ؟؟

"نہ جانے یہ کیسا المیہ تھا کہ اس وقت میں نے اپنی ہی شناخت سے انکار کر دیا"

جب اس سے کہا گیا کہ ـــــ

تم ـــــ COMPLEXED ہو ـــــ تو اسے یقین نہیں آیا ـــــ

میرا حقیقی چچا مجھ سے عشق کرتا ہے ـــــ جنسی عشق ـــــ تو بھی اسے یقین نہ آیا۔

تم مکالموں میں گفتگو کرتے ہو ـــــ اس نے عمداً جھٹلا دیا ـــــ

تم میں ڈرامائیت ہے ـــــ وہ یہ ظاہر کرنے لگا کہ یہ ڈرامائیت نہیں ہے ۔ اگر تم نہ ملے تو میں تمھارا ہی گلا گھونٹ دوں گا ـــــ

"لوگ مجھ سے کہتے ہیں کہ میں جھوٹ نہیں بولتا ـــــ لیکن میں بہت جھوٹ بولتا ہوں ـــــ میں چوری نہیں کرتا ـــــ لیکن میں چور ہوں ـــــ میں بہت پڑھا لکھا ہوں ـــــ لیکن میں بہت زیادہ جاہل ہوں ـــــ یعنی میں ہر وہ چیز نہیں ہوں جو لوگ کہتے ہیں۔ وہ تو میرے ماسک تھے جن کی ایک ایک تہہ مختلف مواقع پر مختلف لوگوں کے سامنے نوچ لی گئی تھی۔ میں تو ایسا ہی کمینہ ہوں کہ آج تک اپنی شناخت سے انکار کرتا رہا۔ لیکن یہ دھوکہ کب تک۔ کون کہاں تک جھوٹ بول سکتا ہے"

اپنا اصل چہرہ تو اس نے اسی ریگستان میں معمول بن کر دیکھا ورنہ وہ کبھی یہ نہ ظاہر کرتا کہ تمام مرے ہوئے لوگ دراصل زندہ ہیں۔

"لا تحسبن الذین قتلوا فی سبیلِ اللہِ امواتاً بل احیاء وعند ربِّھم یرزقون" (قرآن)

وہ ببول کی پھننگی پر بیٹھا اس صبح کا انتظار کرتا رہا جس کی کبھی بشارت ہوئی تھی لیکن دروں کی سنسناہٹ ریڑھ پر لرزتی رہی اور ساہی کا کانٹا ورید میں داخل ہو کر چبھتا رہا۔

"کئی بار میں نے سوچا کہ لاؤ اس زبردستی کے عذاب سے نجات حاصل کر لی جائے اور اس لاش کو کسی ملبہ پر ڈال دیا جائے تاکہ برسوں سے بھوکے گدھ اناکا ریزہ ریزہ نوچ لیں یا کسی غلیظ ڈرینج میں پھینک دی جائے کہ غلیظ ڈھورے اس سے لپٹ کر روح تک کو مکروہ بنا دیں ـــــ تاکہ آئندہ وہ اپنی بے اعضائی اور بےچشمی کا ماتم ہی نہ کر سکیں ـــــ لیکن میں بزدل معمول۔؟ جس سے پہلے ہی کہہ دیا گیا تھا کہ تم نہ تو کسی کو اپنا سکو گے اور نہ ہی کسی کے ہو سکو گے۔"

اس نے ان تمام مردہ لوگوں کی موت کی تردید کرنی چاہی تو طاقتور سیاہ مہیب آنکھ نے روک دیا ـــــ جب کہ ان کے لئے سب سے بڑا المیہ یہی ہوتا کہ ان مطمئن مردہ لوگوں کو یہ احساس دلا دیا جائے کہ احمقو! تم مرے نہیں ہو زندہ ہو۔

وہ جبراً خوش ہوتا رہا کہ وہ SUBMISSIVE نہیں ہے ـــــ اس کی خواہش تھی کہ وہ بالاعلان کہے کہ وہ قنوطی ہے۔ کاش وہ ایسا ہی رہ سکتا۔ کاش!

جب تم اس شخص کے دروازے پر گئے جو بڑا مخیر تھا اور تمھیں یقین دلایا گیا تھا کہ وہ تمھیں کوئی نوکری دلا دے گا ـــــ تو تمھارے فرشی سلام کے جواب میں اس نے کہا تھا۔

جاؤ جاؤ ـــــ معاف کرو ـــــ گھر میں اس وقت کوئی نہیں ہے۔

اس بات کا گواہ تو وہ بجلی کا کھمبا ہے جس کے نیچے بیٹھ کر تم روئے تھے ـــــ یا پھر ہنسے تھے ـــــ وہ تو آج تک گواہی دینے پر آمادہ ہے۔

جب تم منڈی کے مقدم کے پاس جا کر گڑگڑائے تھے کہ تمھیں نوکری دے اور پڑھنے کے لئے تھوڑا سا وقت ـــــ تو اس نے دوسرے مقدم کے کان میں کہا تھا۔

سالا ایکٹنگ کرتا ہے ـــــ

جا بے ـــــ جا کر شیش محل میں دھندا کر ـــــ نواب لوگ پڑھا دیں گے

دوسرے نے کہا ـــــ

ابے نمکین ہے سالا ـــــ رکھ لے نا ـــــ رات میں ساگ بنے گا ـــــ

چپ ماں کے ـــــ ایسے ساگ کو کیا کرے کوئی جس کے پینڈے میں بال آجائے ـــــ

اور جب آموں کی آخری ٹوکری ٹرک پر لادنے کے بعد تقریباً ڈھائی بجے تمھیں احساس ہوا کہ تم نے کل رات آٹھ بجے سے اب تک کچھ نہیں کھایا ہے اور تمھاری مزدوری کل پر ٹال دی گئی ہے ـــــ اور تمھیں سونے کے لئے سڑے ہوئے آم کے چھلکوں کا بستر دیا جارہا ہے تو تم ساری رات ٹہلتے رہے تھے جس کی گواہی اس بوڑھی کنجڑن کی جوان لڑکی بھی دے گی جو بار بار ڈوپٹے سے اپنی آنکھ رگڑ رہی تھی۔

جب تمھیں پکارنے والوں نے طویل ایک برس تک چپراسی کہہ کر پکارا تھا ـــــ تو تم خاموش رہے تھے اور کمرہ نمبر ۵۵، ۵۳ کی بکھری میزیں ہر رات کو تمھیں ستاتی تھیں ـــــ میلے جھاڑن کی بدبو تمھیں آنکھ کھولنے پر مجبور کر دیتی تھی۔

لیکن صبح کو تم دستخط کرتے وقت مسکراتے تھے ـــــ اس لئے کہ ان سب کا حق تم نے ہی انھیں سونپا تھا ـــــ اور جب رکشا ..... جب ـــــ جب ..... لاحول ولاقوۃ ـــــ چھین لے مجھ سے حافظہ میرا ـــــ

ان غلیظ اور سیاہ مہیب آنکھوں سے بچنے کے لئے ببول کے درخت پر بیٹھے بیٹھے اس کی طبیعت اکتا چکی تھی

"چلو اب اتر چلو! ـــــ اس خوف اور تذبذب کے دریا میں غوطہ لگانے سے اچھا ہے کہ ان کا سامنا کر کے اپنا مکمل SUBMISSION کر دیا جائے۔ ابھی تیروں کی جھاڑی بن کر اگنے کا بہت دنوں تک امکان نہیں ہے۔ نیزے تو اب بھی شاخوں سے الٹے لٹکے ہوئے ہیں ـــــ اور پتھر اسی طرح جڑوں میں پڑے ہیں۔"

وہ پھسلتا ہوا نیچے آیا اور ایک ایک پتھر کو الٹ کر دیکھنے لگا۔

"اف ـــــ! کتنوں پر میرے خون کے دھبے ہیں ـــــ شاخوں سے لپٹے ہوئے تیروں میں ـــــ افوہ ـــــ اب بھی میری سوکھی ہوئی رگیں اور گوشت کے ٹکڑے ہیں۔"

وہ مسکرا کر جڑ سے ایک ایک پتھر اٹھا کر علیحدہ رکھنے لگا ـــــ خاصی دور ـــــ پھر درخت کی جڑ کھودنے لگا ـــــ کئی گھنٹوں کی محنت کے بعد جب اسے ریشے دکھائی دیئے تو

وہ انھیں نوچ نوچ کر چوسنے لگا ___ اور تازہ دم ہو کر پھر مٹی ہٹانے لگا ___ آہ ___ ہا ___ ہ ___ اس نے مٹی ناک کے پاس لے جا کر لمبی سی سانس لی ___ پھر کھدی ہوئی جگہ میں کھڑا ہو گیا ___ اور مٹھی بھر بھر کر تمام نکالی ہوئی مٹی اپنے اوپر گراتا گیا۔

انگلیوں کے تمام خطوط مٹیالے ہو ہو کر سیاہ ہو گئے تو مٹی گردن تک پہنچ چکی تھی۔

اس نے ڈرتے ڈرتے ایک بار پھر درخت پر نظر ڈالی ___ سارا سب کچھ ویسا ہی تھا۔ نیزے ___ تیر ___ اور پتھر سب اپنی جگہ پر تھے ___ اس نے اطمینان کی طویل سانس لی اور چند آخری مٹھیاں اپنے اوپر ڈال بیٹھا۔

دل سرعت سے نشیب کی طرف دوڑا اور تمام جسم کے مسامات کھل گئے۔

"خدایا ___ یا مسبب الاسباب ___ اب میں آخری رہوں۔ جسے یہ علم ہوا ہو کہ تمام مرے ہوئے لوگ دراصل زندہ ہیں ___ دیکھ! ___ میری بات کو سمجھنے کی کوشش کر ___

□

نیا منظر نامہ

(شمس الرحمٰن فاروقی کی نذر)

شہر کی راتوں میں اب محلے کے گھروں سے روزانہ آدھی رات کے بعد آہ تھوڑے پھوٹنے لگے تھے۔ اور بعض شب بیدار اپنے ہونٹوں کی ناخواندہ مسکراہٹوں کو نوچ پھینکنے کی کوشش میں ناکام ہوتے جا رہے تھے۔ اور نیند کی جھونک میں اٹھتے ہی اضطراری فعل کے طور پر بڑبڑانے لگتے تھے:۔

तमसोमा ज्योतिर्गमय

असतोमा सद्गमय

मृत्योर्मा मृतंगमय

مجھے اندھیرے سے روشنی کی طرف لے جا۔!

مجھے جھوٹ سے سچائی کی طرف لے جا۔!

اور مجھے موت کی ضلالت سے زندگی کے نور کی طرف لے جا۔!

وہ یہ نہیں جانتے تھے کہ وہ کس سے مانگ رہے ہیں اور کیا مانگ رہے ہیں۔ اور اس کے کتنے پُر الم نتائج برآمد ہو سکتے ہیں۔

شہر میں دن چڑھے۔ شہر کے خاص بازاروں میں وہ سُرخ لبادے والا فقیر اُبھر آتا جس کے ہاتھ میں کپڑے سے ڈھکا ہوا ایک پیالہ ہوتا جس پیالے کے گرد بڑی والی مکھیوں کا ایک جھنڈ چلا کرتا تھا۔ بہت زیادہ قوتِ سماعت رکھنے والے دوکان داران مکھیوں کی بھنبھناہٹ سے ہی اس

فقیر کی آمد کا احساس کر لیتے اور منہ پھیر کر اس کے پھیلے ہوئے بائیں ہاتھ پر پیسے رکھ دیتے۔ اکثر دوکانوں پر اسے کئی بار اپنا ہاتھ پھیلا کر داہنے ہاتھ میں سُرخ کپڑے سے ڈھکے ہوئے پیالے کی طرف اشارہ بھی کرنا پڑتا تھا۔ اور دوکان دار یکایک چونک کر اس کی طرف دیکھتے۔

لیکن شہر کی کسی دوکان پر یہ واقعہ نہیں پیش آیا تھا کہ فقیر کو پیالے سے لالچی مکھیوں کو ہٹا کر سرخ کپڑے کے پیچھے کا منظر دکھانا پڑا ہو۔

آج سارے شہر میں کھلبلی مچ گئی۔ اسے شہر بدر کرو۔ وہ ملیچھ ہے غلیظ ہے۔ وہ ہمارے اخلاق خراب کر رہا ہے۔ اسے نکالو۔!!

آج اس فقیر نے ایک دوکان پر کھڑے ہو کر متعدد بار اپنے ہاتھ پھیلائے اور ہاتھوں کی طرف اشارے کئے۔ لیکن کسی نے اس کی طرف توجہ نہ دی۔

آخر کیوں بھلا۔؟ یہ ہماری کمزوریوں کا فائدہ اٹھا کر ہم سے خراج کا طالب ہوتا ہے۔ بھیک کہاں مانگتا ہے۔؟

تو پہلے اس فقیر نے اپنی سرخ لنگی اوپر اٹھائی اور بائیں ہاتھ کی پانچوں انگلیوں سے اپنے خصیے سہلانے اور موٹے ناف کے چھلّے بنانے لگا۔ جب لوگوں نے کراہت کا اظہار نہ کر کے اشتیاق سے دیکھنا شروع کیا تو اس نے پیالے پر بھنبھناتی مکھیوں کو جھڑک دیا۔ اور پیالے سے کپڑا ہٹا کر دوکان میں گھمانے۔ پھر بائیں ہاتھ کی انگلی پیالے میں ڈبو کر چلانے لگا۔ سمندر منتھن کی طرح پیالے کے جھاگ نما بھنور میں لاتعداد مکھیاں مردہ اور نیم مردہ مکھیوں کے مختلف اعضا، بلغم، تھوک، پیپ، پیشاب اور گو کے چھوٹے بڑے ٹکڑے ابھرنے لگے۔ جنھیں فقیر انگلی اور انگوٹھے سے آہستہ آہستہ مس کر رہا تھا۔

اچانک اس نے اپنی انگلی اور انگوٹھا اٹھا کر منہ میں رکھ لیا۔ لوگوں نے جب تک حیرت اور کراہت کے اظہار کا ارادہ کیا تب تک فقیر آدھے سے زیادہ پیالہ چاٹ چکا تھا۔ اس کی غلیظ اور بے ڈھنگی داڑھی مونچھوں پر اب بھی کچھ زردی مائل لسلسا لعاب لٹک رہا تھا۔

بھاگتے ہوئے لوگ اس کی طرف چھوٹے بڑے سکّے اچھال رہے تھے اور وہ لنگی میں ہاتھ ڈالے اطمینان سے پھر اپنے خصیے سہلا رہا تھا۔

شہر کی ایک تپتی ہوئی دوپہر کو۔ لُو کے جھکڑوں کے ہمراہ ناچتی ہوئی ام الاجل شہر میں در آئی۔ اس کے سر پر سرکنڈے لگے ہوئے تھے۔ اور سارا لباس تار تار تھا پیروں اور

ہاتھوں میں دراڑیں پڑی تھیں جن سے اندر کا سُرخ گوشت باہر جھانک رہا تھا۔ اور اُمّ الاجل کی باچھوں سے سرخ سرخ تھوک چھینٹوں کی طرح باہر اُبل رہا تھا۔ وہ بہت سیاہ تھی۔

اس کے دانت باہر نکلے ہوئے تھے۔

وہ ہنس رہی تھی اور لو ہے کے تھپیڑوں کے ہمراہ اُڑتی پھر رہی تھی۔

اُمّ الاجل بے تحاشا قہقہے لگا رہی تھی ـــــ اور کہیں نہ رک رہی تھی۔

کچھ من چلے بچوں نے اس کا تعاقب کرنا چاہا ـــــ پھر خوف زدہ ہو کر اپنی اپنی ماؤں سے لپٹ گئے۔

اُمّ الاجل رقص کر رہی تھی۔

اُمّ الاجل جنگ کر رہی تھی۔

اور اُمّ الاجل خود ہی قتل ہو رہی تھی۔

کسی گوشے سے کسی نے پکار کر کہا۔ ہوشیار۔!! یہ اُمّ الاجل ہے۔! تو تمام شہر میں کہرام مچ گیا۔

امّ الاجل آئی ہے۔

امّ الاجل آئی ہے۔

ارے امّ الاجل کو بھگاؤ۔ ورنہ زبردست قحط پڑے گا۔

اُمّ الاجل اپنے ساتھ بھیانک سیلابوں کی نم ہوائیں لاتی ہے۔ اور ـــــ

اُمّ الاجل وحشیانہ اور بہیمانہ قتل عام کے ہمراہ آتی ہے۔ میرے بابا کہا کرتے تھے!

وحشت کی اس شام تک اہل شہر اُمّ الاجل کے پیچھے پتھر پھینکتے رہے اور ہاتھوں کی لرزش ان کی اعصاب زدگی کا اعلان کر رہی تھی۔

اے کاش اُمّ الاجل اب کبھی نہ آئے۔ کم از کم پچاس برس تک نہ آئے۔

اب اُمّ الاجل رقص کرتی رہی۔ اچھلتی رہی۔

اب اُمّ الاجل وحشت کی ہر صبح، ہر دوپہر، ہر شام رقص کرتی ہوئی لو کے تھپیڑوں کے ہمراہ سنسان شہر میں در آتی تھی ـــــ اور بچے جلدی جلدی باپ کی خالی کرسیوں پر بیٹھ کر لغات کھول لیتے۔ ان کی آنکھیں اور انگلیاں "ت" سے "تدی" بہ معنی "عورت کی چوچی" "مقعد" ـــــ بیٹھنے کی جگہ ـــــ "چوتڑ" اور "فرج" ـــــ "عورت کا اندام نہانی" تلاش کرتیں

اور ورق الٹتی رہتی تھیں۔

لوگوں نے سارے دن اور ساری رات اُمّ الاجل کی کراہ سُنی۔ اُمّ الاجل کے مرنے بین کرنے کی آواز ـــ اُمّ الاجل کسی فیصلے کے دن کا انتظار کر رہی اور بڑبڑا رہی تھی۔

"میں منتظر ہوں اور دیکھتی ہوں۔ کب تک آسمانوں سے وہ ـــ قید کی دوہری زنجیریں نہیں وارد ہوتی ہیں۔

میں انتظار کروں گی اور دیکھوں گی کہ پہاڑوں پر بنوٹے کے پھولوں کی اصلی رنگت کب تک واپس نہیں آتی اور چودھویں رات کے چاند کا اصل چہرہ کب تک چھپا رہتا ہے کہ آخر کب تک پورا ملک حرامی بچے جنتا رہے گا۔ میں فیصلے کے دن کی منتظر ہوں اور محو رقص ہوں۔ اس لئے کہ میں جلتے ہوئے مکانوں کے مناظر کی مشتاق ہوں سارے محلات اور دوکانیں شعلہ رو۔ خاکستر تمام جلتے ہوئے اہلِ شہر۔ ہاہا بس اب چند ہی دنوں میں عملِ تخلیق رک جائے گا تمام پیدا ہونے والے بچّوں کے سر بڑے ہونے لگیں گے اور تمام عورتوں کے اندام نہانی تنگ سے تنگ تر ـــ ہاہا۔ ہاہا۔

اُم الاجل کے بھیانک قہقہے ساری رات تمام شہر پر لرزتے رہے۔ اور اُم الاجل چیختی رہی۔

دیکھو! میں ہر دروازہ پر کھڑی ہوں اور دستک دے رہی ہوں اگر کوئی میری آواز سُن کر دروازہ کھولے گا اور مجھے اندر آنے کی اجازت دے گا تو میں اس کی ہم دستر خوان بنوں گی ورنہ واپس چلی جاؤں گی۔ اس لئے کہ مجھے زمین اور اہلِ زمین نے کبھی قبول نہیں کیا ہے ـــ یقین جانو ـــ! میں منتظر ہوں اور دیکھ رہی ہوں۔ ایمان نہ لانے والوں کے لئے سزا معین ہو چکی ہے۔ جسے کوئی نہیں ٹال سکتا۔ تمھارا ادبار آچکا ہے ذلت و خواری تمھارا مقدّر ہو چکا ہے۔ اب تمھاری آواز پر توجہ دینے والا کوئی نہیں ہے۔

تمھارا المیہ یہی ہے کہ تم تباہی کے خواہش مند ہو تم میں خود دجّال چھپے ہوئے ہیں جو جھانکتے ہیں۔ وقت کا اندازہ کرتے ہیں اور چھپ جاتے ہیں۔ ان کی غذا سودائے قلب کا لطیف قطرۂ خون کیوں نہ ہو ـــ؟ وہ تمھاری سب سے عزیز تخلیق ہیں۔

اُم الاجل روتی رہی۔

تم کب تک کالا کافر ـــ کالا کافر کہتے رہو گے خوف زدہ ہوتے رہو گے۔ اب تم

خود ہی کالا کافر کیوں نہیں بن جاتے جسے ظاہر ہی ہونا ہے اس لئے کہ فیصلے کا دن قریب ہے۔ آسمان سے نور کی مدھ لکیریں ظاہر ہونے والی ہیں۔ چاند اور بگولوں کی اصل شکل واضح ہونے والی ہے۔

اُم الاجل بلکتی رہی۔

ریگستان میں گھوڑوں کے سموں کے نیچے بجلیاں چھپی بیٹھی رہیں گی۔ زرہ پوش سواروں کے اسلحات پھر سے زندہ ہوں گے۔ ریت روندی جائے گی۔

تلوار کی آب بڑھے گی۔

تمام مناظر ایک دم بدل جائیں گے۔ تم تمنا کرو کہ تمھاری چاروں طرف بھرنے ہی بھرنے ہوں۔ باغ ہی باغ ہوں۔ جانور ہی جانور ہوں۔ درخت ہی درخت ہوں۔ دھول، گرد اور ریت ہو۔ اس لئے کہ اب تم جلد ہی ان سب کو ترس جاؤ گے۔ اتب اُم الاجل بھی نہ رہے گی۔

اُم الاجل نے سانس لی۔

ہا ـــ نہ جانے فیصلے کا دن کب آئے گا۔؟ میں منتظر ہوں اور دیکھ رہی ہوں۔ ابھی تو اونچے آسمان نشین گرگسوں نے اپنے پر بھی نہیں سمیٹے۔ کیا ریگستان کی بیٹی تشنہ ہی رہ جائے گی ـــ؟ یوں ہی منتظر رہے گی اور دیکھتی رہے گی۔؟؟

سارے دروازے بند رہے۔ ام الاجل کو شب بسری کے لئے کھنڈرات کی جانب ہی جانا پڑا۔

اُم الاجل ـــ اُم الاجل ـــ!! میں بھی منتظر ہوں اور دیکھ رہا ہوں۔ اپنی تمھاری اور سب کی مسخ شدہ خبیث صورتیں۔

لوگوں نے آج اچانک اس فقیر کو بولتے دیکھا تو اس کے گرد جمع ہونے لگے۔

تمھارے شہر کے تمام درخت کاٹے جائیں گے۔ سایوں کا قتل کیا جائے گا۔ تاکہ کبھی کوئی بیتیال تمھیں آنے والے زمانوں کے بارے میں نہ بتا سکے۔ اس کے عوض شہر کے مختلف حصوں میں صحرا اگائے جائیں گے۔ جن پر ام الاجل کے قدموں کے نشانات ثبت ہوں گے اور ہماری تمھاری کریہہ صورتوں کے عکس جس میں ہم تم اور سب ہی بھٹکیں گے۔ جانیں گے کہ ہم منزل مقصود کی طرف گامزن ہیں ـــ ہماری تمھاری سب کی پلکیں اُلٹ کر

آنکھوں سے چپکا دی جائیں گی۔ اندرونی جلد کی سرخی ہم میں سے کوئی نہ دیکھ سکے گا بنتظر رہے گا
اور تلاش کرے گا ــــ وسیع و طویل ریگستان جس کے سینے پر اُونٹوں، خیموں کی طنابوں،
مشکیزوں اور خون کی سرخیوں کے نشان ہوں گے۔ حضور صلعم کا گھوڑا ہوگا۔ حضرت علی کی تلوار
ہوگی۔ ضرار ابن ازور، مالک اشتر کا نیزہ ہوگا۔ محمد غوری کا گرز ہوگا ــــ بابری توپیں ہونگی۔
عالمگیر زندہ پیر کی فوج ہوگی۔ قادسیہ اور غرناطہ ہوگا۔ بیت المقدس اور قسطنطنیہ ہوگا ــــ
دمادم مست قلندر۔ بحر ظلمات میں دوڑا دیئے گھوڑے ہم نے۔ ہاہاہا۔ لاؤ حور و غلمان ــــ
"جنّاتٍ تجری من تحتها الانہار" جاؤ ــــ! چلو جلدی کرو ــــ! اپنے حرم کی اندام نہانی پر
چمڑے کی تسمے باندھ کر رخت سفر باندھو۔!!! الٹی ہوئی پلکیں ــــ دھندلے مناظر بھاری
آنکھوں سے گذارتی جائیں گی اور تم محسوس کروگے کہ کہیں کچھ بھی نہیں ہو رہا ہے۔ سب ٹھیک ہے۔

لوگوں نے فقیر کو خاموش ہو کر پھر لنگی میں ہاتھ ڈالتے دیکھا تو اپنے اپنے گھروں کی سمت
بھاگ کھڑے ہوئے۔ اور ساری رات چمڑے کے تسمے بنانے نیز اٹھ اٹھ کر آسمان دیکھنے
میں گذار دی۔ ساری رات اُم الاجل کے بلکنے اور سرخ لباس والے فقیر کے بڑبڑانے کی
آواز ــــ چیختی چنگھاڑتی بند کھڑکیوں سے سر ٹپکتی رہی۔ سہمے ہوئے بچے اپنی ٹانگیں سکوڑے
اور ہاتھوں کو رانوں میں دبائے روتے رہے۔ عورتوں نے اختلاج کی وجہ سے ساری
رات بیت الخلاء کے دروازے کھلے رہنے دیئے۔

اور صبح کی پہلی ہی کرن میں اہل شہر سوالیہ نشان بنے اپنے گھروں سے باہر آگئے۔
جیسے جیسے سورج بلند ہوتا گیا ان کی پتلیاں آنکھوں سے اتر کر جسم میں غائب ہونے لگیں۔
سب نے بغیر پتلیوں کی آنکھوں سے ایک دوسرے کو دیکھا اور پوچھنے لگے۔ کیا تم نے رات
آسمان دیکھا تھا؟

کیا ستارے نکلے تھے ــــ؟

کوئی دم دار ستارہ تو شمال مشرق میں نہیں تھا ــــ؟

چلو اچھا ہوا۔ ابھی وقت نہیں آیا ہے۔

نہ جانے وہ قبیلہ کب آئے گا۔ جو شہر کے کھنڈروں میں نیم شبی رقص کرتا ہے؟

شام کو اہلِ شہر اپنے اپنے گھروں کی سمت پلٹے۔

آج اُم الاجل تو نہیں آئی تھی؟

وہ فقیر تو نہیں دکھائی دیا ـــ ؟

شاید دونوں گرگسوں کے شہر نکل گئے ـــ چلو اچھا ہوا ـــ!

سب اپنے اپنے گھروں کی تلاش میں چلتے رہے۔

آنکھوں کی سفیدیاں آہستہ آہستہ رات کی سیاہیوں میں تبدیل ہوتی گئیں۔ تو سب نے بغیر پتلی کی آنکھوں سے ایک دوسرے کو حیرت سے دیکھا۔

اور اتنی زبردست چیخ ماری کہ دُور آسمانی گرگس بھی بیمانہ ہنس پڑے۔ گاؤزمین دم بہ دم اپنی سینگ بدل رہی تھی۔ درختوں پر بیٹھی ہوئی چڑیاں مُردہ ہونے کے باوجود اپنے پنجوں سے ٹہنیوں کو جکڑے ہوئے تھیں۔

وہ سب سناٹے میں خاموش بیٹھے تھے۔ غار۔ آگ۔ دھواں۔ گرد۔ پانی اور سناٹا سب بڑے بھیانک لگ رہے تھے۔

ان کی بغیر پتلیوں کی آنکھوں نے ایک دوسرے کو محسوس کرنا چاہا تو لگا کہ سب ٹھیک ہے۔ بس ان کے قدم چٹانوں میں دھنس چکے ہیں۔ ریڑھ کی ہڈی کی جگہ ایک سلاخ ہے جس نے گردن کی پچھلی رگوں کو بھی ابھار دیا ہے۔ اور وہی سر پر دھمک رہی ہیں۔ دانت اور زبان ـــ فولاد کے مضبوط تاروں سے جکڑے ہیں۔ ان تاروں کے سرے بغیر پتلی کی آنکھوں سے باہر نکلے ہوئے ہیں۔ صرف زکام زدہ نتھنوں سے سیٹی نما آواز آرہی ہے۔

معدوں میں زرد رنگ گھلتا جارہا ہے اور دماغ چیخ رہے ہیں ـــ

امّ الاجل ـــ امّ الاجل ـــ امّ الاجل ـــ

زرد دیواروں والے کمرے میں بیٹھے بیٹھے وہ تھک گیا۔ اس کی ریڑھ کی ہڈی سلاخ کی طرح ٹھوس مضبوط اور سیدھی ہوگئی۔ اور گردن کی پچھلی رگیں ابھر ابھر کر سر پر دھمک پہنچانے لگیں۔ اس نے حرکت کرنی چاہی تو جبڑوں کی رگیں بھی فولادی تاروں میں کھنچ گئیں۔

کاش میں اس وقت آسمان دیکھ سکتا۔

اس نے اُوپر کے دانتوں کو نچلے دانتوں سے الگ کرنا چاہا ـــ تو سسک اُٹھا۔

آہ ـــ اب آنکھوں سے باہر نکلا ہوا تار بھی کھنچے گا۔ اور آنکھوں کے ساتھ ہی پنڈلیوں کو بھی عجیب سا صدمہ ہوگا۔ کیا گردن کی پچھلی رگیں کبھی اتنی بھی ڈھیلی ہونگی کہ کھڑکی کھول کر آسمان دیکھ سکوں۔

جب میں چلا تھا تو میری مٹھیاں بند تھیں اور میرا قد بہت بلند تھا۔ کھڑکی کے باہر بہت سردی ہوگی۔ جانے۔؟ آج آسمان پر چاند نکلا ہے کہ نہیں۔ اس نے اپنے کو گھسیٹتے ہوئے کھڑکی تک پہونچایا۔ اور دھکتے ہوئے سر سے کھڑکی پر ٹکر مارنے لگا۔

جانے کب ان بھیڑوں کا بال بڑھے گا۔؟ ابا کے لئے شیروانی بنوانا ہے میں نے آج تک کبھی اوور کوٹ نہیں پہنا۔

نیچے شاید کوئی حادثہ ہوگیا ہے۔ شاید کوئی ٹکرایا ہوگا اور مر گیا ہوگا۔ میرا قد اتنا ہی لمبا ہوتا تو تمام آسمان میں جنگل اُگا آیا پھرتا۔ تاکہ چڑیوں کو گھاس پر بسیرا نہ لینا پڑے۔ نہ جانے اب چڑیاں اتنی کم کیوں ہوگئی ہیں ۔۔۔؟

اگر اس بار لاٹری نکل آئی ہوتی تو شاید کچھ کام ہو جاتا ۔۔۔ ایک مکان تو ہونا ہی چاہیئے۔ دو منزلہ ہی سہی۔ گھر کی پتیلیاں بھی کالی ہوگئی ہیں۔ ان کی کگر تو خیر نہ جانے کب کی ٹوٹ چکی ہے۔ اتی کا ہاتھ اب بھی روزانہ جلتا ہوگا۔ نہ جانے انھوں نے برنال منگایا ہوگا کہ نہیں۔ میرے لگائے ہوئے تروئی کے پودوں اور پھولوں کا کیا حال ہوگا ۔۔۔؟ فیروزہ پانی دیتی ہوگی یا نہیں ۔۔۔؟ انور کی بکری نے کوئی بچہ دیا ہوگا کہ نہیں ۔۔۔؟ پتہ نہیں وہ سب اب بھی مچھلی پکڑنے جاتے ہیں۔ اب تو چڑیاں بہت ڈھیٹ ہوگئی ہوں گی ۔۔۔؟؟ پتہ نہیں نبی جان کہاں ہوگا ۔۔۔؟ اس بار سگوا اور کولہوا پر بور آیا کہ نہیں ۔۔۔؟ کون بتائے ۔؟؟

اب تو گھر تک پکی سڑک ہوگئی ہوگی۔ سب سے زیادہ میرے ہی کھیتوں کا نقصان ہوا ہوگا۔ سنا ہے گھی اور کپڑے کے دام پھر بڑھ رہے ہیں۔ اب تک لحاف وغیرہ نہیں بن سکا ہے۔ اس برسات میں تین دروا کہیں بالکل ہی نہ گر گیا ہو ۔۔۔ بڑی پریشانی ہو رہی ہوگی۔

اگر حاطے والا برگد کٹوا دیں تو کچھ دھوپ ملا کرے۔ لیکن پھر چڑیاں کہاں بیٹھیں گی بے چاریاں۔ دور سے تھک کر آئیں گی اور برگد نہ پاکر کتنا حیران اور مایوس ہوں گی۔ بیچاری چڑیاں ۔۔۔ ظہور سے بول چال تو ہوگئی تھی۔ لیکن امام باڑہ پتہ نہیں بن سکا کہ اسی طرح ہے۔ مسجد سے کبوتروں کو کسی صورت بھی نکالنا ہوگا۔

یہاں تو ریڈیو بھی نہیں ہے ۔۔۔ ورنہ اقبال بیگم کو سنتے ۔۔۔ ہو با ۔۔۔!!

سیاں بیجیلے۔ تو رے نیناں رسیلے ۔۔۔!!

نہ جانے یہاں بڑا کھانا دینے کا رواج ہے کہ نہیں۔

سب اپنے اپنے ڈونگوں اور تھالیوں کو بجاکر چیخے ــــ آ۔ آ۔ نمی دانم ــ چہ منزـ
ی۔ ی۔ ل ــ بود شب جا ــ ئے کہ من بودم کہ ہر سو رق ــ مِ بسمل ــ بود ــ د۔ د۔ د ــ
شب جا ــ ئے کہ من بودم ــ آں ــ خدا خود ــ آں۔ خدا۔

شہر میں اُم الاجل بال کھولے لُو کے جھکڑوں کے ساتھ رقص کر رہی تھی۔ اور اسکی آنکھوں میں ریت بھری جا رہی تھی ــ سر پر سر کنڈے اُگے ہوئے تھے۔ اور لباس تار تار تھا۔

ام الاجل ہنس رہی تھی۔ اور ہاتھوں پیروں سے سرخ سرخ خون رس رہا تھا۔ لُو کے تھپیڑوں کے ہمراہ اڑتی پھر رہی تھی اور کہیں نہ رک رہی تھی۔ وہ جنگ کر رہی تھی اور قتل ہو رہی تھی ــ خود ہی چیخ رہی تھی ــــ

میں آسمانوں کی بیٹی ہوں۔ مجھے اپنوں نے دھتکار دیا ــ میں منتظر ہوں اور دیکھ رہی ہوں۔ کب آسمانوں سے نور کی دوہری لکیریں اترتی ہیں۔ پہاڑی ببولوں اور چاندنی کے اصل روپ کب ظاہر ہوتے ہیں۔ میں فیصلے کے دن کی منتظر ہوں اور محوِ رقص ہوں۔ ہاہا۔

میں نہ کہتی تھی کہ ایک دن تمھارے اعضا تم سے سلب کر لئے جائیں گے۔ تم جو عہد کر کے مکر گئے ہو۔ غدار ہو۔ اپنی بے پتلیوں کی آنکھوں سے سب کچھ محسوس کرنے کے لئے چھوڑ دیئے جاؤ گے۔ میں نے تو پہلے ہی بتا دیا تھا کہ ایک دن تمھاری آوازیں اور حرکتیں بھی خرید لی جائیں گی۔ تم خرید لئے جاؤ گے اور عملِ تخلیق رُک جائے گا۔

تم مر نہیں سکو گے۔ لیکن تمھارے نام سے خریدی ہوئی آوازیں چاروں طرف لُو کے تھپیڑوں کے ہمراہ دوڑتی پھریں گی ــــ اور تم فریاد کرو گے ــــ

"میرا نام ــــ ؟؟ (شاید) شیر خاں ہے ــــ باپ کا نام ــــ ؟؟(؟) محمد خاں ــ میں رہنے والا بہ مقام خوشاب (؟) ضلع سرگودھا۔ (؟) کا ہوں۔ میرے ساتھ سرفراز۔ ولد محمد اسلم (؟؟؟) بر مکاں ۱۲۵ تحصیل گجرات ضلع گجرات بھی ہے۔ میرے چھوٹے بھائی خوش حال خاں کو سلام۔ کھانا وغیرہ اچھا مل رہا ہے۔ فکر نہ کریں۔ اور کسی بات کی تکلیف نہیں ہے۔ اگر میرا کوئی دوست یا عزیز سُن رہا ہو تو میرے گھر اطلاع دیدے۔ السلام علیکم۔"

تمھاری آوازوں کا لوگ مضحکہ اڑائیں گے۔ اس لئے کہ تم نے ام الاجل کو شب بسری کی اجازت نہ دی تھی۔ تم نے اپنی خیانتوں میں کسی اور کو شریک کر لیا تھا۔

فقیر ــــ ایک لنڈ منڈ درخت کے نیچے کھڑا چیخ رہا تھا۔

میں نہ کہتا تھا۔ تم بے گھر بے شجر ہو جاؤ گے۔ میں نے تمھارے کانوں میں انڈیلتے ہوئے گرم سیسوں کی طرف سے تمھیں کتنی بار آگاہ کیا۔ لیکن تم تو ہر رات دودھ کے آب خوسے توڑتے رہے اب تمھارے دلوں کے صحرا سے تمام نقش کھرچے جائیں گے۔ وہ تمام داغ اور دھبے جو تمھاری حیات کی نشانی تھے۔ بدر و اُحد کی سرخیاں جو تمہاری راہِ نجات تھیں۔

تم اپنی بیویوں کے اندام نہانی پر چمڑے کے تسمے کی مہر لگانا بھول گئے اور خارش زدہ کتیوں، انڈے پر بیٹھی ہوئی مرغیوں سے مباشرت کرتے رہے تو اب ۹۰ ہزار حرامی بچے تمھارا انتظار کریں گے۔ اپنی ضخیم لغات کے مختلف ابواب کھولے "ث" سے "ثدی" ــ "ف" سے "فرج" کے معنی تلاش کرتے ہوئے۔

تمھاری بیویاں وہی رہانوی کی کتابیں اپنے سینوں سے دبائے تکیوں کو پیڑو دن ہم ران سے دبائے۔ ہلتے ہوئے پردوں کی طرف نگاہِ شوق سے دیکھتی ہوں گی۔ اور منتظر ہوں گی (؟) ؟؟ اس لئے کہ چٹانوں کے تصور سے انھیں اپنے جسم کی ملائمت کا شدید احساس ہونے لگتا ہے۔

اور تمھاری الٹی ہوئی پلکیں تمام دھندلے مناظر تمھاری آنکھوں سے گذار دی جائیں گی ــــ تم محسوس کرو گے کہ کہیں کچھ نہیں ہو رہا ہے۔ سب ٹھیک ہے۔

کوزہ بہ دست فقیر بائیں ہاتھ کو لنگی میں ڈالے کھڑا اور رہا تھا ــــ □

سلیماں سربہ زانو اور سبا ویراں

الف کو محسوس ہوا کہ نیچے بہت زوروں سے انجرات اپنا سر پٹک رہے ہیں۔ اور حباب پھوٹ پھوٹ کر پھیلتے جا رہے ہیں۔ اس میں شامل ہوتے جا رہے ہیں۔ کوئی شے اسے تیزی سے حرکت دیتی ہوئی زبردستی اوپر اچھال رہی ہے۔

اس نے راستہ کی نرم و ملائم چٹانوں کو اپنی گرفت میں لینا چاہا تو ہاتھوں پر لکیریں سی ابھر آئیں وہ اوپر اٹھتا رہا — چکر۔ چکر — مدوّر چکر۔ متلی۔ سفید پھین نما تے۔ چاروں طرف پھیلی ہوئی سیاہ سرخی۔ گاڑھی اور کثیف۔

سب سے پہلے اس کے ریشم ایسے بال ابھرے اور لہرانے لگے۔ کان تیز سناٹوں سے سن ہو گئے۔ ماتھے پر خنک طپش سے کچھ سکون ملا تو آنکھیں کھول دیں۔ پیروں کے نیچے اب بھی حباب پھوٹ رہے تھے۔ سنسناہٹ تما گدگدی۔

اوپر آکر اس نے اپنی مٹھیاں دیکھیں تو انگلیاں ایک دوسرے میں پیوست تھیں۔ سامنے کی چٹانیں سرخ بے ہنگم انداز میں لیٹی تھیں۔ الف نے بڑی مشکل سے اپنا سر گھمایا۔ سیاہی مائل سرخ چٹان کے ایک گوشہ پر ایک پھولے منہ والا وجود اسے خاموشی سے خوش آمدید کہتا ہوا دیکھ رہا تھا۔ شناسائی کے ازلی کرب اس کی آنکھوں کے پس پردہ تھے۔ حباب سخت ہو رہے تھے۔

الف نے پیروں کو دیکھا۔ وہ باہر آچکے تھے۔ آسودگی کی طویل سانس کے درمیان اسے پ م د۔ کے علاوہ بھی ایک وجود نظر آیا۔ کن انکھیوں سے الف کی طرف دیکھتا ہوا

الف کا دل چاہا کہ قلقاری مار کر ہنس پڑے یا اچانک رو پڑے تو یہ دونوں کیا سوچیں گے۔ حیران ہوں گے۔ مسکرائیں گے۔؟؟

آؤ آؤ نزدیک آؤ ——!

پ م د۔ نے "پکھو" سے سانس باہر کر کے اشارہ کیا۔

زمین ابھی سخت ہے۔ کیا تم میرے بھائی ہو ——؟

ہوں۔ اوں —— الف نے انگوٹھے سے زمین کریدی۔ نرم تو ہے اتنی ملائم جیسے بچے پھوٹتے ہوئے حباب۔ یا ان سے کچھ سخت۔ لیکن اگر آتے ہی میں نے ان دونوں سے اختلاف کیا تو شاید مناسب نہ ہو۔ الف نے پ م د اور دوسرے وجود کی طرف دیکھتے ہوئے چپکے سے چٹانوں کو سہلایا۔

دوسرا وجود بول اٹھا۔

ہے نا سخت؟ بے رحم ظالم سرخ بے معنی چٹان۔

ہے نا —— ؟ پ م د نے بھی پھولی ہوئی گردن ہلائی۔ الف کا دل چاہا کہ ہنس پڑے۔

کہاں سخت ہے؟ ہاں ہے تو! اسے اپنا سانس رکتا ہوا لگا۔

ہیں۔ ہیں۔ دیکھا میں بھی تم سے یہی کہتا تھا۔ لیکن شروع میں تم نے تردید کر دی تھی۔

آؤ اب چلیں

الف کو سرخ سیاہ چٹانوں پر چلتے ہوئے محسوس ہوا جیسے نیچے کے سارے ابخرات اُوپر آ گئے ہوں۔ اور حباب ٹوٹ رہے ہوں۔ چکمہ مدوّر چکمہ بہت تیز ہوتا جا رہا ہو۔

کہاں چلنا ہے۔ ہم کہاں چل رہے ہیں؟؟

کھیلنے ——!

الف کو لگا سارے الفاظ اس کے شناسا ہوں۔

اچھا۔

سُرخ سیاہ چٹان۔ نرم ملائم حباب۔ چکمہ مدوّر چکمہ۔ پ م د۔ دوسرا وجود۔ سیاہ سرخ۔ کھیل۔

الف نے بہ آہستگی اپنے سر کو ٹٹولا اور دماغ ہتھیلی پر رکھ کر بیٹھ گیا۔ اک ذرا رک جاؤ ——!

دوسرے وجود نے دُور ہوتے ہوئے سورج۔ پ م د۔ اور الف کو دیکھا۔ کراہیت سے "پھو" کر کے ایک ٹانگ گھٹنے پر رکھ کر کھڑا ہو گیا۔

پ م د۔ سانس درست کرتا رہا۔

الف نے پاس پڑے ہوئے سوکھے کنول کے ڈنٹھل سے ایک تار نکالا۔ جیب سے خوردبین نکال کر آنکھوں پر لگائی اور دماغ کے ایک گوشے میں تصویریں بنانے لگا۔

حباب ابخرات سرخ سیاہ چٹان پ م د۔ نرم ملائم زمین۔ ابھرتے ڈوبتے مناظر سرخ نیلے۔ سرخ پیلے۔ رنگ غبارے۔ ہوا۔ دوسرا وجود۔ کھیل۔

چلو ــــ!

الف نے کنول کے ڈنٹھل کو دوربین سے لپیٹ کر جیب میں۔ اور دماغ بائیں ہاتھ پر رکھ لیا۔ اس کی آنکھیں کانچ کی طرح چمک رہی تھیں۔

پ م د۔ اور دوسرا وجود آگے بڑھے۔ اور آسمان کی طرف منہ کر کے "پھو پھو" کرنے لگے۔

دوسرے وجود نے گھور کر الف کو دیکھا۔

الف کو زمین سرخ چٹان سخت محسوس ہوئی۔ دوسرے وجود سے خوف۔ پ م د اسکی طرف نہیں دیکھ رہا تھا۔

بگولہ ــ! جلدی سے چٹان کے کسی ٹکڑے پر مبارک باد لکھ کر دو۔ ہو سکتا ہے کہ کسی جنات کی شادی ہو۔

کسی جنات کی موت ہوئی تو۔ الف بول اٹھا۔

پ م د۔ دوسرے وجود نے الف کو گھور کر دیکھا۔

منحوس۔ اسے ساتھ کیوں لائے؟

پ م د کے ہاتھوں میں چٹان کا ٹکڑا لرز رہا تھا۔ دونوں کے چہرے زرد تھے۔ سرخ زرد۔ نیلے زرد۔ سیاہ زرد۔ چٹان کا ٹکڑا آہستہ آہستہ پگھل رہا تھا۔ زرد۔ زرد۔

الف بایاں ہاتھ جیب میں ڈال کر کنول کے ڈنٹھل سے نشان مقرر کرنے لگا۔

چلو اس سے چیونٹوں کے سوراخ پر پیشاب کرائیں گے۔ تاکہ اس کے مثانوں میں جلن ہو۔

مجھے پیشاب نہیں لگا ہے ــــ!

چلو اسے پانی پلائیں گے۔ خوب پیٹ بھر۔

مجھے پیاس نہیں لگی ہے ___!

منحوس۔ منحوس!!

الف کو پ م د سے بھی خوف محسوس ہوا۔ وہ ان حبابوں کو یاد کرنے لگا۔ ٹوٹتے پھوٹتے حباب۔ نرم ملائم زمین۔ سرخ چٹان۔ سیاہ۔ یہ شاید وہاں لوٹ جانا چاہتا ہے؟ دوسرے وجود نے سخت چمکیلی آنکھیں چمکائیں۔

ہاں شاید ___؟

الف کے بائیں ہاتھ میں دماغ پگھلنے لگا۔

چلو وہاں ڈائنامائیٹ لگا دیں۔ ورنہ وہ سخت چٹانیں ہمیشہ ہمیشہ ملائمیت کا زہر دیتی رہیں گی ___!

ادر اسے گرفتار کر لیں؟ پ م د نے سرگوشی کی۔

ابھی نہیں۔ نہر کھودنے میں معاون ہوگا ___!

ہوں۔ اچھا ___!!

الف ان کے جانے کے بعد سیاہ سرخ چیونٹیوں کو کنول کے ڈنٹھل کے سہارے پیشاب سے باہر نکالنے لگا۔

اُسے اپنی پشت پر قہقہے سنائی دیئے تو ڈنٹھل پیشاب میں گر پڑا۔ وہ چونک کر رونے جیسا منہ بنانے لگا۔ دوسرا وجود۔ پ م د مسکرا رہے تھے۔

کیا ڈائنامائٹ لگا آئے ___؟

قہہ۔ قہہ۔ قہہ۔

لیکن دھماکہ تو نہیں ہوا ___؟

قہہ۔ قہہ۔ ڈائنامائیٹ میں سائلنسر لگا تھا۔

دوسرے وجود نے پ م د کی آنکھوں میں دیکھا۔

چلو خندق کھود لیں ___؟

بیکار۔ چٹانیں تو ضائع ہو ہی گئیں ___!

ہشت۔ تاکہ سیاہ سرخ رنگ ادھر نہ پھیلنے پائے۔ اور ہم اپنی واپسی کے تمام

امکانات مسدود پائیں۔

انھوں نے سفید رنگوں سے نشانات مقرر کیے۔ اور دو کدالیں اس کے دونوں ہاتھوں میں پھنسا کر مڑے۔

ہم ابھی آتے ہیں۔ تم ایک دائرہ کی شکل میں گہرائی میں کھودتے جاؤ!

الف اندر ہی اندر مسکرایا۔

اچھا ہے مجھے تم دونوں کے وجود سے کراہیت ہوتی تھی۔ زمین تو اتنی ملائم اور سرخ ہے۔ اس کے نیچے صرف پھوٹتے ہوئے حباب ہیں۔ یا پھیلتے ہوئے تم ابخرات۔ آخر دو کدالوں کی کیا ضرورت ہے۔ الف نے پکار کر کہا۔

دونوں مڑے۔ مسکرائے اور پھر چل دیئے۔

بیوقوف۔ منحوس۔ بیچارہ۔ دونوں نے کہا۔

الف نے اطمینان سے پہلی کدال بہ آہستہ چٹان پر ماری۔ تو کدال اُچٹ کر خلا میں تیر گئی۔

سرخ سیاہ ملائم۔ اس کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ اب حبابوں کو راستہ مل جائیگا تمام ابخرات اُبل آئیں گے اور میں ان میں پھر سے چھپ جاؤں گا۔

تمام دن چٹانوں سے کدالیں اچٹتی رہیں۔ ابھی پم د اور دوسرا وجود واپس نہیں آئے تھے۔ الف نے جھنجلا کر بائیں جیب سے دماغ نکالا اور آنکھوں پر خوردبین فٹ کر کے کدال کی لکڑی سے نشانات مقرر کرنے لگا۔

جب میں ابھرا تھا تو میرے نیچے سفید دھندلے ابخرات تھے۔ پھوٹتے بہتے حباب۔ سر پر آسمان۔ پیروں کے نیچے آسمان۔ میرے بال سنہرے تھے۔ ان کی آنکھوں میں خوش آمدید۔

وہ دونوں لوٹے تو کھلکھلا کر ہنس پڑے۔ الف نے جلدی سے دماغ بائیں جیب میں رکھ لیا۔

خوب! اتنی جلدی تم نے سخت چٹانیں توڑ کر اتنا بڑا دائرہ بنا لیا۔ واہ وا۔ خوب! اتنا زیادہ پانی اتنی جلدی باہر آگیا۔ قسمت کے دھنی ہو۔ اب خندق بہت جلد تیار ہو جائے گی۔ تب ہم۔

یہ پانی نہیں۔ ہاتھوں کے آبلے اور آنسو ہیں! الف نے نظریں جھکالیں۔ اور ہاتھ میں پھنسی کدال کو ایک طرف لڑھکا کر دیکھا تو انگلیاں ایک دوسرے میں پیوست تھیں۔

این۔ ن۔ ن۔ منحوس، کام چور!

ابھی ہمیں گہرائی تک زمین کھودنا ہے تاکہ پانی نکل آئے۔ پھر اسے دائرہ کی شکل دینا ہے۔ چلو شروع ہو جاؤ۔ منحوس۔ کاہل ـــ تب ہم۔

الف کدال اٹھا کر سوچنے لگا۔

سیاہ سرخ سیاہ سخت نیلی بے رحم چٹان۔ ظالم۔

پ م د نے دوسرے وجود کے کان میں کہا۔

ساری کوششیں بیکار ہوں گی۔ یہاں پانی کبھی نہ نکل سکے گا۔ آؤ چلیں۔ کہیں اور چلیں۔ جہاں پہلے سے پانی موجود ہو۔ دریا ہوں۔ باغات ہوں، مکان اور کھیت ہوں۔ ہاں۔ ن۔ ن چلیں گے۔ وہ تو چلنا ہی ہے۔ ہم تم چلیں گے اور لوٹ لوٹ کر یہاں کا کام دیکھتے رہیں گے۔ چلو آج اسی چٹان پر سو رہیں۔ حرام خور۔ منحوس۔

سوچا تو میں نے بھی تھا کہ غار کی شکل تو ابھار ہی لی ہوگی۔ اس منحوس کام چور نے۔ حرام خور۔ پ م د نے نیند سے ڈوبتی آواز میں کہا۔ دوسرا وجود زور سے چیخا۔

اوئے۔ کدال دھیرے دھیرے مار۔ نیند لگ رہی ہے۔ الو کا پٹھا۔ صبح تک پانی نکل آئے۔ پ م د بڑبڑایا۔

الف نے کدال ایک طرف رکھ دی۔ ہتھیلیوں میں پیوست انگلیوں کو زبان سے سہلانے لگا اور کدال کے ڈنڈے سے اپنی پیٹھ پر ٹھوکے دیتا رہا۔ یہ کدال نہ جانے کہاں سے ہاتھ میں آگئی۔ ہا۔

آسمان۔ کیا زمین اور بھی کبھی اتنی سخت رہی ہوگی۔ بے رحم پھولے منہ والی زمین سخت ظالم کمینی چمکیلی آنکھوں والی۔ بے حجاب۔ بے انحراف۔ سخت بے آب۔

صبح ان دونوں نے آنکھ ملتے ہوئے دیکھا کہ الف اپنے ہاتھوں میں دماغ لئے بیٹھا ہے اور اکھڑی ہوئی چٹانوں کے ریزوں سے نشانیاں مقرر کر رہا ہے۔

اوئے جمورے۔ یہ کیا کر رہا ہے۔ پانی والی نکلا۔ کتنی کھدائی ہوگئی؟

الف کو دوسرے وجود کے لہجہ میں آج عجیب سی اپنائیت لگی۔ اس نے فوراً ریزوں سے

نشان بنایا۔ نرم ملائم۔ ہرا۔ سبز حباب۔ آبلہ۔ پھر دماغ بائیں جیب میں رکھتا ہوا مڑا۔

جی۔ ابھی تو نہیں —— ابھی تو بس۔ سخت چٹانیں ہیں سرخ —— !

اسے یہ کہتے ہوئے انتہائی شرمندگی ہو رہی تھی۔ کاش میں نے تھوڑی سی اور محنت کی ہوتی اور خندق سے پانی نکل آیا ہوتا تو اس وقت۔

نگاہ نیچی کر۔ اچانک ہی دوسرے وجود نے ٹوک دیا۔

اس سے کہو کہ دماغ پر نشانیاں مقرر کرنے کے بجائے چٹان کے ٹکڑوں پر لکھ لیا کرے۔ اس طرح تو بہت وقت برباد ہوتا ہے۔ اتنی دیر میں تو وہ ——

پ م د نے آہستہ سے دوسرے وجود کے کان میں کہا۔

ہاں بے ہاں! اب تو چٹان کے ٹکڑوں پر لکھ لیا کر۔ انھیں جمع کرتا رہ بعد میں لکھ لیجیو۔ کیوں سمے برباد کرتا ہے؟

الف نے سوچا۔ ہاں ٹھیک ہی تو ہے۔ بلاوجہ مجھے بھی دقت ہوتی ہے۔

اچھا۔ الف ہنس پڑا۔ دونوں بہت اچھے ہیں۔ میرا کتنا خیال رکھتے ہیں۔ میں بلاوجہ ان سے بدظن ہو کر گالیاں دے رہا تھا۔

الف نے سر کا داہنا حصہ کھول کر دماغ پھر اسی میں رکھ دیا۔ اور دونوں خالی ہاتھوں میں کدال اٹھا کر چٹان پر زور سے پٹخ دیا۔

ہا —— سرخ سیاہ چنگاریاں۔ نرم ملائم اور رحمدل۔

شاباش —— !

اچھا ہم چلتے ہیں۔

کہاں —— ؟ الف نے کدال سر کے اوپر لہرائی۔ ٹھناک۔ پ م د۔ دوسرے وجود کو دیکھ کر ہنس پڑا۔

بکاولی کا پھول لینے۔ دوسرے وجود نے پ م د کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

اچھا۔ ٹھناک۔ ایں کیا کہا۔ بکاولی کا پھول۔ کیا ہوتا ہے۔ کہاں ملتا ہے؟؟

ہی۔ ہی۔ دونوں ہنسے۔ پ م د نے گردن ہلائی۔

بہت خوبصورت ہوتا ہے۔ ہرا نیلا پیلا سیاہ بینگنی سرخ —— اچھا؟؟

ہاں —— ! اور بہت دور ملتا ہے۔ چٹانوں کے اس پار بھیانک سیاہ بھوتوں کی

حفاظت میں ایک گلابی رنگ کا دریا۔ بہت بڑا دریا بہتا ہے جس کے کناروں پر چاروں طرف مولسری اور ہار سنگھار کے پودے ہوتے ہیں جن پر پریاں بیٹھی ستار بجایا کرتی ہیں۔ ان کے اڑن کھٹولے اور اڑنے والے گھوڑے نیچے کھڑے رہتے ہیں۔

اچھا ــــ؟؟

ہاں اور کیا ــــ اور اس دریا میں لاکھوں بکاولی کے پھول تیرا کرتے ہیں جن میں سیاہ رنگ کے انتہائی زہریلے ناگ پوشیدہ رہتے ہیں اور پھول توڑنے والوں کو فوراً ڈس لیتے ہیں ــــ!!

اور تم دونوں ایسے خطرناک پھول کو حاصل کرنے جا رہے ہو۔ کیوں ــــ؟؟

ہاں۔ کیا کریں۔ ہمارا باپ اندھا ہو گیا ہے۔ اس کی آنکھوں میں بکاؤلی کے پھول کا عرق پڑے گا تو ٹھیک ہوں گی۔ ماں بیچاری بہت رو رہی تھی۔

اچھا۔ کیا یہ سب تمھیں پہلے سے ہی معلوم تھا؟

کیا مطلب، پ م د نے الف کو گھور کر دیکھا۔ ماں کو سوتے جاگتے فقیر نے بتایا تھا!

سوتے جاگتے فقیر ــــ؟

ہاں ہاں۔ سوتے جاگتے فقیر۔ دوسرے وجود نے اکتا کر کہا۔ وہ چھ ماہ سوتا ہے اور چھ ماہ جاگتا ہے۔

اچھا۔ چہ۔ چہ۔ جاؤ ــــ!

تم بھی لو گے۔ پ م د ٹھہر گیا۔

دوسرے وجود نے پ م د کو اکتاہٹ اور غصہ بھری نظروں سے دیکھا۔

پ م د کی آنکھوں اور ہونٹوں پر شرارت مسکرا رہی تھی۔

ہاں ــــ الف کے لہجہ میں شوق اور شک تھا۔

اچھا۔ اچھا۔ پ م د نے پھوپھو کر کے آسمان دیکھا۔ ایک اسے بھی لا دینا بھئی تھوڑی محنت اور سہی۔

الف کا دل چاہا کہ وہ بھی ان کے ہمراہ جائے اور دیکھے کہ سیاہ بھوت کیسے ہوتے ہیں؟ پریاں ستار کیسے بجاتی ہیں ــــ اور گلابی دریا میں لاکھوں تیرتے ہوئے نیلے، پیلے، سرخ، ہرے، بینگنی، سیاہ، بکاؤلی کے پھولوں میں چھپے ہوئے سیاہ زرد ناگ کیسے لگتے ہیں۔

یا ان دونوں سے ہی کہہ دے کہ اچھا ذرا جلدی ہی آنا۔ شام ہونے سے پہلے میں خندق تیار رکھوں گا۔ پانی سے لبریز ـــــ جاؤ سدھارو ـــــ!

لیکن الف کا دل مسوس کر رہ گیا کہ وہ ان دونوں سے کچھ بھی نہ کہہ سکا۔ کیوں نہ کہہ سکا۔ دیکھا تو جانا کہ چٹانوں کے اس پار کیا گیا ہے۔ سیاہ، سُرخ چٹانوں سے پرے۔ ٹھن ٹھناک۔ ٹھنا ٹھن۔

مجھے بھی جلد ہی کام ختم کر لینا چاہئیے۔ کہیں آج بھی جب وہ تھک کر آئیں تو انھیں غصہ نہ آجائے۔ بیچارے کتنی مصیبتیں برداشت کر رہے ہیں ماں باپ کے لئے۔ اگر کسی دیو نے مار ڈالا تب۔ اگر پریاں ہی اُٹھا لے گئیں تو کہیں کوئی پوشیدہ ناگ ڈس ہی نہ لے۔ الف کا دل خوف اور اندیشہ سے دھڑکنے لگا۔ پھر وہ روہانسا ہو گیا۔ بلا وجہ انھیں میں نے اکیلا جانے دیا۔ اسے لگا جیسے اچانک وہ بہت زیادہ تھک گیا ہو۔

الف بے دلی سے کھڑی ہوئی چٹانوں کے ریزے بکھیرنے لگا۔ سیاہ سُرخ سیاہ سخت۔ پھر بے خیالی میں نشانات قائم کرنے لگا۔

بکاؤلی کا پھول ـــــ دیو ـــــ دریا ـــــ مولسری مولسری۔ ہارسنگھار۔ ستارہ۔ اُڑن کھٹولہ اڑتے ہوئے گھوڑے تخت۔ ناگ ناگ۔ باپ ماں۔ باما۔ فقیر۔

ٹھن ٹھناک ٹھن۔ الف نے سر جھٹک دیا۔ کام ذرا جلدی ختم ہو جاتا تو دیر تک دہ یہ کدال کا ڈنڈا ہی مار لیتا۔ یا انگلیوں کو ہتھیلیوں سے پھڑا لیتا۔ ٹھناک جھن۔ چھ۔ آہ۔

کدال چٹان سے چھٹک کر اس کے داہنے پیر میں دھنس گئی۔ گاڑھا سُرخ خون چٹانوں پر پھیل کر سیاہ ہونے لگا۔ بےکار سُرخ خون۔ الف مسکرایا۔ گلابی دریا۔ ابھی اس میں بکاؤلی کے پھول کھلیں گے۔ اور چاند کا عکس لہرائے گا۔ پریاں ستار بجاتی رہیں گی اور سیاہ ناگ آکر چپ چاپ بیٹھ جائیں گے۔

کام بہر حال جلد ختم کر لینا چاہیئے۔ شام ہونے سے پہلے۔ وہ تھکے ہارے آکر فوراً میرا پیر تھوڑے ہی دیکھیں گے۔ پہلے تو ان کی نظر کام ہی پر جائے گی۔ کتنا غصہ ہوں گے بیچارے۔ خندق تیار نہ دیکھ کر۔ اس نے لباس کی ایک دھجی پھاڑ کر زخم پر باندھ لی۔ ہونہہ۔ ساری سُرخی نمی آسمان کھا گیا۔ پانی کیا کرے۔ زمین کیا کرے۔ بیچاری زمین آسمان ظالم بے رحم۔ سارے حباب پی گیا ہوگا۔ جب سایہ ہی نہیں تو انجرات کیسے

بنیں گے۔ سامنے کنول سوکھ گئے۔ صرف سرخ سخت چٹان رہ گئی۔ نہ جانے پانی کب نکلے گا کہ نجات ملے۔ اب تو خاصا گہرا اور چوڑا گڈھا بن گیا ہے۔ تینوں طرف وسیع و عریض پھیلی ہوئی چٹانیں سامنے چھوٹا سا آسمان بیچارہ۔ دھت تیرے درد کی۔ ٹھناک۔ ٹھن۔ دیکھیں بے چاروں کو پھول ملتا ہے کہ نہیں۔ یا کوئی حادثہ ہو جاتا ہے۔ کہیں پریاں لے کر بھاگ جائیں تو؟ اونہہ ان کے کس کام آئیں گے وہ! ناکارہ کام چور۔ منحوس۔ کیا بکاؤلی کا عرق پیر کے زخم پر بھی لگاتے ہیں یا صرف آنکھ کے کام کا ہے۔ شاید زخم اچھا ہی ہو جائے۔ کاش کم از کم ایک پھول تو مل ہی جائے۔ بعد میں باپ کے لئے دوسرا حاصل کر لیں گے۔ پانی نکل آئے تو بڑا مزہ آئے۔ میں بھی مولسری، ہار سنگھار کے پودے اگاؤں۔ گلاب کے تختے سجاؤں۔ گیہوں اگاؤں۔ چاول اگاؤں۔ بادل اگاؤں۔ حباب اگاؤں۔ ابخرات۔ دیو۔ پریاں۔ چٹانیں۔ درد۔ اڑن کھٹولے۔ اڑنے والے گھوڑے۔ رنگ۔ گلابی نیلے۔ ہرے۔ پیلے۔ سُرخ، سیاہ دریا اُگاؤں۔ نہیں ناگ۔ زخم چٹانیں بکاؤلی۔ پانی سرخ گاڑھا سیاہ اگاؤں۔ صرف بکاؤلی کا پھول اگاؤں۔ صر۔ اگاؤں۔ اگاؤں ــــ گا ون۔ ن۔ ن۔ ن۔ وہ پیر پکڑ کر رونے لگا۔

نہ جانے دونوں حرام زادے کہاں چلے گئے؟

مجھ اکیلے سے یہ سخت چٹانیں کب ٹوٹیں گی؟

سالوں کا نوکر ہوں۔ خندق کیوں کھودوں؟ پانی کیوں نکالوں؟ ان کے ہمراہ کیوں رہوں؟ یہاں تنہا کیوں رہوں۔ چٹانوں کے اس پار کیوں نہ جاؤں۔ جاؤں۔ ن۔ ں۔ اس نے ایک پیر پہ کھڑے ہو کر پھر کدال اٹھائی۔

اب کھود کر ہی دم لوں گا ــــ

پانی نکال کر رہوں گا۔ اکیلے ساری خندق کھود لوں گا۔

سیاہ سخت چٹانوں کو مار ڈالوں گا۔

حبابوں کو توڑ کر۔ ابخرات کو مٹھی میں جکڑ کر نچوڑ ڈالوں گا۔ کوئی نشانی نہیں رکھوں گا۔ دماغ سے بھی کھرچ ڈالوں گا۔ خود میں بھی توڑ ڈالوں گا۔

الف نے کدال رکھ کر سر کھولنا چاہا۔

یا کچھ دیر اور ٹھہر جاؤں۔ شاید پانی نکل ہی آئے تو مولسری مولسری ہار سنگھار۔ پریاں۔ ــــ اور بکاؤلی کا پھول۔ ابھی تک وہ دونوں بھی نہیں آئے۔ کہیں کوئی سانحہ نہ ہو گیا ہو تو

بکاؤلی کا پھول۔ ٹھناٹھن ۔۔ ٹھناک ۔۔۔ درد ۔۔۔ درد ۔۔۔

الف نے جھک کر دیکھا ۔۔۔ ہونہ ۔۔۔! آس پاس کوئی حباب نہیں ۔۔۔ صرف سیاہ و سرخ چٹانوں کے ریزے۔

زخم پر درم آتا جاتا جا رہا ہے۔ ابھی تک حرام زادے پھول لے کر نہیں آئے۔ پھوٹے منہ والا۔ دوسرا وجود ۔۔۔ حرامی۔ الو کا پٹھا۔ ایسے باتیں کرتے ہیں جیسے میں ان کا نوکر ہوں۔ اب تھوڑا رک جاؤں۔ کدال کے ڈنڈے سے پٹھے ٹھونک لوں۔ اور ہتھیلیوں سے انگلیوں کو چھڑا لوں۔ تو ۔۔۔

کہیں انگلیوں سے پانی نکل آئے تو بڑا مزہ آئے۔ انگلیوں سے بہتا ہوا دریا ۔۔۔ گلابی سرخ جس میں گلابی پھول کھلے ہوں اور ناگ پوشیدہ ہوں۔ سیاہ و سرخ۔ ہار سنگھار اور مولسری پہ بیٹھی ہوئی سرخ سرخ پریاں۔ نیچے ان کے بندھے ہوئے گھوڑے۔ گھوڑے۔ ہاہا۔

الف ریزوں پر نشانیاں مقرر کرنے لگا ۔۔۔ درد۔ درد۔

دور سے ایک سایہ ابھرا۔

الف نے سوچا۔ ایک آیا۔ ابھی آکر بگڑے گا۔ پانی نہیں نکلا، خندق نہیں کھدی، خندق کیسے بنے کہ ہم اس پار جانے کے سارے امکانات مسدود پائیں۔ دوسرے کو شاید بھوت اٹھا لے گئے ۔۔۔ اب بھون کر کھالیں گے ۔۔۔ ؟ وہ چیخے گا۔ یا شاید سیاہ پوشیدہ ناگ نے ڈس لیا ہو۔ دوسرا تو پھول لایا ہو گا۔ کیسے حاصل کیا جائے ؟ باپ کو دوسرا دیدیا جائے گا۔

کیا دوسرے کو پریاں اٹھالے گئیں۔ اب اتنا گلفام بھی نہیں تھا کوئی۔ ہائے کیسا بھک بھک کر چل رہا ہے ۔۔۔ اکیلا ۔۔۔ نہ جانے دوسرے پر کیا گذری۔

"یہ کون اتنی رات میں چٹانیں توڑ رہا ہے۔ میری نیند ٹوٹ گئی"۔ ارے یہ تو وہی سوتا جاگتا فقیر ہے ۔۔۔! جس نے باپ کا علاج بتایا تھا۔ قریب آجائے تو اس سے پوچھوں؟ بیچارے کی نیند اچٹ گئی۔ بیوقوف چھ ماہ سوتا ہے۔ کہ میرے ماں باپ کیسے ہیں ؟؟

کیا چاند ستارے جیسے ؟ سیاہ سرخ چٹان جیسے ؟ حباب اور ابخرات جیسے۔ یا کنول کے سوکھے ہوئے ڈنٹھل جیسے ؟ کہاں رہتے ہیں بے چارے ؟ کیا کرتے ہیں ؟ ان کا مصرف کیا ہے ؟ وہ کیوں ہوتے ہیں ؟

دوسرے وجود کی طرح ہوتے ہیں ۔۔۔ یا پیدم وکی طرح ۔۔۔ ؟

باپ اندھا کیوں ہے، ماں روتی کیوں ہے؟ اور کوئی کام کیوں نہیں کرتے ــــ؟ سیاہ و سرخ چٹانوں کو ریزہ ریزہ کرکے۔ خندق کیوں نہیں بناتے؟ پانی کیوں نہیں نکالتے۔؟ کیا کرتے رہتے ہیں۔ خالی چپ چاپ بیٹھے ٹکر ٹکر دیکھا کرتے ہوں گے؟ خالی اندھے رہتے ہیں؟ صرف روتے رہتے ہیں۔ اور آسمان دیکھ دیکھ ٹھنڈے سانس لیتے رہتے ہیں۔ دھوپ تو بہت تیز رہتی ہوگی؟؟ بے چارے ماں باپ ــــ!!

وہ بھی کیا کریں کہ سارے درخت آسمان پر اُڑ گئے۔ اب سائے جائیں تو کہاں جائیں؟ زمین سیاہ و زرد پھیلی ہوئی چٹان بن گئی تو حباب اور بخرات بے چارے کیسا روتے ہوں گے؟ وہ مولسری اور ہارسنگھار کیسے اگائیں؟ لگتا ہے کہ پھر سو گیا سالا بے وقوف نقیر۔ ٹھنا ٹھن۔

کھودنے سے شاید پھر جاگ جائے ــــ تو اس سے پوچھوں کہ پانی کب نکلے گا، خندق کب تیار ہوگی۔ بکاؤلی کا پھول کب آئے گا۔ مولسری کب پھوٹے گی ــــ؟؟

پ م د اور دوسرا وجود کب آئیں گے ــــ؟

دونوں بہت تھکے ہوئے نہ ہوں۔ زخموں سے چور چور (میں تو صرف ایک زخم سے پریشان ہوں) لڑکھڑاتے ہوئے۔ پژمردہ۔ پھر تو ڈانٹنے کی بھی سکت نہ ہوگی بے چاروں میں۔ ہائے ہائے۔

کیا پھول لائیں گے؟ کیا بکاؤلی کے عرق سے پیر کا زخم ٹھیک ہو جائے گا۔ یا انھیں بھوت کھا گیا ہوگا۔ ناگ ڈس لیں گے۔ پریاں اٹھالے جائیں گی۔ وہ دونوں کب آئیں گے؟ ئیں گے۔ ن گے۔ گے ے۔ ی ــــ الف کے پپوٹوں پر بھی ورم آنے لگا تھا۔

"کون اتنی رات میں چٹان توڑ رہا ہے میری نیند ٹوٹ گئی؟" الف نے گرج کر کہا تو کانوں میں آواز آئی۔ ٹھن ٹھناک۔ کتنا سخت ہے یہ؟ چٹان ــــ! منحوس ــــ! اے جھوٹے اٹھ!

خندق کہاں ہے؟

خندق ــــ؟

ہاں ــــ

یہیں ہے ــــ!

ایں؟؟

الف کی آنکھیں دوسرے وجود کے ہاتھوں کی زنجیر سے ہوتی ہوئی اس کی بغل میں

کھرڑے بھیانک بدہئیت کتے۔ اور پ م د کی پشت پر کھرڑی غلیظ سور پرجی ہوئی تھی۔

بھیانک ہیبت ناک اور غصہ ور کمینہ کتا — غلیظ بدبودار پھولی ہوئی بدذات سور۔

اڑے جمورے — ٹھن!! دوسرے وجود نے الف کے زخم کے پاس ٹھوکر ماری۔

تو الف کے ساتھ سور نے بھی آواز لگائی۔ کتا بھونکنے لگا۔ بھیانک اور نفرت انگیز آواز۔

اے خندق کہاں ہے — ؟

ایں — ؟ الف نے جلدی جلدی دوسرے وجود — کتا — پ م د۔ اور سور کو دیکھتے ہوئے کہا۔

ابھی نہیں کھدی۔ پانی نہیں نکلا — پانی ہے ہی نہیں۔ حباب بھاگ گئے۔ ابخرات کو آسمان چرالے گیا۔ چور حرامزادہ آسمان۔ سور کتا۔

پھول لائے ؟؟

الف نے غور سے دونوں کو دیکھا۔ دونوں کے چہروں پر رنج سفر کی کوئی علامت نہ تھی۔ ہشاش بشاش پ م د اور دوسرا وجود — تر و تازہ۔

الف کا دل دھڑک اٹھا۔ ارے پھول نہیں ملا۔ میرا زخم؟ اندھا باپ؟ ماں بیچاری روتی رہے گی؟ یہ مسکین صورت سور۔ یہ بے چارہ کتا۔

پھول لائے — ؟

پھول؟ پھول — ؟ پ م د نے دوسرے وجود کی طرف دیکھا۔

ہاں ہاں۔ اندھے باپ کے لئے!

اوہ اچھا۔ ہاں وہاں بہت سے پھول ہیں۔ سرسبز و شاداب چراگاہیں، باغات، کھیت، نرم اور ملائم زمین — کچھ اگانے کے لئے ہر وقت تیار۔

کہاں — ؟

وہیں گلابی دریا کے کنارے!

کیا وہاں دیو نہیں تھے؟ اور ستار بجاتی ہوئی پریاں۔ ان کے اڑن کھٹولے۔ پھولوں میں چھپے ہوئے ناگ؟

ہاں ہاں سب کچھ تھا۔ ہم لوگ انھیں ہی حاصل کرنے کی کوشش میں ہیں۔ بے چارہ اندھا باپ۔ تب تک تم ان دونوں کی دیکھ بھال کرنا۔ دوسرے وجود نے اپنے کتے اور

پ م و کی سو ر کی طرف اشارہ کیا۔ تو دونوں نے چونک کر الف کو غور سے دیکھا۔

الف کو چاروں سے سخت کراہیت ہوئی۔

یہ پھول کب ملے گا؟ اس نے اپنے ورم زدہ پاؤں کی طرف دیکھا۔

یہ خندق کب تیار ہوگی؟ پ م و نے اس کی طرف دیکھا۔

یہ کرتا کیوں پھاڑ ڈالا ہے؟ دوسرے وجود نے اس کے دامن کی طرف دیکھا۔

یہ پپ — پپ — الف اپنے زخم کی طرف دیکھ کر ہکلایا۔

کیا پپ — پپ کر رہا ہے — ؟؟

گھبرا رہا ہے بےچارہ — ڈرتا ہے۔ پ م و نے کہا — اور کتے نے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔

پوچ — پوچ — ڈرو نہیں۔ ڈرو نہیں — دوسرے وجود نے الف اور کتے کو چمکارا۔

مکاری کر رہا ہے سالا۔ خندق نہ کھودنے کا بہانہ۔ زخم وخم کچھ نہیں ہے۔ ایسے ہی کرتا پھاڑ ڈالا ہوگا۔

اسے پٹی کھول کر دکھاؤ — ! پ م و نے دوسرے وجود کی طرف دیکھ کر کہا۔

الف نے زخم کی پٹی کھولنا چاہی کپڑا زخم سے چپک گیا تھا۔

اوہ گہرا زخم ہے۔ دوسرے وجود نے جھک کر پ م و سے کہا۔

ارے کتنی گندی پٹی باندھ رکھی ہے — ؟ اسے کھولو۔ دھوپ ہوا لگنے دو۔ اس نے بڑھ کر زخم سے پٹی کھینچ لی۔

الف کے بھنچے دانتوں سے ایک کربیہ چیخ آزاد ہوئی۔ اس کے دانت ہونٹوں میں دھنس گئے تھے اور آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا گئے تھے۔

زخم سے تازہ کثیف سرخ خون چٹان پر بہہ رہا تھا۔ سیاہ سرخ چٹان۔ گاڑھا سرخ خون۔

پ م و دوسرے وجود سے سرگوشی کر رہا تھا۔

جلدی کرو۔ میں یہاں زیادہ دیر نہیں ٹھہر سکتا۔ مجھے تازہ ہوا کی ضرورت ہے۔ وہاں کوئی ہمارے گھروں اور کھیتوں کو نہ برباد کر رہا ہو۔ جلدی واپس چلو۔ اسے خندق تیار کرنے دو۔ بعد میں ہم اسے اپنے کھیتوں پر کام کرنے کے لئے لے چلیں گے۔

دوسرے وجود نے الف کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

یہ خندق نہیں کھودے گا۔ ایسے ہی بہانے کرتا رہے گا۔ یوں نہ مانے گا۔ اس طرف جائے گا ہی۔ اپنے نفع نقصان کو نہیں جانتا۔۔۔ بیوقوف۔۔۔ چغد۔

کیوں بے۔۔۔ ہے نا؟ پ م د نے گردن ہلا کر پوچھا۔

الف خاموش۔ سیاہ سرخ چٹان پر اپنے سیاہ سرخ خون کو دیکھتا رہا۔

غار تو تیار ہو ہی گیا ہے۔ اس کے ہاتھ پیر باندھ کر اس میں ڈال دو اور آنکھ پر پٹی باندھ دو تاکہ اس طرف نہ جاسکے۔ یہ دونوں۔۔۔ دوسرے وجود نے کتا اور سور کیطرف اشارہ کیا۔ تو یہاں رہیں گے ہی۔ ہم بھی کبھی کبھی آکر دیکھ لیا کریں گے۔ چلو واپس چلیں۔ جلدی کرو۔

دوسرے وجود نے ساتھ لائے تھیلے سے طویل بٹی ہوئی رسی نکال کر اس کے پیر جکڑ دیے اور رسی کو سختی سے بل دیتا ہوا کمر تک لایا پھر دونوں ہاتھ پیچھے کی طرف موڑ کر باندھتے ہوئے رسی کو بل دیتا ہوا اوپر گردن تک لایا اور رسی کے سرے کو غار کی ایک ابھری ہوئی چٹان میں باندھ دیا۔

آنکھیں تو بند کرو۔۔۔ پ م د نے سور کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ الف خاموش رہا۔ چلو اچھا ہے خندق کی کھدائی سے تو بچا۔

دوسرے وجود نے خشک، سیاہ سرخ خون میں لتھڑی ہوئی کرتے کی پٹی اٹھا کر اس کی آنکھوں پر باندھ دی۔

اب ٹھیک ہے؟ اس نے پ م د کی طرف دیکھا۔

ہاں۔۔۔ اب ان دونوں کو یہاں آزاد رہنے دو۔

پ م د نے سور اور کتے کی جانب اشارہ کیا۔

آؤ اب چلیں۔

الف نے سوچا۔۔۔ چلو تنہائی تو ختم ہوئی۔ یہ دونوں تو آس پاس رہیں گے۔۔۔ بے چارہ کتا۔ بے چاری سور۔۔۔ اچانک وہ چیخ پڑا۔

اے۔ اے۔ سنو۔۔۔!!

کیا ہے۔۔۔؟ دوسرے وجود نے رک کر پوچھا۔

ماں باپ رہتے کہاں ہیں۔۔۔؟

ماں باپ؟

ہاں —!

اوہ اچھا — ماں باپ — وہ دونوں وطن میں گھر پر رہتے ہیں!

گھر میں —؟؟

ہاں۔ بہت بڑا گھر۔ چاروں طرف بہت اونچی اونچی مضبوط دیواریں۔ بہت بڑے اور اونچے پتھر کے دروازے۔ محراب۔ طاقچے۔ دالان۔ آنگن۔ پیش باغ۔ پائیں باغ۔ وسیع و عریض کمرے۔ مسہریاں۔ سجاوٹ کے قیمتی سازوسامان۔ بڑے بھاری پردے — ہزاروں کنیزیں اور غلام۔

اچھا —؟؟

ہاں۔ قہ — قہ — قہ —!!

ہم چلتے تھے تو ہمارے پیروں کے نیچے دھواں دھواں۔ انجرا ستے تھے۔ بھیگے بھیگے حباب۔ نرم ملائم۔ پوپلی زمین۔ ہمارے سروں کا آسمان مع سورج ظالم بے رحم بہت اوپر تھا۔ خندق بن جاتی تو میں بھی ایک گھر بناتا۔ سارا نگار خانہ چین۔ بالکل ویسا ہی جیسا ہمارے ماں باپ کا ہے۔ وسیع وعریض خوبصورت باغ۔ مولسری مولسری۔ ہار سنگھار۔ ستار بجاتی پریاں۔ گلابی سرخ نہریں۔ کنیزیں اور غلام۔ لق و دق کمروں میں سجاوٹ کے سازوسامان۔ منقش دیوار و در۔ بھاری پردے۔ شاہ بلوط کی چوڑی مسہریاں۔ نرم ریشمیں خوشبودار بستر۔ اور ملگجا شمعیں اجالا۔ سلگتے ہوئے عود و عنبر۔ آزاد ہوتا تو چٹانوں کے اس پار جاتا اور سب کچھ دیکھتا۔ یہ حرامزادے سور اور کتا یہاں کیوں ہیں۔ کاش زخم ٹھیک ہو جاتا اور یہاں سے بھاگ سکتا۔ ان چٹانوں سے دور۔ اس پھولی ہوئی سیاہ سرخ نرم ملائم زمین پر —

اسے محسوس ہوا کہ کمینہ کتا اپنی زبان نکالے اسکی گردن پر ہانپ رہا ہے اور اسکی آنکھوں سے سرخ کمینگی کہہ رہی ہے۔

ہوں — بھاگنے کی سوچ رہے ہو۔ چالاک —؟

سور سامنے کی زمین کریدتی ہوئی اس کی طرف مڑی۔

ان حدود سے آگے نہ بڑھنا — بیوقوف!

الف نے کنگنا کر گردن سے کتے کے سانس ہٹانے چاہے تو محسوس ہوا کہ وہ حرکت ہی نہیں کر سکتا۔

کتا مستقل الف کی گردن پر زبان نکالے ہانپتا رہا۔

کہیں کوئی قطرۂ لعاب میری کھلی ہوئی گردن پر نہ گر پڑے۔

ہاں ہاں سوار ہو جاؤ مجھ پر۔ میں بھاگنے کی سوچ رہا تھا نا۔ در اصل تم میری رکھوالی کے لئے مقرر کئے گئے ہو۔۔۔ نہ کہ میں۔

الف کو محسوس ہوا کہ اگر وہ کوشش کرے تو پلکوں کے ذریعہ آنکھوں کی پٹی ہٹا سکتا ہے جس میں سے نکلتی خون کی بو۔ سیدھی اس کے نتھنوں میں گھسی جا رہی ہے۔ آنکھ کھلی رہتی تو آنکھ پر رکھا سیاہ سرخ خون بھی دیکھ لیتا۔

الف نے پلکوں کو حرکت دے کر پٹی ڈھیلی کر لی اور گردن ہلا ہلا کر اسے ہٹانے لگا۔

سور بھی غرائی۔ اور کتے کا تمام بوجھ الف کی پشت پر آ رہا۔ پٹی سرک کر گردن پر آ رہی۔ الف نے دیکھا کتا سور دونوں دروازہ کے پاس بیٹھے تھے۔ کتا اونگھ رہا تھا اور سور زمین سیاہ سخت کریدر رہی تھی۔

الف کچھ دیر ہانپتا رہا۔

خندق تو تیار ہی کرنا ہے۔ پانی نکالنا ہی پڑے گا۔ لیکن پلکوں سے کدال تو نہ اٹھے گی۔ اگر کوشش کروں تو نہ کھدی ہوئی چٹانوں تک پہونچ سکتا ہوں۔۔۔ وہ گھسٹتا ہوا چٹان تک پہونچا اور کتے کی طرح زبان نکال کر چٹان چاٹنے لگا۔

تھک جاتا تو رک کر پھر ہانپنے لگتا اور زبان تازہ لہو۔ سرخ گلابی ٹپکانے لگی۔

سور تیزی سے زمین کھود رہی تھی۔ کتا خاموش اسے گھور رہا تھا۔

کیوں۔۔۔ واپس جانے کی سوچ رہے ہو۔۔۔؟

الف نے گھبرا کر گردن ہلائی۔ نہیں۔۔۔ میں بھاگ کہاں رہا ہوں۔ خندق کھود رہا تھا۔ ہاں بھاگوں گا کیوں۔۔۔ کیوں واپس جاؤں۔

الف کی زبان سے خون بہہ رہا تھا۔

کتا خاموشی سے اپنا بھیانک جسم اٹھائے الف کی طرف بڑھا۔ الف گڑگڑانے لگا۔ نہیں۔ نہیں۔۔۔ وہیں رکو۔ بھاگوں گا نہیں۔۔۔!!

کتا بڑھتا رہا۔۔۔

الف نے آنکھیں بند کر لیں اور زبان باہر نکال کر ہانپنے لگا۔ کتا آ کر اسکے پہلو میں

بیٹھ گیا۔ اور تھوتھن سے اس کا جسم کریدنے لگا۔ پھر یکایک الف کے پیر کا زخم چاٹنے لگا۔ اس نے سکون سے آنکھیں کھول دیں۔

آرام مل رہا ہے۔ شاید ورم بھی کم ہو رہا ہے۔ الف نے پیار سے کتے کے جسم اور اسکی زبان سے ٹپکتے ہوئے لعاب کو دیکھا۔

کتنا خوبصورت کتا ہے —؟؟

سور بھی جھکی جھکی الف کے قریب آگئی۔

کتا اپنی سرخ بھیگی ہوئی زبان سے الف کی سرخ بھیگی ہوئی خونین زبان چاٹنے لگا اس کی بھاپ الف کو اپنے چہرہ پر بھاتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ ابخرات دھواں دھواں۔ بھیگے ہوئے ابخرات۔ ڈوٹتے ابھرتے حباب حباب۔

کہیں یہ کتا، سور — ماں باپ تو نہیں ہیں؟؟ بے چین ہو کر تلاش کرنے نکل پڑے ہوں — چہ۔ چہ — دونوں کو کتنا خیال ہے؟؟

چہ۔ چہ — آؤ۔ آؤ — پوچ۔ پوچ — ماں باپ۔ تم اندھے ہو۔ تم روتی ہو۔ نہ رو۔ پوچ — میں تمھارے لئے پھول لاؤں گا۔ ویسا ہی گھر بناؤں گا — آؤ۔

الف ان دونوں سے لپٹ کر رونے لگا —

الف کی نظریں چٹانوں کی طرف اٹھیں۔ اخاہ۔ یہ تو اب گرنے ہی والی ہیں۔ بہت چاٹ ڈالا انھیں نے۔ اس نے جھک کر چٹان پر ٹکر ماری تو وہ لرزنے لگی۔ ہوں۔ اس کی پشت کے سارے مناظر بھی دکھائی دینے لگے ہیں۔

سیاہ سرخ پھیلی ہوئی وسیع و عریض چٹانیں۔ سیاہ نیلی۔ سیاہ سبز۔ سیاہ زرد۔ جن کے پیچھے وہ ستار لئے ہوئے پری کھڑی ہے۔ اپنے اڑن کھٹولے کے پاس۔ سیاہ زرد — کتنی اداس ہے۔ کیا میں اسے اشارہ کروں؟ وہ بیکار کھڑی ہے۔ آتی کیوں نہیں۔ میں منع نہیں کروں گا۔ کیا وہ کتا سور سے خوف زدہ ہے۔ یا مجھے نہیں دیکھ رہی ہے؟؟

الف کو محسوس ہوا جیسے پری کے لباس کے نیچے پیر سے سر تک کچھ کلبلا رہا ہو۔ پھر لباس میں سے جھانکنے لگا ہو۔ ناگ۔ لاکھوں ناگ — سیاہ زرد۔ زرد۔ زرد — جن کی دو شاخہ زبانیں لپک لپک کر پری کے جسم کو چاٹ رہی تھیں۔ ارے یہ کسی دن دھوکہ میں اسے ڈس ہی نہ لیں —؟ پری تو خود ہی قید ہے مجھے کیسے نجات دلائے گی؟ بیچاری قیدی —

یں ہی اسے نجات دلاؤں — کاش آزاد ہوتا تو ان ریزوں پر ہی سہی۔ کچھ نشانیاں تو مقرر کر لیتا۔ بعد میں دماغ پر تصویر بنا لیتا — رسی۔ سانپ۔ سور۔ کتا۔ گھر۔ باغ۔ چٹان۔ زخم۔ پری۔ ناگ۔ ناگ — اس نے دانتوں سے ریزے اٹھائے اور پلکوں سے نشانیاں مقرر کر کے ریزوں کو منہ میں بھر لیا۔

اور محسوس ہوا کہ چٹانیں پھر اصلی حالت پر واپس آ رہی ہیں۔ اس نے لپک کر پھر انھیں چاٹنا چاہا تو پری دھند میں اشارہ کرنے لگی۔

بھاگ نکلو۔ بھاگ آؤ۔ ان ناگوں سے بچاؤ۔ سیاہ زرد۔ مر اڑن کھٹولہ خراب ہو گیا ہے۔

الف کو لگا کہ اگر وہ کوشش کرے تو رسی کے بل کھل سکتے ہیں۔ اس نے کن انکھیوں سے کتے۔ سور کی جانب دیکھ کر اپنے جسم کو حرکت دی۔ تو رسی کے بندھ ڈھیلے ہو کر الف کے پیروں پہ گر پڑے۔ ناگ۔ سیاہ۔ زرد۔ اس کا دل دھڑک رہا تھا۔ گھبرا کر اس نے کتے اور سور کی جانب دیکھا۔ دونوں دروازہ کے پاس اونگھ رہے تھے۔ بھاگ نکلوں۔ گ۔ نکلوں۔ کلوں۔ لوں۔ ں۔

الف کتا سور کو پھلانگتا ہوا غار کے دروازے سے تیر کی طرح نکلا۔ پری چیخی — میں ادھر ہوں — الف بھاگتا رہا۔

ایک تیز کربناک چیخ الف کے حلق سے آزاد ہوئی۔ اور وہ کتا سور کی جانب دیکھنے لگا۔

الف خاموشی سے ریزوں کو سجانے لگا۔ انخرات۔ نرم و نازک۔ جاب — ہا — پانی کہیں نہیں ہے۔ ظالم آسمان سب پی گیا۔ بکاؤلی کا پھول کہیں نہیں ہے۔ خندق۔ ہا — آسمان۔ پانی ہی نکال سکتا۔

الف کی داہنی جانب سور بیٹھی تھی۔ کمینی غلیظ بدبودار پھولی ہوئی بدذات سور — اور گردن کی پشت پر کتا زبان نکالے ہوئے ہانپ رہا تھا۔ غصہ ور بھیانک۔ لالچی۔ ہیبت ناک کتا۔

☐

قطمیر اور ہوا

(شہریار کے نام)

جیسے ہی وہ میرے کمرے میں داخل ہوا مجھے ایسا لگا جیسے اک سایہ بھی اس کے ساتھ ہی کمرہ میں داخل ہوا ہے۔ ایک اچٹتی سی نظر اس پر ڈالتے ہی میں نے نیچے نظر دوڑائی، فرش سپاٹ تھا۔ میں نے کنکھیوں سے میز کے نیچے دیکھا — پھر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔

میں یہ معلوم کرنے آیا ہوں کہ کیا آپ لوگوں نے شہر کے قدیم مقبروں کا کوئی سروے کرایا ہے۔

مجھے ایک نامعلوم سی خنکی کا احساس ہوا۔

جب میں اس سے باتیں کرنے لگا تو مجھے اچانک لگا جیسے کوئی سایہ نیچے سے مجھے دیکھ رہا ہے۔ سیاہ کتے کا پورا ہیولیٰ تیز چمکیلی روشن آنکھیں اور پتلی کمر، اب میں اسے واہمہ سمجھنے پر تیار نہ تھا اس لئے باقاعدہ اچک کر اس کے پیروں کی طرف دیکھنے لگا۔ کتا — لیکن کتا نہیں تھا۔

اس نے کنکھیوں سے میری طرف دیکھا اور کچھ کبیدگی سے بولا: میں دراصل بہت ڈسٹرب ہوں۔ کیا آپ اور کسی طرف متوجہ ہیں۔

جی نہیں۔

میں — میرا مطلب ہے — میں مریض ہوں۔ میں دس سال بعد اچانک اب کچھ سوچنے لگا ہوں۔ کچھ آواگون کا یا ٹیلی پیتھک مسئلہ ہے۔ میں کچھ قوتوں کے ذریعہ ڈائرکٹ کیا جاتا ہوں جو مجھے بہت پراگندہ کر دیتی ہیں۔ مجھے تین سال تک لوگوں نے نشے کی حالت میں رکھا ہے اور پھر دوسروں کے حوالے کر دیا ہے۔ میں ان سب سے بہت خوفزدہ ہوں۔ میں کچھ سوچنا چاہتا ہوں

لیکن میں اچانک بے بسی سے ان کے ہاتھوں میں چلا جاتا ہوں اور میرے بجائے وہ سوچنے لگتی ہیں۔ نہ جانے کن جانوں کی باتیں یا دداشتیں جیسے وہ سب میرے پچھلے جنموں سے تعلق رکھتی ہوں۔ کیا میں صورتاً بہت بُرا آدمی نظر آتا ہوں ــــ؟

میں پوری طرح اسی کی طرف متوجہ تھا کہ مجھے پھر ایسا لگا جیسے کرسی کے پاس کوئی شے آہستہ سے متحرک ہوئی ہے۔

لیکن میں اچانک ہی بُرا آدمی بن جاتا ہوں۔ ذہن کے کسی گوشہ میں برائی کا خیال باقی رہتا ہے، میں اپنے آپ کو اس سے باز نہیں رکھ پاتا ہوں۔ بس میری سب سے بڑی اذیت یہی ہے۔

نہ جانے کون سی منفی قوتیں ہیں جو آہستہ آہستہ ہلکے دودھیا بادل کی طرح مجھ پر قبضہ جماتی چلی جاتی ہیں پھر آہستہ آہستہ وہ دودھیا بادل پھٹنے لگتے ہیں۔ جگہ جگہ سے زخم کی طرح رستے ہوئے سے۔ پھر مجھے اندر اور باہر ہلکی ہلکی پھریری سی محسوس ہونے لگتی ہے۔ جیسے کوئی آہستہ آہستہ سرگوشیاں کررہا ہو۔ یا صرف سانسوں کا دباؤ ہو پھر وہ سرگوشیاں بڑھنے لگتی ہیں اور میں اپنے ہر حصہ سے آوازیں، سرگوشیاں، باتیں، تقریریں سسکیاں اور چیخیں محسوس کرنے لگتا ہوں۔ ان میں نہ چاہتے ہوئے بھی گھر جاتا ہوں۔ ان سے بھاگنا چاہتا ہوں لیکن بے بس ہو جاتا ہوں اور مجبوراً کسی گوشے میں جاکر چھپ جاتا ہوں۔ عجیب سی تکلیف وہ سرسراہٹ سارے جسم میں محسوس ہوتی رہتی ہے، آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر میں گردوپیش دیکھتا رہتا ہوں پھر گھبرا کر باہر نکل آتا ہوں۔

اچانک ہی مجھے ایک بالکل ہی نرالی اجنبیت کا احساس ہوتا ہے۔ میں اسے الفاظ میں شاید واضح کر ہی نہیں سکتا۔ کچھ عجیب سی اجنبیت۔ جیسے میں انھیں پہچانتا بھی ہوں اور وہ اجنبی بھی ہوں۔ مثلاً یہ کہ یہ چبوترہ اچانک یہاں کیسے آگیا۔ یہ گلی اکھڑی ہوئی کیوں ہے۔ یہ، یہ مکان ــــ یہ اس طرح تو نہ تھا۔

گوشہ سے نکلتا تو اُٹھ اُٹھ کر شہر کا چکر لگانے لگتا۔ کبھی لگتا جیسے سارا شہر ویسے کا ویسا ہی تو ہے۔ یہ بڑا تالاب، یہ کملا پارک، یہ کوتوالی، یہ ابراہیم پورہ۔ لیکن اچانک ہی مجھے لگتا کہ یہ کوئی عجیب سا نرالا اور اجنبی شہر ہے جہاں میں پہلی بار اپنا پہلا قدم رکھ رہا ہوں۔ یہ ــــ یہ کیا ہے؟ یہ کون سی جگہ ہے؟ اسی لمحہ مجھے ایسا لگتا جیسے ابھی تک میرے ساتھ کوئی تھا۔ سمی ــــ لیکن اچانک ہی بغیر بتائے ہوئے سمی اچانک میری بغل سے غائب ہو گئی ہو۔ اور میں اسے وہیں، کہیں آس پاس

گھبر اگھبر اکر تلاش کرنے لگتا ہوں۔ ارے — ارے، ابھی تو یہیں تھی بالکل میرے پاس۔ جب آنکھ اٹھاتا تو ایک لمحہ کے لئے اتنی شدید اجنبیت کا احساس ہوتا کہ میں گھبر اکر لوگوں کے چہرے دیکھنے لگتا لیکن وہ سب کے سب اجنبی لگتے۔ میں کہاں ہوں، اب تک کہاں تھا؟ یہ درمیانی لمحہ میں نے کہاں گذارا لیکن اس لمحہ کو میں تلاش نہ کر پاتا اور پھر نہ جانے کیسے میرے قدم ایک بالکل ہی اجنبی سے راستے کی طرف اٹھتے رہتے۔ چہرے، دوکانیں، موٹر، آوازیں لیکن ہر شے کی شناخت کھو چکی ہوتی تھی — ایک عجیب سی اجنبیت لیکن اندر ہی اندر کہیں یہ احساس بھی پوشیدہ رہتا کہ یہ سب کچھ جانا پہچانا ہے۔ جب پہلی نظر اٹھ کر کسی پر پڑتی تو پہلا جھٹکا ہوتا — اجنبی، نامعلوم۔ لیکن

میں اپنے کو پھر اسی گوشہ میں پاتا۔ یہ کیا ہے۔ میں اچانک یہاں کیسے آگیا۔ یہاں کون رہتا ہے۔ یہ کمرہ، کتابیں، ریک، اسٹوو، ہیٹر، میز، تخت، تصویر، تھرماس، ٹیپ ریکارڈر، لحاف، تکئے، کلنڈر، ہولڈال، ٹرنک، سوئچ، دواؤں کی شیشیاں، اٹیچی، بریف کیس۔ یہ سب کس کے ہیں۔ یہاں کون رہتا ہے۔ ابھی میرے ساتھ کون تھا۔ میں کون ہوں — پھر اچانک ہی لگتا جیسے کوئی پرانا منظر ابھی ابھی اچانک ہاتھ سے پھسل کر یہیں کہیں گر پڑا ہے۔ میں گھبر اگھبر اکر اُسے تلاش کرنے لگتا ہوں۔ سہمی سہمی۔ اندھے کی طرح سے ٹٹولتا ہوں تو سگریٹ کے ٹکڑے، ماچس، کاغذات ہاتھ میں آجاتے ہیں لیکن سارے لمس اجنبی ہی لگتے ہیں۔ میں بہت دسٹرب ہو جاتا ہوں، بہت پریشان — کسی سے کچھ پوچھنے کی بھی ہمت نہیں پڑتی ہے۔ آوازیں سارے جسم سے اٹھتی ہیں اور میں گھبر اگھبر اکر سارا کمرہ روندڈالتا ہوں۔ ارے ساتھ کا سارا وقت گذر گیا ابھی تو میں اس سے کچھ کہہ ہی نہ سکا تھا۔ اپنے بارے میں کچھ بتا ہی نہ سکا تھا۔ ابھی تو اس کے سامنے صرف غلط رخ ہی آیا تھا۔ نہ جانے اب وہ کہاں ہے؟

در اصل اس سے میری انانیت مجروح ہوتی ہے — کہ گویا — کہ گویا — اب کچھ ہی دیر بعد میں خود کچھ نہ رہ جاؤں گا۔ اب میں خود کچھ نہیں رہ گیا ہوں۔ بس ایک شدید اور ناموس اجنبیت رہ گئی ہے۔ میں خود اپنے آپ کو مضحکہ خیز لگتا ہوں۔ کبھی لگتا ہے جیسے میری ناک سکڑ گئی ہو۔ کبھی میرا چہرہ طبوترہ ہو جاتا ہے اور کبھی میرا اوپر کا دھڑ سمٹ جاتا ہے اور نچلا دھڑ بڑھنے لگتا ہے۔ کبھی کبھی محسوس ہوتا ہے کہ نہیں سب کچھ تو ویسا ہی ہے۔

میں جن لوگوں میں رہتا ہوں پہلے ان لوگوں سے خوفزدہ تھا کہ کب وہ اپنا دھاگہ کھینچ لیں۔ اب وہ سب کے سب مجھ سے شدید خوف زدہ ہیں۔ اب وہ مجھ سے یہ نہیں کہہ پاتے ہیں کہ

میں وہاں سے کہیں چلا جاؤں پہلے وہ مجھ سے امیدیں رکھتے تھے اب مجھ سے ڈرتے ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ وہ سب اچانک بزدل ہو گئے ہوں۔

پہلے ایسا نہیں ہوتا تھا لیکن اب جیسے ہی رات آتی ہے میرے سارے جسم میں ایک عجیب سی اینٹھن ہونے لگتی ہے ایسا لگتا ہے جیسے میرے سینے پر کوئی گرم گرم بھاپ چھوڑ رہا ہو۔ اسے آہستہ آہستہ سہلا رہا ہو۔ پھر مجھے اپنے زانوؤں پر عجیب سی پھریری سی محسوس ہوتی ہے اور میں طرح طرح کے دھندلے اور نیم واضح تصورات میں کھو جاتا ہوں۔

بہت دور دریا کے کنارے کچھ لوگ غسل کر رہے ہیں، وہیں رات کو ایک لنڈ منڈ ملکھوے کے درخت پر ایک عورت الٹی لٹکی ہوئی ہے اور اس کی چھاتیاں نیچے زمین سے کوئلہ اٹھا کر بھوجپتر پر کچھ بنا رہی ہیں۔ نیچے کچھ دور پر ایک سادھو بیٹھا ہے کہ اچانک اس کا عضوِ تناسل بڑھنے لگتا ہے پھر ایک رتھ پر ایک دوسری عورت آجاتی ہے۔ عورت نہیں مرد۔ نہیں کچھ بھی نہیں۔ صرف بادل ہیں، ان میں سے ایک سیاہ — بہت سیاہ رنگ کا چیتا — نہیں کتا — یا بلی — یا صرف سایہ — باہر نکلتا دکھائی دیتا ہے۔ اس کے ہاتھ میں تلوار ہے۔ تلوار نہیں بانسری ہے۔ یا کچھ بھی نہیں ہے۔ میں اچانک ان سب سے گھبرا کر دعائیں گنگنانے لگتا ہوں۔ عجیب سی نامانوس زبان کی دعائیں۔ اچانک محسوس ہوتا ہے کہ یہ دعا نہیں ہے کوئی رسوائی نغمہ ہے اور میں اپنی بیکسی پر جھنجھلانے لگتا ہوں۔ بس اتنا ہی شعور مجھے باقی رہتا ہے۔ پھر نہ جانے کیسے میں کمرہ سے نکل کر ایک دوسرے کمرے میں چلا جاتا ہوں وہاں ایک تازہ کھدی ہوئی قبر ملتی ہے اور میں — ......

میرے اصل گھر کے بالکل سامنے ایک پیپل کا درخت تھا اس کے نیچے بہت سے چھوٹے چھوٹے پتھر رکھے تھے ایک پتھر کچھ زمیں تند کی شکل کا تھا جس پر کچھ آس پاس کی عورتیں صبح کو آکر سرخ رنگ کا ٹیکا لگا جاتی تھیں۔ دھیرے دھیرے میں ان کی آنکھوں کا حجاب دیکھنے لگا تھا۔ جیسے وہ نہ چاہتے ہوئے بھی اس زمیں تند پر ٹیکا لگا رہی ہوں یا پھر بہت زیادہ خواہش مند ہوں۔ یعنی کہ دن رات اس پر ٹیکا لگاتی رہیں۔ جوان لڑکیاں ٹیکا لگانے میں زیادہ جھجکتی تھیں۔ بوڑھیاں اس طرح جھک کر ٹیکا لگاتیں جیسے اب یہ ان کے لئے کوئی خاص بات نہ رہ گئی ہو یا دہی — اپنی کھٹاس ختم کر بیٹھا ہو۔ میں سوچتا اچانک ایک رات طوفان میں یہ درخت گر جائے تو کتنا اچھا ہو۔ بالکل وہی سوچ اب بھی جاری ہے۔ جاگتے میں تو سب کچھ مجھے

بہت اچھا اور اہم دکھائی دیتا ہے ۔۔۔

یو۔ این۔ او، فلسطین، ویٹ نام، انگولا اور بنگلہ دیش۔ عمارات، ڈیم، راکٹ، اپولو اور سوئیز۔ لیکن اچانک ہی میں دعا مانگتا محسوس ہوتا ہوں کہ یہ شہر، یہ سارے مناظر۔ یہ گوشہ سارا سب کچھ تباہ ہو جائے تو ۔۔ کتنا مزہ آئے۔ میں اکثر اپنی اس سوچ سے بہت عاجز ہوتا جاتا ہوں۔

رات ہوتے ہی میں اچانک گھر سے نکل پڑتا اور چپ چاپ کئی سیڑھیاں اتر کر ایک تہہ خانے میں داخل ہو جاتا۔ تہہ خانے میں داخلے سے پہلے میرے ہاتھوں میں کہیں سے ایک جلتی ہوئی شمع سی آجاتی۔ نیچے چند نفوس خاموشی سے بیٹھے اپنے سامنے کی دیواروں پر ہلکی ہلکی لرزش دیکھا کرتے۔ کونوں میں مکڑی کے جالوں کے درمیان سفید سفید چکتے خاص طور سے بہت نمایاں رہتے۔ ایک طرف کچھ ٹوٹی ہوئی کرسیاں، میزیں، لوہے کی زنگ کا پنجر اور زمین کھودنے کے کچھ اوزار اور اس کے ساتھ تصویروں کا ایزل جس پر پنسل اسکیچ سے ایک دھندلی سی تصویر نظر آجاتی۔ کبھی کبھی شک ہوتا کہ یہ تصویر میری ہی ہے۔ کرسیوں پر بیٹھے ہوئے لوگ تھوڑی دیر تک مجھے گھور گھور کر دیکھتے اور پھر احتجاج میں اپنے پیر تھپتھپانے لگتے۔ میں جب ایک خالی کرسی پر بیٹھ جاتا تو میرے سامنے ایک لاش دکھائی دیتی۔ گھبرا کر جب میں دوسروں کو دیکھتا تو ان کے سامنے بھی ویسی سبز پوش لاشیں دکھائی دیتیں۔ پھر وہ سب دھیرے دھیرے لاشیں ہاتھوں پر اٹھائے زینوں سے ہو کر باہر آجاتے اور خاموشی سے ایک طرف چلنے لگتے۔ ان کے ساتھ اچانک ہی بالکل خاموشی سے کچھ مشعل بردار بھی آجاتے۔ سناٹا گہرا ہوتا جاتا اور لاش برداروں کے چہروں پر آہستہ آہستہ تشنجی احتجاج ابھرنے لگتا ۔۔۔

سنّاٹا اتنا گہرا ہوتا کہ ان کے قدموں کی چاپ بھی نہ سنائی دیتی۔ لیکن راستہ میں اگر کوئی درخت کا پتّہ بھی ٹوٹتا تو چٹ کی آواز ہم سب سُن لیتے تھے۔ مجھے شروع سے آخر تک یہ احساس رہتا کہ میں جبراً ان لوگوں میں پھنسا ہوں اور یہ لاش بھی جبراً مجھ پر لادی گئی ہے تبھی اچانک مجھے بہت شدید بھوک سی محسوس ہوتی۔ لیکن واپسی میں مجھے لگتا جیسے برگد کے بہت سے پتّے میرے پیچھے ٹوٹتے چلے آرہے ہوں چٹ چٹ۔ مڑ کر دیکھتا تو ایسا لگتا جیسے ایک سیاہ سے کتّے کی پرچھائیں میری طرف چلی آرہی ہو۔ کتّا ۔۔ یا چیتیا ۔۔ یا کچھ نہیں۔

پیپل کے عین داہنی طرف بالکل بغل میں ایک سرکنڈوں اور مٹّی کی خاکستری کٹیا تھی۔ کٹیا کے باہر ایک بالکل سیاہ رنگ کا نیم غنودہ کتّا بیٹھا رہتا تھا ۔۔ سارا دن ۔۔

رات میں اچانک چاروں طرف چٹ چٹ کی آوازیں اُبھرنے لگتی تھیں۔ میرے بزرگ دیکھتے سے کہتے۔ شاید وہ باہر نکلا ہے ــ ہاں شاید ــ صبح مجھے کتا پھر اسی جگہ دکھائی دیتا۔ میں اکثر اپنی چھت کی جھرّیوں سے اسے دیکھا کرتا تھا۔ دیکھتے دیکھتے لگتا جیسے کتا وہاں سے غائب ہو گیا ہو۔ بالکل غائب۔ پھر مجھے چھت پر بالکل اپنے پاس چٹ چٹ کی آواز سنائی دینے لگتی۔ میں گھبرا کر پلٹ کر دیکھتا ــ تو مجھے کچھ نظر نہ آتا ــ سامنے دیکھتا تو کتا پھر اسی جگہ لیٹا دکھائی دیتا۔

ایک صبح نہ صرف میں نے بلکہ تمام بزرگوں نے بھی دیکھا، کتا اپنی جگہ سے سچ مچ غائب تھا اور کٹیا کے گرد بہت سے لوگ بانس اور لکڑی کے ٹکڑے کے لئے بہت اہم چہرہ بنائے گفتگو کر رہے تھے۔ کبھی کبھی کسی کی آواز بلند ہوتی تھی لیکن الفاظ سمجھ میں نہیں آتے تھے۔

اسی کے کچھ دن بعد سے لوگ اچانک ہی مجھ سے خوف زدہ رہنے لگے تھے۔ تین سال تک مجھے متواتر نشے میں رکھا اور دس سال تک میں بیمار رہا۔

اب مجھے صرف اپنے دوہرے پن سے نفرت ہے یا اکتاہٹ ہے۔ یہ بھی مجھے ابھی محسوس ہوا ہے کہ در اصل میری سوچ میری ہے ہی نہیں بلکہ میں تو DIRECT کیا جا رہا ہوں۔ اور مجبور ہوں۔ لوگ کہتے ہیں کہ میرا کمرہ جو انھوں نے خوف زدہ ہو کر میرے لئے مخصوص کر دیا ہے ایک قبر سے مشابہ ہے اور میں اکثر اسی میں لیٹا ہوا پایا گیا ہوں۔ یا پھر انھیں ایک سیاہ رنگ کا کتا سا بھی دکھائی دیا ہے ــ یا چیتا ــ یا ــ نہیں کچھ بھی نہیں۔

ہمیں چلتے چلتے بہت دیر ہو چکی تھی۔ مزاج میں کچھ سودائیت آتی جا رہی تھی۔ کبھی کبھی ایسا لگتا جیسے سیدھے کھڑے درخت اچانک زمین کی طرف جھک کر ڈھیرے ڈھیرے بڑھتے جا رہے ہیں، کبھی سمٹ کر جھاڑی سی بن جاتے ہیں۔ ساگون کا بے ڈھنگا پن مجھے کبھی بھی پسند نہ تھا۔ نہ ہی جنگلی بیر کے درختوں سے مجھے خوشی ہوتی۔ لیکن اچانک ہی جب ان جھاڑیوں پر کچھ دوسری لپٹی ہوئی بیلیں دیکھتا تو بس ایک لمحہ کے لئے وہ اکتاہٹ ختم سی ہو جاتی۔

ابھی تک تو صرف پتھریلی زمین یا پہاڑیاں ہی تھیں لیکن اب اچانک تھوڑی سی ریتیلی زمین شروع ہونے لگی تھی۔

میں نے اس سے پوچھا ــ آخر وہ خاص قبرستان ابھی کتنی دور ہے۔ وہ کچھ جھجکا اور سر جھکا کر زمین کی طرف دیکھنے لگا ــ پھر ادھر ادھر نظر دوڑائی۔ یہ سارا راستہ ہی

ایک کھائی نما راستہ تھا۔ دونوں طرف جنگلی بیروں کی جھاڑیاں اور ان سے لپٹی ہوئی سیاہی مائل یا سبز کچھ بیلیں ـــ دراصل ہم ٹارچ لانا بھول گئے ہیں۔ ورنہ میں یہ راستہ نہ بھولتا وہ اصل راستہ اتنا چوڑا کبھی نہیں تھا۔ ایک پتلی سی اوبڑ کھابڑ لکیر ہی اس طرف گئی ہے۔ ہمیں اسی پر چلنا تھا۔ آؤ پھر واپس چلیں۔

وہ مڑا تو مجھے محسوس ہوا جیسے ایک سیاہ سا ہیولی بھی اس کے ساتھ ہی مڑا ہو۔ میں نے جلدی سے مڑ کر دیکھا ـــ نہیں اس کے پیچھے کچھ نہیں تھا۔ میں تو سارے راستے ہی وہم سے مڑ مڑ کر دیکھتا آیا ہوں ـــ کیا ملا ـــ کچھ ہے ہی نہیں تو ملتا کیا۔ کچھ نہیں ہوگا۔ اب ہم ایک بہت پتلے اور تاریک راستے سے جھاڑیاں اور بیلیں ہٹا ہٹا کر آگے بڑھ رہے تھے۔ ریتیلی زمین میں پیر پھنس جاتے موذی کر کرانے لگے تھے۔

کئی اچانک اور اندھے موڑوں کے بعد ہم قدرے واضح جگہ پہونچے تو سامنے ہی ایک شکستہ لوہے کا جالی دار دروازہ نظر آیا۔ باہر ہی سے میں نے دیکھا۔ سامنے ایک بہت اونچے درخت کے نیچے انگارے دہک رہے تھے اور اس کی عین بغل میں ایک پھوس کی کٹیا سی تھی۔

کوئی بات نہیں یہ مسجد ہے۔ میں نے مڑ کر دیکھا تو پھر ایسا لگا جیسے ایک سیاہ سا دھبہ اُچک کر ادھر اندھیرے کی طرف گیا ہو۔

اندر داخل ہو کر ہم خاموشی سے ایک سمت بڑھنے لگے۔ احاطہ کی ساری زمین نم تھی۔ کچھ گڑھوں میں ذرا ذرا سا پانی بھی جمع تھا۔ اِدھر اُدھر گھاس تھی درمیانی راستہ پر ہم ذرا بچ بچ کر بڑھتے رہے کہ اچانک ہی بائیں طرف ایک اُبھری ہوئی سی سفید چادر نظر آئی۔ اس کے پاس چند بیلے کے پھولوں کے ہار۔ ایک اوندھا ہوا مٹی کا گھڑا۔ اور کچھ خالی کوزے رکھے تھے۔

وہ میری طرف خاموشی سے دیکھتا رہا۔ پھر اس قبر کی طرف بڑھا۔ اسی وقت میں نے دیکھا کہ اس قبر کی بالکل بغل میں ایک اور کھدی ہوئی قبر تیار ہے۔ تہہ کیا ہوا سفید کپڑا، مٹی کا گھڑا، بیلے کے ہار۔ اور کچھ کوزے ایک طرف رکھے ہیں ـــ وہ قبر کے کنارے بیٹھا رہا۔ پھر آہستہ سے قبر میں اتر گیا۔ مجھے لگا جیسے ایک سیاہ سا دھبہ ـــ اچک کر قبر سے دور ہٹ گیا ہو ـــ بس اب تم جاؤ۔ بہت بہت شکریہ ـــ خدا حافظ۔

پتھریلی زمین پر واپس آتے ہی مجھے لگا جیسے بالکل میرے پیچھے یا عین بائیں بغل کے پاس کچھ چٹ چٹ بول رہا ہے۔ □

یا مصطفےٰ ۱

دانی اور وِنایک نے الفاظ اور ان کے معانی ایجاد کئے اور ہری کے وجود سے یہ دنیا حقیقی نظر آئی۔ جیسے ہم رسّی کو سانپ سمجھ لیں۔ عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے۔ فضول فضول بے معنی۔ ہم کائنات۔ پیدائش اور موت کے سمندر کے اس پار کب دیکھ سکتے ہیں۔ ہم سے پہلے تو سب کچھ عدم تھا۔ ہم نے پیدا ہوتے ہی اسے فوراً کے فوراً تخلیق کر لیا تھا۔ سلسلۂ روز و شب نقش گرِ حادثات۔ وشنو کا چہرہ کبھی کبھی ہاتھی جیسا ہو جاتا ہے۔ بالکل ہاتھی جیسا۔ شمس تبریز ناچنے لگتے ہیں۔ اے شمس تبریز مجھ پر اپنا رحم کرو۔ رات ہر شے کو مسخ کر دیتی ہے ہمیں رات سے بڑا بڑا ڈر لگتا ہے۔ گیدڑ چلاتے ہیں اور دور سے کتّوں کے مسلسل رونے کی آوازیں آتی رہتی ہیں۔ قبرستانوں میں بجّو نئی قبریں کھٹر کھٹر کھودا کرتے ہیں۔ بھوت بدروحیں اور مسان کھوپڑیاں جمع کرتے ہیں اور عفریت ان کھوپڑیوں کو ساز کی طرح بجاتے ہیں۔ "چلی کون سے دیس گجریا تو سج دھج کے"۔ چڑیلیں ان کی تال پر ناچا کرتی ہیں اور درندے گھومتے رہتے ہیں۔ اور بڑی بے رحمی اور طنز سے قہقہے لگاتے ہیں ـــــ جب وہ چلتے ہیں تو پتیاں کھڑکھڑاتی ہیں اور دماغ تھرّایا کرتا ہے۔ رات جو ننگی کھڑی رہتی ہے اس کی ناف سے شلوار کھسکتی جاتی ہے کھسکتی جاتی ہے۔ رات جو آم کے درختوں پر سناتی ہے پیپل کے پتے تالیاں بجاتے ہیں۔ اور رات جو چٹانوں پر کروٹ لیتی ہے۔ اور رات جو بی۔ڈ ی۔ ڈلہ ہے۔ اور رات اور رات ـــــ سلسلۂ روز و شب اصل حیات و ممات۔ پچھل پائیاں اپنی ایڑیاں اٹھائے دروازہ دروازہ جھانکتی ہیں اور اگیا بیتال ساری رات چھتوں پر قہقہے لگاتے ہیں۔ فضول فضول فضول۔

گھوڑے آسمانوں کو اپنی ٹاپوں سے اُڑا دیتے ہیں۔ راہ کی دھول اُوپر بنی کھڑکیوں کی درازوں سے گندہ کر چہروں پر جم جاتی ہے اور انھیں کر کرا بنا دیتی ہے۔ جو ادبجاتا کے نشانوں کی مانند ان کے دروازے خاموش کھڑکھڑاتے رہتے ہیں۔ قسم ہے ان گھوڑوں کی جن کا رنگ سیاہ تھا۔ اور جن کی ٹاپوں سے سارا فلک کانپ رہا تھا۔ قسم ہے ان گھوڑوں کی جن کے سُم چٹانوں کو توڑ رہے تھے اور قسم ہے ان گھوڑوں کی جن کی ٹاپ سے چنگاریاں نکل رہی تھیں اور رات کی سیاہیاں۔ رات کی سیاہیاں۔ ہائے رات کی سیاہیاں۔

وہ گھوڑا بالکل سیاہ رنگ کا تھا۔ اس کے کولھے بالکل چکی کے دوپاٹ کی طرح ہل رہے تھے۔ گھوڑے کی گردن کے تمام بال کھڑے ہوئے تھے۔ اس کے تمام جسم پر پسینہ، پیلا بدبودار پسینہ چمک رہا تھا۔ گھوڑے کے جسم کے تمام بال بالکل تنے ہوئے تھے اور بھینچے ہوئے جبڑوں سے سفید جھاگ نکل رہا تھا۔ گھوڑے کے دانت بھینچے ہوئے تھے اور ٹاپوں سے چٹانیں ٹوٹ رہی تھیں۔ گھوڑا قبرستان کی چہار دیواری کو پھلانگ کر قبرستان میں دوڑ رہا تھا۔ قبروں سے اُڑتی ہوئی دھول بگولوں کی طرح اس کے جسم سے لپٹ رہی تھی اور نیچے ہڈیاں چٹاخ چٹاخ ٹوٹ رہی تھیں۔ گھوڑا پورے قبرستان میں چمک رہا تھا۔

چاروں طرف یخ بستہ کیچڑ پھیلتی جا رہی تھی —— وہ ایک رات ضرور میرے تابوت کو کھول لے گا۔ اور وہ جو بہت سیاہ بہت طاقتور ہے۔ اس کی جلد راتوں کو چمکنے لگتی ہے۔ اور منہ سے ہر وقت بدبودار جھاگ نکلا کرتی ہے وہ مجھے نہ چھوڑے گا۔ بس اور زیادہ برف کہاں سے لاؤں میں اب تھک چکا ہوں۔

لاحول ولاقوۃ۔ درد کہاں نہیں ہے۔ بس ذرا نظر کو موڑ و۔ کون قنوطی نہیں۔ اس کونے کے پیچھے ادھر اُدھر۔ بس ذرا سوچنے کی عادت ڈالو۔ بھینس نہ بنو۔ کبھی تم نے کسی حیوان کو خودکشی کرتے دیکھا ہے۔ تم جب مجبور ہو جاؤ تو خودکشی کر لو۔ بھئیں کوئی نہ روکے گا یہ روز روز تابوت سجانا۔ فضول فضول۔ بے معنی۔ سارا سب کچھ فضول۔ سارا سب کچھ ویسا ہی ہے جیسا تمہارے مایوس ہونے سے پہلے تھا۔ سب کچھ بہت چمکیلا اور روشن ڈالی ہرے ہرے پات ہرے ہیں کم کم باد و باراں ہے ہشت بالکل بے معنی۔ لیکن گھوڑا ......؟ تابوت سجانے سے کیا فائدہ۔ صبح پھر چمیلی کے پھولوں کا ڈھیر رہ جائے گا۔ کالا پتھر اسی طرح شہ نشیں پر رکھا رہے گا۔ اور پیپل پر بیٹھے جھاڑیں تمام آنے جانے والوں کو دیکھا کریں گے۔

یشیخ سدّو کا لڈو۔ وہ دیکھئے مولانا روم ستون کے ارد گرد ناچ رہے ہیں حسام الدین ان کا کرتا کھینچ رہے ہیں۔ شمس تبریز ملتان کی اور چلے۔ گلہری اُڑتی جا رہی ہے۔ اس کی دُم میں ہاتھی۔ ہاتھی پر بیٹھے سرمد۔ سرمد کے ہاتھ میں لہو بھرا سر۔ اور سر سے آواز آ رہی ہے فضول فضول۔ بے معنی۔ سب کچھ واہیات۔ تک دم دل لک لپک ڈگی۔

یہ سب میں کیا لکھ رہا ہوں۔ کیوں لکھ رہا ہوں کہاں سے کوئی اچھوتا قصہ لاؤں۔ اور پڑھنے والوں کو طلسم ہوشربا کے طلسمات دکھاؤں۔ یا شہنشاہ عیاران آؤ۔ کوئی بات بناؤ۔ کہاں ہیں ملکہ بہار مخمور و براں۔ الفاظ کے طلسم اب اپنا ناطہ توڑ رہے ہیں۔ کہاں ہے وہ سرو قد سیم تن لڑکی جسے میرا انتظار کرنا چاہئے تھا۔ میرے لئے کون دھوپ میں کھڑا انتظار کر رہا ہے۔ مجھ سے اپنی محبت کی جذباتیت بیان کرتے جھجک رہا ہے۔ میرے لائے ہوئے سیب چرا کر کھا رہا ہے۔ میری رخصت کے وقت کس کی آنکھیں سرخ ہوں گی۔ کون ہے۔ کہاں ہے۔ کہیں نہیں۔ کوئی نہیں سب کچھ فضول فضول بے معنی۔ وہ شخص مٹی کے تودوں کے اس پار سے برف کی سلیں جمع کرنے میں لگا ہے۔ کسے اتنی فرصت کہ جانے کہ کون کتنی رعنائیاں چھوڑ چکا ہے اور دن رات دن رات۔ دن رات۔ سلسلۂ روز و شب تار حریر دو رنگ فضول فضول بے معنی۔

مٹی کے تودوں کو نیچے سے چیونٹیوں نے بالکل کھوکھلا کر دیا تھا۔ وہ صبح سویرے ہی اس تودے کے اس پار سے برف کی بڑی بڑی سلیں کاٹتا اور پھر اپنی پیٹھ پر لاد کر مٹی کے تودے کے اُوپر سے گذر کر تابوت کے قریب لاتا۔ برف پگھلتی تو چاروں طرف یخ بستہ کیچڑ پھیلنے لگتی اور بے معنی پن جاری رہتا ــــ سارا جسم سن رہتا۔ اور برف کی سلوں کا ڈھیر لمحہ بہ لمحہ اونچا ہوتا رہتا اور جسم تمام احساسات سے عاری ہو جاتا۔ کون ہوگا۔ کیسا ہوگا جس کی میں نے تلاش کی دکیوں میں نے تلاش کی۔ بے معنی۔ فضول ــــ) رشتے ناطے کب گرمی پہونچاتے ہیں۔ (کیا ہوگی گرمی۔ بے حسی اچھی ہے۔ میں مطمئن ہوں۔ بالکل مطمئن) چہرہ بالکل سپاٹ ہو جاتا اور آنکھیں صرف بے معنی پن ظاہر کرتیں۔ داستوں میں تالیاں بجتیں۔ شور بڑھتا تمام آنکھوں میں چمک بڑھتی۔ لیکن برف کی بے حسی آنکھ بند کئے رہتی۔ کتنا خوبصورت صحرا ہے۔ ہمارے یہاں بھی ایک صحرا تھا۔ سرسبز و شاداب۔ لیکن میں محفوظ ہوں۔ خوش اور مطمئن۔ ہوا اور خون میرے جسم میں موجود ہے ــــ بے معنی کھیل جاری رہتا ہے۔ تم سب اپنی اپنی شہ رگوں کو چھو کر دیکھو جس کی شہ رگ نہ ہوئی وہ چور رہی

گھوڑا بنے گا۔ گھوڑا...... (پھر آگیا گھوڑا کمبخت)

لیکن میں لکھنا چاہتا ہوں۔ اپنے لئے روشنی لانا چاہتا ہوں۔ اندرہ کا حال مجھ سے زیادہ کون جانتا ہے۔ ہر طرف بکھری ہوئی رنگینیاں رعنائیاں۔ دل کی روشنی میں صرف ایک محل ابھرتا ہے۔ اور ساری دنیا بالکل تاریک —— دنیا آباد ہو یا ویران میرا کیا لینا دینا۔ میں مطمئن اور خوش ہوں۔ میرے جسم میں خون اور ہوا دونوں موجود ہیں۔ رات آہستہ آہستہ اپنی کنواری چھاتیاں مسل رہی ہے۔ اس کی ریشمی شلوار اس کے پھولے ہوئے پیٹ سے نیچے آرہی ہے۔ ابھی اس میں سے گھوڑا نکلے گا۔ سیاہ اور خوفناک۔ غصہ اور قہر و غضب سے تنا ہوا گھوڑا۔ اس کا سارا شریر پسینے سے بھیگا ہوگا اور اس کے بھینچے ہوئے پیلے دانتوں سے سفید جھاگ نکل رہا ہوگا —— گھوڑا دوڑے گا تو ٹاپوں سے چنگاریاں نکلیں گی اور راہ کی دھول بگولوں کی طرح اس کے جسم سے لپٹ جائے گی اور پھر پسینوں کے قطروں سے مل کر جگہ جگہ گرتی جائے گی۔

رات جو ایک تحیہ ہے۔ رات جو ملکہ تاریک تسکل کش ہے۔ رات جو ایک عیارہ ہے اور رات جو دروازہ در دروازہ جھانجھ بجاتی ہوئی بدارواح کی طرح غلیظ اور ہیبت ناک ہے وہ رات ہم سے دن بھر کا سجایا ہوا تابوت چھین لے گی اور ہمیں گھوڑوں کے سموں میں ڈال دے گی۔ ہم تو مطمئن تھے کہ ہم نے دن بھر میں برف کا ایک ڈھیر جمع کر لیا ہے وہ ہم سے ہمارا برف کا ڈھیر چھین لے گی۔ اور گھوڑا —— ؟

وہ ایک کونے میں بیٹھا کانپ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں اس کے چہرے سے بالکل الگ لگ رہی تھیں۔ جذبات سے عاری سپاٹ آنکھیں۔ عرصہ ہوا جب اس کی آنکھوں سے چمک غائب ہوگئی تھی۔ اور چہرے سے تمام احساسات کی لکیریں معدوم ہوگئی تھیں۔ بے حس۔ ٹھس چہرہ اور بے معنی دھندلی آنکھیں۔

کہاں سے لاؤں وہ واضح تبدیلی، انقلاب جو رات کی رات سب کچھ الٹ پلٹ ڈالے۔ کون سا تجربہ کروں کہ ایک دھماکے سے سب کچھ اچانک بالکل ختم ہو کر بالکل نئی صورت حال پیش کر دے۔ میں تو خود ہی اپنے بارہ سال کے تپ کا اسیر ہوں۔ چھوڑ دینا کون سی بڑی بات ہے واضح تبدیلی ناممکن ہے لیکن تبدیلی کو برداشت کر سکوں گا —— ؟ اگر پھر پچھلے منظر کی تلاش ہوتی تو اور نہ ہو۔ فضول بے معنی۔ یہ مٹی کے تودے برف اور گھوڑا اب میری عادت بن گئے ہیں

اور میں مطمئن ہوں کہ بارود کہیں نہیں ہے کہ میرے اطمینان کو ایک دھماکے سے اڑا دے۔ اب جو ہوگا دیکھا جائے گا۔ یہی نا کہ بقیہ ساری زندگی پھر برف کی سلیں توڑتے گذرے گی چلو یہی سہی میں خوش اور مطمئن ہوں کہ میرے جسم میں ہوا اور خون موجود ہے۔ لیکن ــــ لیکن میں کیا کروں کہاں سے بارود بچھانے کی جرأت لاؤں۔ کہ اچانک ایک پل میں سارا پچھلا حساب صاف کر دوں اور سب کو سزا دے سکوں ــــ میں کسی کو سزا نہ دے پاؤں گا۔ اور کنواری بچھائیوں کو منہ میں لے کر جہاں زاد جہاں زاد کرنے لگوں گا پھر شکست خوردہ سا جھنجھلا تا رہوں گا کہ واضح تبدیلی نہیں لا سکتا۔ انقلاب نہیں لا سکتا۔ بارود نہیں بچھا سکتا۔

تم جس حکومت سے نا مطمئن ہو اسکے تمام افراد کو گولی مار دو۔ ہائے کیسے گولی ماردوں کہ میں ایک چھوٹا سا افسانہ نگار ہوں۔ جب علامہ اقبال کسی کو مرد مومن نہ بنا سکے تو میں کیسے انقلاب لاؤں گا۔ کاش میں ڈاکو بن جانے کی جرأت رکھتا۔ اے کاش میں کسی ڈاکو کے گھر میں پیدا ہوا ہوتا۔ تو راتوں رات گھوڑے کی پشت پر سوار سیکڑوں میل تک دھاڑا ہوتا۔ چمکیلی ریت میں جنگ کرتا جنگلوں اور پہاڑوں میں ٹارزن کی طرح آواز نکالتا ہوا کودتا رہتا۔ اور ــــ میرا سیاہ رنگ کا گھوڑا میری آواز کا منتظر رہتا۔ اور واضح تبدیلی۔ لیکن یہ گھوڑا ــــ (ارے پھر وہی گھوڑا) کہاں آئی واضح تبدیلی۔ لاؤ واضح تبدیلی۔ لاؤ واضح تبدیلی ورنہ میں اپنا سر پٹک کر مر جاؤں گا۔

قمر احسن تم بڑے عجیب و غریب ہو۔ تمھیں مسرت ذرا مشکل سے ہی ملے گی اس لئے کہ تم بزدل ہو اور تمھیں مخصوص مسرت کی تلاش ہے۔ جو کہ محض فریب تصور ہے عارضی بہاؤ کا تنکا۔ آدمی جب بالکل تنہا ہوتا ہے اور خلا آہستہ آہستہ اپنے پنجے گاڑنے لگتی ہے تو سب کچھ بے معنی سا ہو جاتا ہے۔ سارا بارہ برس کا تپ اور درد برس کی غلاظت۔ بے معنی فضول فضول۔

پر کاش فطری کا خط آیا۔ میں آج کل ستنی برا ٹھا کو ختم کر کے اسٹین بک کے پیچھے پڑا پڑا ہوں۔ تم ایسا HAPPY GO LUCKY شخص ایسے افسانے کیسے لکھ لیتا ہے۔

صادق نے لکھا۔ تو تلخ لکھنے والا شخص خود کیوں اتنا پریشان ہے ......

مرزا بول رہے ہیں یا خلد و ساقی اے جذب ستی۔ یا ٹکڑے ٹکڑے دامان ہستی۔ اور میں لکھ رہا ہوں۔ فضول فضول سب کچھ بے معنی ــــ کہ کوئی بھی تخلیق (افسانہ ہو یا نظم) عشق اور گھٹن اور تنہائی اور بے حسی کی اصل ضروریات پورا نہیں کر سکتی۔ نہ ہی اس کے اصل مفہوم کو ظاہر کر سکتی ہے۔ ہمارے ہی لفظ خود ہمارے مقاصد سے نا آشنا اور نابلد ہوتے ہیں۔

میں مکمل طور پر کبھی کسی کو نہ چاہ سکوں گا کہ یہ تمام مدت میں نے خود اپنے معانی اور مفاہیم کی تلاش میں گذار دی ہے۔ جھنجھلاتے۔ مسکراتے۔ بے حسی کا تابوت اٹھائے سلگتے اور پگھلتے ہوئے۔ فضول۔ فضول۔ فضول۔

گھوڑے کا تنا ہوا جسم قبرستان میں گونج رہا تھا۔ فوں۔ فوں۔ ٹاپ۔ ٹاپ۔ اس کی سموں کے نیچے ہڈیاں ٹوٹ رہی تھیں۔ کڑ۔ کڑ۔ کڑ۔ چٹ۔ چٹ ——— پیپل کے پیڑ پر بیٹھے عفریت کھوپڑیوں کو ساز کی طرح بجا رہے تھے۔ "اجی ہاں! بوٹے ہر گلی میں پروردگار رہے ٹہے بوٹے ہر گلی میں ہاں۔ بارہ بنکی میں۔ جی۔ بارہ بنکی میں آ ——— !" آ گیا بتیاں گھوڑے کے آگے آگے چمک چمک کر قہقہہ لگا رہے تھے۔ گھوڑے کے تمام مساموں سے پسینہ کے قطرے ٹپک رہے تھے۔ اس کی گردن کے بال تنے ہوئے تھے اور پٹھے باہر ابھر آئے تھے۔ اس کے بھینچے ہوئے جبڑوں سے سفید جھاگ فوں۔ فوں۔ کے ساتھ اڑ رہے تھے۔ پچھل پائیاں اسے ہاتھوں میں روک کر مانگ میں بھر رہی تھیں ——— وہ گھوڑا تیر کی طرح دوڑتا ہوا ایک تازہ قبر تک آیا۔ اور شدید غصہ میں قبر پر ٹاپ مارنے لگا۔ دھول اڑ اڑ کر اس کے جسم پر چپکتی جا رہی تھی۔ گھوڑے کے بھینچے ہوئے غلیظ دانت رات میں چمک رہے تھے ——— فوں فوں کی غضبناک آواز پورے قبرستان میں گونج رہی تھی۔ جیسے ہی قبر کے تابوت کا پہلا تختہ نظر آیا۔ گھوڑا زور سے ہنہنایا۔ ہیں۔ ہیں۔ ہیں۔ ہیں ں ں ں۔ اور اپنے چوڑے دانتوں کے ایک ہی حملے سے تختے کو نوچ کر پھینک دیا۔ پھر قبر کے چاروں طرف گھوم گھوم کر ٹاپ مارنے لگا۔ ٹاپ۔ ٹاپ۔ فوں۔ فوں۔ ہیں۔ ہیں۔ ں ں ں۔ پھر اچانک ہی وہ اپنا اگلا پیر توڑ کر تابوت پر جھک گیا ——— اور اندر سے تلوار چلنے کی آواز آنے لگی ——— گھوڑا گھبرا گھبرا کر منہ باہر نکالتا۔ اور پھر غضبناک ہو کر۔ فوں۔ فوں کر کے تابوت میں منہ ڈال دیتا۔ اچانک ایک بار گھوڑا زور سے ہنہنایا (پیپل پر عفریتوں نے کھوپڑیاں زور سے بجائیں) اور آدھے دھڑ سے تابوت میں کود پڑا۔ جب باہر نکلا تو اس کے جبڑے میں ایک خوبصورت، کسرتی، جوان سا، بازو دبا ہوا تھا۔ جسے دانتوں میں دبائے گھوڑا پورے قبرستان میں چکر لگانے لگا۔ ٹاپ۔ ٹاپ۔ ٹاپ۔ ٹاپ۔ کڑاک کڑاک۔ کڑاک۔ پھر اپنے سموں سے اس بازو کو روندنے لگا۔ ہیں۔ ہیں۔ ہیں۔ ں ں ں۔ فوں۔ فوں۔ پھر ادھڑے بازو کو زور سے ٹھوکر مار کر قبر کی طرف دوڑا۔ اور ہنہنا کر اس نے اپنا پورا جسم قبر میں انڈیل دیا۔ باہر نکلا تو اس کے دانتوں بالکل ویسا ہی دوسرا بازو دبا ہوا تھا۔

گھوڑے نے انتہائی غیظ میں قبر پر ٹاپیں ماریں۔ اور دندناتا ہوا قبرستان میں ایک سمت دوڑا۔ دونوں بازوؤں میں گھوڑے کے مکروہ دانت دھنسے ہوئے تھے۔ دونوں ہاتھ باہر جھول رہے تھے۔ ان پر خاک کی تہوں کے علاوہ ہلکا زرد سا جھاگ بھی پھیلتا جا رہا تھا۔ گھوڑے نے پھر ہنہنا کر ٹاپ زمین پر ماری تو چنگاریاں اڑنے لگیں —— گھوڑے کے پٹھے رکاب میں پھنسے تھے۔ دونوں بازو بھینچے ہوئے چوڑے دانتوں میں جکڑے ہی جکڑے گھوڑا قبرستان کی چہار دیواری پھلانگ گیا۔

شاید جو باتیں میں کہنا چاہتا ہوں وہ بہت گمبھیر اور اہم ہیں۔ میرا فنی اظہار بہت کمزور۔ اسی لئے میں افسانوی پیچ و خم میں کھو کر رہ جاتا ہوں اور الجھ کر بے بسی سے دیکھا کرتا ہوں۔

□

ابابیل

ایک سناہٹ سی کمرہ میں اُبھری اور میری آنکھ کھل گئی۔ پہلے تو کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ پھر اچانک کمرے میں تیزی سے اُڑتی ہوئی ابابیل دکھائی دی۔ میں گھبرا کر اُٹھ بیٹھا۔

میں سنبت ۲۰۹۸ داسوین (کنوار) ۷، کی ڈائری لکھ رہا تھا کہ پہلی بار کمرہ میں مجھے وہ نظر آئی تھی۔ بے تحاشا اڑتی ہوئی اور سناہٹ سارے کمرہ میں گونج رہی تھی۔ روشندان اور کھڑکیاں کھلی ہوئی تھیں۔ پہلے تو میں انتظار کرتا رہا کہ وہ خود ہی کھڑکی یا روشن دان سے باہر چلی جائے لیکن وہ کمرہ کا چکر لگاتی رہی۔ پہلے کچھ بلندی پر اڑتی رہی پھر آہستہ آہستہ نہ صرف اس کی پرواز کی تیزی کم ہوتی گئی بلکہ وہ بہت آہستہ آہستہ بلندی سے نیچے کی طرف آتی گئی۔ زیادہ نیچے آتے ہی اس نے پھر ایک بار کوشش کی اور ذرا بلندی پر اُڑنے لگی۔ میرا دل چاہا کہ اب اوپر کی کسی بھی جگہ پر رُک کر سُستا لیتی تو اچھا تھا لیکن چھت بالکل سپاٹ تھی۔ کوئی کارنس نہ کڑی۔ وہ لڑکھڑاتی پھر نیچے کی طرف چلی۔ اسی وقت میری نظر کرسی کے نیچے چھپے ہوئے بلّے.... گڈو پر پڑی۔ سارے پنجے سمیٹے غیر متحرک۔ گڈو کرسی کے نیچے بیٹھا تھا۔ بس اس کی دُم میں ہلکی سی لرزش تھی۔

گڈو کو بچپن سے میں نے بہت سنبھال کر پالا تھا۔ بہت عرصہ تک صرف دودھ، پھر اس میں چاول کے کچھ دانے ملا کر دیتا رہا۔ پھر آہستہ آہستہ اسے بغیر ابلے ہوئے نرم چھیچھڑے دیئے جانے لگے۔ گوشت کی بو پر اچانک ہی اس کے حواس جاگ اٹھتے تھے۔ پہلے تو وہ چونک کر انگڑائی لیتا ہوا باسکٹ کے نرم بالوں سے باہر جھانکتا پھر غرانے لگتا اور آہستہ آہستہ اس کی غراہٹ تیز ہونے لگتی تھی۔ کسی اجنبی کے سامنے اس کی اس حرکت پر اکثر مجھے ایک نامعلوم سی شرمندگی ہوتی تھی اور

میں حتی الامکان اسے سوتے ہی رہنے دیتا۔ پہلے اس کی آنکھوں میں بے معنی سی دھندلاہٹ
پھنسی رہتی لیکن آہستہ آہستہ اس کی شیشے کی گولیوں جیسی آنکھوں میں چمک بڑھنے لگی تھی اور
چمک کے ساتھ ہی غراہٹ کی آواز بھی بدلتی گئی تھی۔ میں غیر محسوس طریقہ سے اس سے ایک
کراہیت یا لاشعوری نفرت محسوس کرنے لگا تھا۔ گھر کے افراد کو سمجھانے لگتا کہ اسے اپنے سے
دور رکھیں اس لئے کہ اس کے بالوں میں طرح طرح کے جراثیم پوشیدہ ہوتے ہیں مثلاً ٹی۔ بی۔
ضیق النفس اور قولنج وغیرہ۔ پھر میں نے اور گھر کے افراد نے بھی یہ محسوس کرنا شروع کر دیا کہ
اسے بھی مجھ سے ایک خوف یا نفرت ہونے لگی ہے جس پر اکثر میں کھسیا بھی جاتا تھا۔
اس سے پہلے بھی ابابیل کئی بار اس کمرہ میں گھونسلہ لگانے کی کوشش کر چکی تھی لیکن
ناکام ہوئی تھی۔ پھر بھی اس کی کوشش جاری تھی۔ میرا سامنا پہلی بار آج ہی ہوا تھا۔
نیچے آتے ہی اس نے ایک بار پھر اوپر اٹھنے کی کوشش کی۔ تیزی سے پروں کو پھڑ
پھڑایا پھر بھی اُوپر اٹھی اور کھڑکی کے سامنے چکرانے لگی۔ اسے یاد رکھنا کہ میری محبت اور نفرت
دونوں بہت شدید ہوتی ہیں لیکن میری انا ان سب سے شدید تر ہے۔ میں نے تمھیں پہلے ہی
آگاہ کر دیا تھا کہ تمھیں ایک بدترین شکست کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اور میں نے یوں ہی.....
اسی وقت ابابیل پھڑپھڑاتی ہوئی میز پر رکھی کتابوں سے آٹکرائی۔ گڈو نے کرسی کے
نیچے سے چھلانگ لگائی لیکن میرا ہاتھ اس کے پنجوں سے پہلے ہی ابابیل کو دبوچ بیٹھا تھا۔
مجھے ابابیل سے ایک نامعلوم خوف محسوس ہوتا تھا جیسے یہ مجھے کبھی کسی وقت بھی
نقصان پہونچا دے گی یا جیسے کہ یہ بہت پہلے سے میری دشمن ہو اور مجھے بھرے مجمع میں ذلیل
کرانا چاہتی ہو۔ بس ایک نامعلوم خلش میں مبتلا رہتا۔ شام ہوتے ہی باہری کھنڈر سے
سیں سیں چرچڑک کی آوازیں اُبھرنے لگتیں اور میں گھبرا کر کہیں دور نکل جاتا۔
کبھی کبھی باتوں میں اس کا ذکر نکل آتا۔ اس کے پیر بہت نرم اور کمزور ہوتے ہیں۔
یہ کبھی کہیں بھی بیٹھ نہیں پاتی۔ ہمیشہ سروں پر منڈلایا کرتی ہے۔ سروں پر —؟ ہاں —!
اس کی کمر بہت پتلی ہوتی ہے اور گردن کے نیچے ایک سفید دھبہ ہوتا ہے — اس کے پَر
بھی تمام پرندوں کی طرح نہیں ہوتے۔ ایک بار بچپن میں یہ تمھاری قمیص کے پچھلے کالر سے
آکر چپک گئی تھی۔
میری قمیص کے کالر سے —

ہاں ــــ!

پھر میں دہشت سے چیخ پڑتا یا کانپ اُٹھتا تھا۔

اور ہوتے ہوتے بات ابرہہ تک جاتی۔ پھر مور اور کبوتر پر کچھ دیر ٹھہر کر موسم پر آجاتی۔

صبح رحل پر قرآن دیکھتے ہی میرا دل سب سے پہلے پارۂ عم کی سورتوں میں ایک سورۃ تلاش کرنے لگتا ــــ اور پھر گھبرا کر آموختہ پر آجاتا ــــ

"یہاں کہیں ابابیل تو اُڑتی ہوئی نہیں آئی تھی ــــ"

جب کسی کو چیچک نکلتی تو میں کسی نہ کسی سے یہ سوال ضرور کرتا۔ یا یہ کہ میں نے ہمیشہ یہ محسوس کیا کہ جہاں بھوسہ رکھا ہوگا وہیں کہیں آس پاس ابابیل کا گھونسلہ ضرور ہوگا۔ حالاں کہ اس ربط کا کوئی جواز نہیں تھا۔ پھر بھی میں نے ۸۰ فی صد اسی واہمے کو صحیح پایا۔

چیچک۔ ابابیل۔ بھوسہ ــــ

میں نے ابابیل پر ہاتھ رکھا ہی تھا کہ سارا جسم تھرتھرا اٹھا۔ گڈو کی آنکھیں پے بہ پے اپنا رنگ بدلنے لگی تھیں اور مجھے ایک خوفناک دہشت کا سا سنا تھا۔ دو انگلیوں میں پھنسا کر میں نے اسے اُٹھایا۔ ہم دونوں ہانپ رہے تھے۔ تیسری انگلی کا کمر پر دباؤ پڑا ــــ ہاں کمر بہت پتلی ہے۔ اچانک ہی اس کی آنکھوں نے رنگ بدلا۔ گہری سفید۔ گہری سُرخ بیاہی مائل ــــ حلق پر ایک سفید دھبہ اور بہت کمزور پیر۔ یہ کہیں نہ بیٹھ پائے گی۔ گڈو کی غراہٹ آہستہ آہستہ تیز ہوتی جارہی تھی اور ابابیل میری دو انگلیوں میں پھنسی تھی۔ ایک ذرا سی ہمت اور گڈو کی غراہٹ ختم۔

میں اسے ہاتھوں پر لئے سوچتا رہا پھر گڈو کو کمرہ سے نکال دیا۔ کھڑکیاں روشندان بند کر کے میں نے اسے اُچھالا۔ وہ پھر میز کی کتابوں پر گر پڑی۔ کیا اب یہ اڑ بھی نہ پائے گی؟

جلتی دوپہر میں کمرہ سے باہر نکل آیا اور کھلی فضا میں دیر تک انگلیوں میں دبائے کھڑا رہا پھر اسے اچھال دیا۔ کچھ دور پر پڑے اینٹوں کے ڈھیر پر وہ گر پڑی تو میں نے جلدی سے منہ پھیر لیا۔ اب اگر گڈو اسے منہ میں دبالے تو ہی اچھا ہے۔

ابابیل وہیں پڑی رہی دونوں پر پھیلائے۔ پھر میں گھر میں گھس کر گڈو کو باہر اُٹھا لایا اور چپکے چپکے ابابیل کی طرف اشارہ کرنے لگا۔

ایک کوا کودا اور اُچکتا ہوا ابابیل کی طرف دوڑا اور اس کی گردن پکڑنے کی

دوبار کوشش کی تیسری بار اُسے کمر سے پکڑ کر اوپر اٹھا اور سامنے والے مکان کی دوسری سمت اُڑ گیا۔ (سمی کاش تمھیں خوف نہ ہوتا یا تم میں اڑ سکنے کی ہمت ہوتی تو تمھیں میرے موہوم انتقام سے بھی خوف زدہ ہونے کی ضرورت نہ پڑتی۔

اب اس سرزمین سے معجزے غائب ہو گئے ہیں کہ میں تم سے مل سکنے کی بابت سوچوں۔ اچھا ہوا کہ تم مجھ تک نہ آسکیں ورنہ میں تمھیں کچھ بھی تو نہ دے پاتا۔ یہاں بس کچھ مناظر رہ گئے ہیں جنھیں اکثر تنہائی میں تلاش کر کے.....)

یہ دوسری دہشت تھی جو میرے دل میں سمائی تھی۔ میں دیر تک گڈو کو ہاتھ کے سخت دباؤ سے سہلاتا رہا۔

دل کی دھڑکن بڑھتی جا رہی تھی۔ کمرہ میں آکر میں نے پھر ڈائری کھولی اور جملہ پورا کرنے لگا" تمھارے جسم اور رگ وپے میں بھر دیا ہے۔ اس کی تلخی ابھی تم برداشت کر لو گے لیکن جب یہی خشک ہو کر کانٹا بن جائے گی تو اس کی چبھن تمھارے لئے ناقابل برداشت ہو گی اور تب میں بھی تمھارے پاس نہ ہوں گا۔ تم نے مجھ سے جو دشواس گھات کی ہے اس سے میرا سب سے بڑا نقصان یہ ہوا ہے کہ اب ہر قسم کے وعدوں سے اعتبار اٹھ گیا ہے۔

پھر لرزتی ہوئی آواز میں میں نے سب کو آگاہ کیا کہ ابابیل نے گھر دیکھ لیا ہے اور شاید گھونسلے کے لئے جگہ بھی تجویز کر لی ہے۔ اس سے ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے۔ اگر اس نے گھونسلہ مکمل کر لیا تو بڑی تباہی پھیلے گی۔

جب تک مجھ میں سوچنے سمجھنے کی قوت واپس آئے ابابیل دیوار کے کونے میں اپنے پنجے گاڑ چکی تھی۔ پہلے تو میں نے ہاتھ ہلا کر اسے اُڑانا چاہا۔ پھر بستر کی فیروزی چادر کھینچ کر کمرہ میں لہرانے لگا۔ ابابیل اسی طرح کونے میں سمٹی لٹکی رہی۔ کبھی کبھی وہ میری طرف دیکھتی تو ایسا لگتا جیسے ابابیل غرا رہی ہو یا اس کی آنکھیں نفرت سے سُرخ ہوتی جا رہی ہوں۔ میرا دل دہشت سے پھر لرزا۔ پھر مجھے ایسا لگا جیسے ابابیل خوف سے کانپ رہی ہے۔ بے چاری، میں نے چادر کا گولا بنا کر اُچھالا تو ابابیل نے پنجے دیوار سے نکال لئے اور پھر کمرے میں چکرانے لگی۔ میں نے جلدی جلدی سارے دروازے، کھڑکیاں اور روشن دان کھول دیئے۔ اور ابابیل کے ساتھ ہی گردن گھمانے لگا۔ وہ تھوڑی دیر تک چکراتی رہی پھر کھڑکی کی اوپری سلاخوں سے گذر گئی۔ میں نے جلدی سے جھانک کر باہر دیکھا ــــ میں خوف زدہ اپنے بستر پر سمٹ گیا۔

تھوڑی دیر بعد ابابیل پھر کمرے میں دکھائی دی۔ اس بار اس کی آنکھوں میں عجیب سی ضد تھی۔ ایک خوف زدہ ضد — وہ تیزی سے کمرہ میں چکراتی رہی اور رہ رہ کر اس کونے کی طرف جھپٹتی رہی۔ اسی وقت میری نظر اس کی چونچ میں پھنسے ایک تنکے پر پڑی۔ خشک، بھورا، چھوٹا سا نکیلا تنکا — میں نے گھبرا کر پھر چادر کا گولا اچھال کر زور سے شو شو کی آواز نکالی۔ گولہ ٹھیک ابابیل پر پڑا۔ میں جلدی سے کودا — اوپر کونے سے ابابیل غائب تھی۔ میں نے چادر کو دبوچ لیا۔ یقیناً ابابیل اس میں پھنسی ہوگی......

آہستہ آہستہ میں گولے کو کھولنے لگا کہ سناہٹ کی آواز گونجی۔ دیکھا تو ابابیل پھر اوپر چکرا رہی تھی — خالی چونچ — میں نے چادر پھیلادی — درمیان میں تنکے کی نوک چادر میں پھنسی ہوئی تھی — اوپر دیکھا تو ابابیل غائب ہو چکی تھی۔

باہر آکر میں نے پھر اعلان کیا۔ ابابیل نے گھر دیکھ لیا ہے۔ اس نے جگہ بھی تجویز کر لی ہے ابھی ابھی وہ تنکا لے کر آئی تھی اس سے ہوشیار رہو۔

کسی نے کہا اب بیکار ہے۔ وہ بہت ضدی اور ہٹ دھرم ہوتی ہے۔ اب اسے کوئی نہیں روک سکتا۔

لوٹ کر آیا تو دیکھا کہ ابابیل پھر اسی کونے میں چپکی ہوئی تھی اور گردن گھما گھما کر مجھے تلاش کر رہی تھی۔ میں خوف سے اسے دیکھتا ہوا بستر پر بیٹھ گیا۔ ابابیل پھیلی ہوئی چادر کو گھور رہی تھی۔ مجھے لگا جیسے وہ باقاعدہ انتظار کر رہی ہو کہ کب میں آؤں اور اس پر چادر کا گولہ پھینکوں۔

اچانک اس کا پنجہ دیوار سے پھسلنے لگا۔ اس نے پھر سنبھالا لے کر میری طرف دیکھا۔ اس کی چونچ میں ایک پر (شاید مرغی کا یا کسی اور پرندہ کا) پھنسا ہوا تھا۔ مجھے لگا جیسے عمداً اس نے وہ پر مجھے دکھلایا ہو اور پھر منتظر ہو کہ میں کب شو شو کر کے چادر اس کی طرف اچھالوں...

میرے دل میں خیال آیا، اسے مار ڈالوں۔ میں نے جلدی جلدی سارے کمرہ میں نگاہ دوڑائی۔ شاید گڈو کہیں ہو۔ پھر بڑی احتیاط سے دروازے کے باہر جھانکا۔ اگر گڈو کہیں آس پاس ہو تو اسے بلالوں اور چادر کے گولے میں پھنسا کر ابابیل کو نیچے گرا دوں۔ پھر کیوں نہ گڈو ہی اسے کھالے۔ میرا اپنا گڈو جسے میں نے بچپن سے پالا تھا۔ لیکن وہ آس پاس کہیں نظر نہ آیا۔ میں نے پھر اوپر دیوار کے کونے کی طرف دیکھا۔ ابابیل اسی طرح چپکی ہوئی میری ساری حرکتیں دیکھ رہی تھی۔

ٹھیک ہے مار ڈالو.... اب مار ہی ڈالنا چاہیئے خواہ کچھ ہو۔ میں نے ابابیل کی طرف دیکھتے ہوئے آہستہ سے دروازہ بند کیا پھر روشن دان کی رسیاں کھینچ کر روشن دان بند کر کے کھڑکی کی طرف بڑھا۔ کھڑکی پر ہاتھ رکھتے ہی ابابیل تیزی سے جھپٹی — میں ٹھٹھک کر پیچھے ہٹا — اوپر کی سلاخ پر بیٹھ کر وہ میری طرف مڑی — اور اچانک غائب ہو گئی۔

میں گھبرا کر باہر نکل آیا۔ کسی طرف سے آواز آئی — ہا — ہر دل میں ایک چراغ روشن ہے — ہر دل میں ایک کانٹا ہے — کون اسے باہر نکال سکتا ہے..... مجھے لگا جیسے کوئی کہہ رہا ہو — ہر کھڑکی پر ایک ابابیل ہے — کون اسے باہر نکال سکتا ہے۔؟

فوراً کمرہ میں واپس آ کر میں نے پھر سے تمام روشن دانوں کو جکڑ جکڑ کر بند کر کے کھڑکیاں بھی بند کر دیں — اور دروازہ بند کر کے باہر نکل آیا — اب میں شدت سے جھلایا ہوا تھا۔ ایک معمولی ابابیل — اور یہ اس طرح بار بار مجھے خوف زدہ کر رہی ہے۔ مجھے مار رہی ہے اور جلا رہی ہے۔ میرے خلاف عمداً سازش کر رہی ہے۔

میں نے سارے گھر میں گڈو کو تلاش کیا۔ پھر خیال آیا کہ یقیناً وہ کمرہ میں ہی کہیں چھپا بیٹھا ہو گا — میلے کپڑوں کے نیچے، کتابوں کے پیچھے۔ یا چارپائی کے پاس۔

کمرہ کھولتے ہی مجھے سناہٹ سنائی دی — گھبرا کر اوپر دیکھا تو ابابیل چکر لگا رہی تھی — میں نے روشن دان اور کھڑکیوں کی طرف دیکھا سب ویسے ہی جکڑے ہوئے تھے — دروازہ بھی میں نے یقیناً احتیاط سے کھولا تھا — پھر میری نظر دیوار کے نچلے کونے پر پڑی جہاں بہت سے تنکے، پر اور بالوں کے گچھے پڑے ہوئے تھے۔ ابابیں دیوار کے اوپر کونے میں چپکی ہوئی بڑے مزے سے میری طرف دیکھ رہی تھی — دہشت زدہ ہو کر میں نے کمرہ سے ہی نکل جانا چاہا کہ ابابیل اڑ کر روشن دان پر بیٹھی — پلٹ کر میری طرف دیکھا — مجھے لگا جیسے وہ مسکرائی ہو اور نہ جانے کیسے بغیر دراڑ کے روشن دان سے باہر نکل گئی — ہشت مسکرائی نہ ہو گی — وہم ہے۔ لیکن —؟؟

اسے مار ڈالنا ضروری ہے — میں نے اخبارات کے ٹکڑے کئے اور گوند سے روشن دان کی دراڑوں پر چپکا کر کھڑکی کی درازوں کو بھی بند کرنے لگا۔ دروازوں کے بازوؤں اور چوکھٹ پر بھی اخبار منڈھ کر میں مطمئن انداز میں کرسی پر بیٹھ گیا — اب ہوا اور روشنی کا بھی گذر ممکن نہ تھا — پھر میں نے میلے کپڑوں کا ڈھیر اٹھایا — کتابوں کی

ریک کے پیچھے دیکھا اور چارپائی کے نیچے نظر ڈالی ۔ گڈو یہاں نہیں تھا۔ کونے میں نظر پڑی تو وہی تنکوں، پروں اور بالوں کا ڈھیر نظر آیا۔

میں نے تمام روشن دانوں کھڑکیوں اور دروازوں کو سختی سے بند تو کر دیا تھا لیکن مجھے قطعی ان پر اطمینان نہ تھا ۔ وہ آئے گی ۔ نہ جانے کیسے۔ لیکن ضرور آئے گی اور یقیناً وہ اس ڈھیر کی طرف بھی آئے گی جسے اس نے متواتر محنت سے اس کونے میں جمع کیا ہے۔ اگر گڈو کو اس کمرہ میں بند کر دیا جائے تو امکان ہے ......!!

دروازہ کا پردہ گرا کر میں نے باہر سے سختی سے بند کر دیا۔ پھر گڈو کی تلاش میں چلا۔ باہر وہ بکریوں کو پنجے مار مار کر اچک رہا تھا۔ اسے دیکھتے ہی نفرت کا شدید احساس ہوا لیکن ضبط کر کے میں نے اسے اٹھالیا اور پسلیوں پر سخت دباؤ ڈال کر دروازہ کی کنڈی کھول کر میں نے اسے کمرہ میں پھینک دیا ۔ ساتھ ہی میری نظر چارپائی پر پڑی ۔ سارے بستر اور فیروزی چادر پر بے شمار تنکے ۔ پر اور بالوں کے گچھے پڑے ہوئے تھے ۔ پھر میز پر نظر پڑی اور وہاں سے ایک لمحہ میں سارے کمرہ کا چکر لگا آئی۔ ہر جگہ تنکے، پَر اور بال بکھرے ہوئے تھے۔

دہشت سے دروازہ کھلا چھوڑ کر میں کمرہ میں داخل ہو گیا۔ سارے روشن دان اور کھڑکیاں اسی طرح بند تھیں ۔ لیکن سارے کمرہ میں سیاہی مائل گرد کے چھوٹے چھوٹے دانے بکھرے ہوئے تھے۔ کونے والا بالوں، تنکوں اور پَروں کا ڈھیر اپنی جگہ موجود تھا۔

آخر یہ چاہتی کیا ہے۔ آتی کدھر سے ہے۔ کیا یہیں کہیں دبک کر بیٹھ جاتی ہے میں اب کتا نہیں رہ گیا ہوں کہ گرد جھاڑ کر اٹھ کھڑا ہوں۔ اب میں آدمی ہوں۔ سیاہی مائل گرد کے ذرے چپکے ہی رہیں گے۔ آخر اب انھیں کیسے دور کروں گا۔؟؟

اب دہشت کی جگہ شدید جھلاہٹ سوار ہوتی گئی۔ انھیں اب زندہ نہ رہنا چاہئے! کمرہ میں گڈو کو چھوڑ کر میں تیزی سے باہر آگیا ۔ اور چیخ اٹھا ۔ خبردار گھونسلہ نہ بن سکے ورنہ ساری زندگی نجات ناممکن ہو جائے گی۔ یہ خود ختم ہو جائیں گی لیکن ان کے گھونسلوں میں جمی ہوئی گرد کے اندر جراثیم پوشیدہ رہیں گے۔ انھیں اب یہاں سے جانا ہی پڑے گا۔

وہ کہیں اور چلی جائیں گی تو ۔ ؟ کسی نے کہا۔

جلنے دو ۔ "بلجیم" یا سعودی عربیہ۔ جہاں دل چاہے چلی جائیں۔ لیکن یہاں نہ

رہنے دوں گا۔ میرا انتقام بڑا ادھورا ہو گا۔ عام آدمی کی طرح نہیں۔ میں نے ہر ہر لمحہ اور ہر قدم پہ اپنی نشانیاں مقرر کر دی ہیں۔ کہاں تک بچو گے۔

میں نے ایک ہاتھ میں ادھر کے سوکھے پودوں کی جھاڑ تھامی اور ان کے گھونسلوں کی تلاش میں نکل پڑا۔ صبح سے شام تک ساری فضا میں سیں سیں۔ پھڑک پھڑک کی پھٹپھٹاتی آوازیں گونجتی رہیں ـــ اور مجھ پر خون سوار رہا۔

لیکن جو گھونسلے امام باڑہ میں ہیں ان کا کیا کرو گے ـــ؟

انھیں بھی نوچوں گا ـــ!

ارے امام باڑہ میں بھی ـــ؟

ہاں ـــ!

لیکن وہ اندر سے بند ہے۔

پروا نہیں ـــ!

میں نے ایک لمبے سے بانس میں پرانے میلے کپڑوں کو سُتلی سے کس کر باندھا پھر انھیں کروسین میں دیر تک ڈبوئے رہا۔ اب تمام گھونسلوں کو جلا ہی دوں۔ نہ گھونسلہ رہے نہ گرد۔ سارے انڈے بچے ہی ختم ہو جائیں (کیا یہ ممکن ہوگا؟ گرد بھی رہ گئی تو ـــ؟؟)

شام ہوتے ہوتے میں امام باڑہ تک پہونچ سکا۔ دروازہ کی جھریوں سے اندھیرے میں پہلے تو کچھ نظر ہی نہ آیا۔ پھر کچھ سوکھے ہوئے بانس کے پیڑ۔ ایک شکستہ سا منبر۔ کچھ پرانے زنگ خوردہ ٹین کے بکس دکھائی دیئے ـــ جھریوں سے چھت نظر نہیں آ رہی تھی ـــ میں لکھوری اینٹوں کی خالی جگہوں پہ پیر جماتا دروازہ پکڑے ہی پکڑے اوپر بانس کے روشن دان تک پہونچا۔

لاتعداد ابابیلیں پھڑک پھڑک۔ سیں سیں کر کے مجھے گھورنے لگیں۔ اچانک ہی میرا دل پھر زور سے دھڑکا۔ اور میں نے اس اکلوتے روشن دان میں ایک ہاتھ پھنسا کر بانس میں پھنسے ہوئے کپڑوں کو جلا دیا ـــ اور جلدی سے جلتا ہوا بانس امام باڑہ کی چھت سے لگا کر آنکھیں بند کر لیں۔

بسم کی گرد اور سیاہیوں کو جھڑ کر آہستہ سے کمرہ کھولا تو سامنے ہی میلے کپڑوں کے ڈھیر پر گڈو کو سوتا پایا۔ سارے کمرہ میں گرد، تنکے، پر اور بالوں کے گچھے بکھرے ہوئے تھے۔ اسی دم چارپائی کے پائے کے پاس نظر پڑی تو ایک ابابیل کے ننھے ہوئے خون آلود پر۔ کچھ ہڈیوں کے

ٹکڑے اور آنتوں کے ریشے دکھائی دیئے۔

سب صاف کر کے میں نے ایک طویل سانس لی اور سوتے ہوئے گڈو کو سختی سے گردن سے پکڑ کر بے دردی سے باہر اچھال دیا اور دروازہ کھلا چھوڑ کر باہر نکل آیا۔

خاصی دیر بعد کمرہ میں واپس لوٹا تو نظر اوپر دیوار کے کونے پر پڑی۔ کونے میں گھونسلہ مکمل ہو چکا تھا۔ اور فرش پر بے شمار گرد، تنکے، پر اور بالوں کے گچھے بکھرے ہوئے تھے

میں دہشت زدہ دروازہ میں باہر سے کنڈی لگا کر ہانپنے لگا۔ ▯

طلسمات

مہاجر آبی پرندوں کا ایک غول اُوپر سے گذرا تو عارف عبداللہ نے آسمان کی طرف آہستہ سے گردن اٹھائی اور کہا۔ "چلو سفر شروع کرو۔ چڑیوں کی قطار اُڑنے لگی ہے۔"

پھر وہ ذرا ہٹ کر دور گم ہوتی ہوئی قطاروں کو گھورنے لگا۔

مغربی ڈھلانوں سے آہستہ آہستہ سیاہی پھیلتی بڑھتی آ رہی تھی۔ پھر تینوں اُٹھ کھڑے ہوئے۔

"یہ شخص بالکل فضول ہے۔ کسی کام کا نہیں۔" ابوزید نے حسین پورنیہ کے کان سے منہ لگا کر کہا تو — حسین پورنیہ خاموش رہا۔

"تم نے کہا تھا کہ ایک مخصوص پہاڑی پر پہونچتے ہی اچانک بھک سے سارا شہر نظروں میں سمٹ آتا ہے؟" ابوزید نے حسین پورنیہ سے پوچھا۔

"ہاں —!"

"اچانک۔ بالکل اچانک۔ کتنا عجیب لگتا ہوگا — ہے نا؟" ابوزید سامنے دور تک دیکھتا ہوا بے چینی سے بولا۔ "مجھے ذرا پہلے ہی آگاہ کر دینا۔"

حسین پورنیہ، عارف عبداللہ کی طرف دیکھ کر خاموش رہا۔

ان کی پشت پر بندھا تھیلا خاصا وزنی ہوتا جا رہا تھا۔ اور وہ جیسے جیسے آگے بڑھ رہے تھے ویسے ہی ویسے قدم تھکتے جا رہے تھے۔ عارف عبداللہ راستہ میں کھانے پینے کی چیزوں کو عمداً ضائع کرتا آیا تھا۔ اور سرخ یاد انے دار پتھر، سیب اور گھونگھے۔ اسطوخودوس کے پودے، سیب اور بادام کے پھولوں کے ساتھ ہی ٹوٹے پھوٹے پیالے۔ ٹین کے پچکے ہوئے بہت سے ڈبّے جمع کرتا آیا تھا۔

"سنو! تمھارے تھیلے کی کھڑکھڑاہٹ بُری لگ رہی ہے۔ ذرا ہٹ کر چلو۔" ابوزید نے اُکتا کر عارف عبداللہ سے کہا۔

"اچھا ۔۔! چلو ٹھیک ہے۔ آنے والے منظر کے بارے میں سوچوں گا ۔۔" عارف عبداللہ بڑبڑاکر خاموش ہوگیا۔

منقش برتنوں اور ٹین کے ڈبوں کی کھنکھناہٹ کے ساتھ ہی پہاڑی پتھریلی زمین پر قدموں کی چاپ بڑی دیر تک گونجتی پھیلتی رہی۔

"آخر ہم نے یہ سفر کیوں اختیار کیا ہے۔ ہم تین کے کم ہو جانے سے وہاں کے مسائل پر کیا اثر پڑیگا۔ یا ہمیں اس سفر سے کیا ملنے والا ہے؟" ابوزید نے اپنے ساتھ چلتے ہوئے حسین پورنیہ سے پوچھا۔

"تم جانو۔ یا غور کرو۔ میں تو تم لوگوں کے کہنے سے ساتھ ہوا ہوں۔ ورنہ میرا کیا۔ میں تو کئی بار اس شہر تک آچکا ہوں۔"

میری کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ میں کیوں چل پڑا ہوں۔ یعنی یونہی خواہ مخواہ ۔۔ اچھا کیا واقعی وہ بڑا عجیب اور روشن شہر ہے" ابوزید نے بیزاری سے پھر سوال کیا۔

"ہاں ۔۔!

"لیکن مقصد کیا ہے۔ یعنی ہم وہاں پہونچ کر بھی کیا پائیں گے۔ یہ سارا وقت اور یہ تمام سب کچھ رائیگاں ۔۔ خواہ مخواہ تیار ہوا!"

"واپس ہو لو ۔۔!" حسین پورنیہ نے سامنے بڑھتے ہوئے اندھیرے کو گھورتے ہوئے کہا۔

"اب واپسی سے اچھا یہی ہے کہ دیکھ ہی لوں" ابوزید کے لہجہ میں خستگی اُچھلی تھی۔ "تم نے ہی تو کہا تھا کہ اچانک کسی پہاڑی سے وہ شہر جھک سے سامنے آجاتا ہے۔"

"ہو سکتا ہے" حسین پورنیہ نے ٹکا سا جواب دے دیا۔

"کیا مطلب؟ ارے۔ ابھی ابھی تم نے اپنی یہ بات دُہرائی ہے!"

"ہو سکتا ہے کسی مدہوشی میں کہہ گیا ہوں ۔۔!"

"کیا مطلب؟ یعنی تم بھی ۔۔؟"

"اچھا اس شہر کا نام کیا ہے ۔۔؟"

"تفلس ۔۔"

"چلو نام تو معلوم ہوا" ابوزید نے ایک طویل سانس کھینچی۔

پھر اس نے پکار کر عارف عبداللہ سے کہا "سنا۔ اس آنے والے شہر کا نام تفلس ہے۔"

"اچھا؟ کس آنے والے شہر کا ۔۔؟" عارف عبداللہ نے سرد اردی میں سوال کیا۔

"یہی جو ابھی بھک سے سامنے آئے گا۔"

"ہوگا — مجھے اس سے کیا — مجھے تو یہ سب بھی شہر ہی لگ رہا ہے۔ دیکھو درخت کی شاخیں اندھیرے کو محسوس کرتے ہی نیچے جھک آتی ہیں۔"

"چغد —" ابوزید نے جھلا کر کہا۔

"ہاں یہ بتاؤ کہ ہم نے یہ سفر کیوں اختیار کیا ہے۔ وہاں سے کیوں چلے ہیں —" ابوزید نے کچھ وقفہ کے بعد پھر پوچھا۔

"کہاں سے — ؟" عارف عبداللہ نے قدم بڑھاتے ہوئے اسی سے سوال کیا۔

"جہاں سے ہم چلے تھے —"

"کہاں سے ہم چلے تھے ؟"

"وہی پچھلا شہر —" ابوزید پھر جھلّایا۔

"کون سا پچھلا شہر — ؟ یعنی کیا تم بتا سکتے ہو کہ ہم نے کتنے پچھلے شہر اپنے پیچھے چھوڑے ہیں۔"

"نہیں — شاید بالکل نہیں —!"

"شاید تم نشانیاں مقرر نہیں کر سکے۔" عارف عبداللہ نے اس کی طرف مسکرا کر دیکھا اور ذرا سی بلند آواز میں بولا — "حسین پورنیہ نے اپنا کوڈ ایجاد کر لیا ہے۔"

"اچھا — ؟ ؟ — لیکن یہاں آنے کی کوشش کیوں کی ہے ؟" ابوزید نے پلٹ کر حسین پورنیہ سے دریافت کیا۔

"یہ بھی اسی سے پوچھ لو۔" حسین پورنیہ نے گڑبڑا کر کہا۔

"اچھی بات ہے —" ابوزید پھر عارف عبداللہ کی طرف پلٹ پڑا۔

وہاں شاید سازش تھی اور موت — بڑی اذیت ناک موت اور غلاظت کے ڈھیر۔ اونٹ اور گدھے کی اوجھڑی — " اس نے پراسرار لہجہ میں کہا۔ پھر جھلا پڑا — "کیا تمھیں اور کوئی کام نہیں ہے۔"

"اور یہاں — ؟" ابوزید نے اس کی جھلاہٹ کی پروا کئے بغیر سوال کر دیا۔

"یہ حسین پورنیہ سے پوچھو — بہ قول اس کے۔"

شاید یہاں تازہ ہوا، روشنی اور کچھ مددگار مل جائیں۔ اور شہر کا دروازہ کھلا ہوا ہمارا منتظر ہو — پھر ہم بہت سے عجائبات، قدیم ظروف، مخطوطے اور کتبے پا جائیں جس سے ہمیں یہ معلوم

ہو جائے کہ ہم دراصل کہاں سے چلے تھے — اور کیا وہ شہر جسے ہم نے چھوڑا ہے تفلس نہ تھا۔ یا کیا صرف یہی شہر تفلس ہے۔ اسی لئے میں بھی نشانیاں مقرر کرتا آیا ہوں کہ واپسی کے سفر میں دقت نہ ہو۔"

"اچھا — ہم نے پچھلا شہر کیوں چھوڑا تھا؟" ابوزید نے پھر کسی ضدی بچے کی طرح سوال کیا۔

"میں نے اس لئے کہ میں وہاں کے سارے عجائبات دیکھ چکا تھا۔ اور دوسرے شہر تفلس کی تلاش میں چل پڑا۔"

"اور میں نے — ؟" ابوزید بولا

"تم نے شاید اس لئے کہ ہوسکتا ہے وہاں کی زمین زیادہ زرخیز و شاداب ہو۔ یا یہ سوچ کر کہ ہوسکتا ہے یہ شہر شہر تفلس نہ ہو — جبکہ میں نے ہر شہر کو شہر تفلس مان کر ہی دیکھا تھا۔"

"کیا تم اس کی رہنمائی پر مطمئن ہو؟" ابوزید نے حسین پورنیہ کی طرف اشارہ کر کے دھیمے سے پوچھا۔

"نہیں — میں صرف اپنی رہنمائی پر مطمئن ہوں۔"

اسی وقت حسین پورنیہ نے آواز دی۔ "دیکھو اسی پہاڑی کی موڑ سے وہ شہر سامنے آئیگا۔"

ابوزید تیزی سے اس کی طرف بڑھ گیا — "کیا اسی پہاڑی سے۔"

"ہاں —!"

"چلو اچھا ہوا —" ابوزید نے آسودہ سی سانس لی۔

تینوں کٹاؤ گھوم کر سامنے آئے تو سوائے اندھیرے کے کچھ نظر نہ آیا۔

عارف عبداللہ نے اوپر دیکھا۔ پھر ہنس پڑا۔ "وہ دیکھو — سارے شہر تفلس کی روشنی کا عکس اوپر آسمان پر پڑ رہا ہے۔"

"وہ تو ستارے ہیں —" ابوزید نے احتجاج کیا۔

"ہاں وہ بھی شہر تفلس کا ہی تو ہے۔" عارف عبداللہ ہنس پڑا۔

"کیا بات ہے۔ ہم وہ منظر کیوں نہیں دیکھ پائے —؟" ابوزید نے حسین پورنیہ سے سوال کیا تو وہ خاموش رہا۔

"میں تو پچھلے شہر سے رخصت ہوتے ہی اس شہر کا منظر دیکھنے لگا تھا۔ سارے راستے وہ میرے ساتھ رہا ہے — عارف عبداللہ کا زہر خند بڑھتا گیا۔

"تم نے ہی تو کہا تھا کہ سارا شہر اچانک یہاں سے نظر آنے لگتا ہے؟" ابوزید نے پوچھا۔

"ہاں —" حسین پورنیہ نے سرد مہری سے جواب دیا۔

"شاید ہم غلطی سے کسی اور موڑ پر نکل آئے ہیں۔" ابوزید مشکوک لہجہ میں خود ہی بڑبڑایا۔

"کیا ہم بتا سکتے ہیں کہ ہمارا کون سا موڑ غلط تھا؟" عارف عبداللہ نے چلتے چلتے پوچھا۔

"چلو اتر چلو — ابھی دروازہ کھلا ہوگا۔ ہم آسانی سے داخل ہو کر کسی آرام گاہ کا انتظام کر سکیں گے" حسین پورنیہ نے بات بدلنے کے انداز میں کہا۔

ابوزید سارے راستہ کسی اچانک سامنے آجانے والے شہر کا منتظر رہا۔ اور عارف عبداللہ اپنے منقش پیالوں کو ٹین کے ڈبوں کے ساتھ زور زور سے ہلا کر کھنکاتا رہا۔ پھر تینوں ردے اور ڈھاک کے پودوں کا سہارا لیتے ہوئے تیزی سے نیچے آئے تو ایک طویل و عریض فصیل کا سامنا کرنا پڑا۔

یہ فصیل پہلے اتنی اونچی نہ تھی۔ شاید اسی لئے سارا منظر ہم سے پوشیدہ رہا۔ حسین پورنیہ نے کنکھیوں سے عارف عبداللہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"لیکن تم نے تو کہا تھا کہ فصیل کی ہر برجی پر مکلف دیدبان رہتے ہیں جو ہر آنے جانے والے پر کڑی نظر رکھتے ہیں — اور مہمانوں کو خوش آمدید کہتے ہیں — لیکن یہاں تو اتنی شدید تاریکی ہے کہ فصیل بھی نظر نہیں آتی — نہ جانے دروازہ کہاں ہے؟" ابوزید نے پریشان ہو کر کہا۔

"دیوار ٹٹولتے ہوئے آگے بڑھیں — دروازہ مل جائے گا......" حسین پورنیہ نے کچھ اور بھی کہنا چاہا۔

"کیوں —؟ تم نے تو کہا تھا کہ ساری رات دروازے کھلے رہتے ہیں — اور....."

ابوزید نے پھر اس کی بات کاٹ دی۔

"ہاں — لیکن نہ جانے کیا بات ہے۔ دروازہ تو یہی ہے۔ میں آواز دیتا ہوں۔" ابوزید لپک کر آگے بڑھا۔

نا — آواز نہ دینا۔ سارا شہر گونج جاتا ہے۔ حسین پورنیہ نے جلدی سے اسے روک کر کہا۔

عارف عبداللہ نے دیکھا کہ حسین پورنیہ یونہی ساری فصیل اور دروازے کو دیکھ رہا ہے۔ وہ مسکرا پڑا۔

وہ روشنیاں کہاں ہیں۔ جو اُبل اُبل کر باہر آتی ہیں۔ اور حال ان کی روشنی میں آنے والوں کے چہروں سے ان کی تکان کا اندازہ کر لیتے ہیں۔ اور پھر پرسکون و آرام دہ قیام گاہوں تک رہنمائی کرتے ہیں۔ ابوزید نے متوحش لہجہ میں سوال کیا۔

"میں اپنی کوئی بہت قیمتی چیز کہیں بھول آیا ہوں": اچانک عارف عبداللہ نے زور سے کہا۔

"کہاں ــــ؟ کون سی شے ــــ؟؟" ابوزید اس کی طرف جھپٹا۔

"کوئی بہت کم قیمت لیکن میرے لئے نہایت اہم شے۔ شاید اپنا قلم یا اپنی ڈائری۔ یا کوئی اور بہت ذاتی شے۔"

"کہاں ــــ؟"

"وہیں کہیں کسی پہاڑی پر:"

"کس پہاڑی پر ــــ؟"

"کسی بھی پچھلی پہاڑی پر ــــ میں کوئی چیز بھول ضرور آیا ہوں۔ اور مجھے بے چینی ہو رہی ہے۔"

"آخر کس پہاڑی پر:" ابوزید جھلا گیا۔

"شاید وہیں ــــ جہاں سے مہاجر آبی پرندوں کی قطار اڑی تھی:" عارف عبداللہ کے ہونٹوں پہ مسکراہٹ تھی۔

"وہ چیز ہم دونوں کی مشترک تو نہ تھی؟"

"پتہ نہیں ــــ یا شاید تھیلے میں میرا کوئی پیالہ یا کوئی اور برتن ٹوٹ گیا ہو:"

"کیا مطلب:"

"ہاں ــــ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کچھ کھویا نہ ہو۔ بلکہ میرے اثاثہ میں سے کچھ ٹوٹ گیا ہو ــــ" عارف عبداللہ نے سپاٹ لہجہ میں کہا۔

"تم اس طرف جا کر تلاش کرو۔ پتھر کے پاس ایک ریشمی رسّی رکھی ہوگی ــــ" اچانک حسین پوزنیہ نے ابوزید کو پکار کر کہا ــــ "اب ہمیں اس کے سہارے اندر چلنا پڑے گا۔ دروازہ بند ہو چکا ہے۔

اس گھٹاٹوپ اندھیرے میں رسّی کہاں سے ملے گی ــــ اور پھر اسے کیسے معلوم کہ وہاں رسّی رکھی ہے۔ اگر نہ ہوئی تو ــــ کیا ہم ساری رات یہیں چٹانوں پہ گذاریں گے ــــ اندھیری رات اور سیاہ چٹانیں شہر تفلس کے عین باہر:" ابوزید بڑبڑاتا رہا۔

ابوزید رسّی لے کر آیا تو اس نے دیکھا کہ حسین پوزنیہ اپنی سیاہ رنگ کی ڈائری پہ کوئلے سے کچھ لکھ رہا ہے۔ اور بڑے بڑے حروف روشن ہیں۔

"تم نے تو کہا تھا ۔۔۔۔" اس نے کچھ کہنا چاہا لیکن حسین پوزنیہ نے ہونٹوں پہ انگلی رکھ کر اسے خاموش کر دیا۔

"دیکھو تم اس شہر کے بارے میں نہیں جانتے۔ اس لئے خاموش رہو۔ تمھاری آوازوں کی گونج سارے شہر میں پھیل جائے گی۔"

"ہو سکتا ہے یہ شہر، شہر تفلس ہو ہی نہ — اور ہم اچانک کسی اور شہر کی طرف آنکلے ہوں۔"

"اگر واقعی یہ شہر تفلس نہ ہوا تو — پھر تو ہم برباد ہو جائیں گے —" ابوزید نے گھبرا کر کہا تو حسین پورنیہ نے آنکھ اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔

"کیوں — ؟ کیا شہر تفلس میں تم آباد ہونے آئے تھے؟"

"پتہ نہیں — میں کچھ نہیں سمجھ پا رہا ہوں۔ ہمارا تو زادِ راہ ہی ختم ہو چکا ہے۔ اب اگر اگلا سفر درپیش ہوا تو — ؟ — شہر کے اندر سے نہ کوئی روشنی آرہی ہے نہ ہی کوئی آواز۔ آخر اندر چلنے کی کیا صورت ہوگی۔ اگر یہی شہر تفلس ہوا تو — ؟ لیکن تفلس سے بھی ہیں کیا لینا دینا؛" وہ بڑبڑا تا رہا۔

عارف عبداللہ نے اچانک الاپنے کے انداز میں کان پر ہاتھ رکھا اور چیخ اٹھا۔

بے تاج پادشاہاں شاہی کنند نا داں

اجرا کنند فرماں فی الجملہ مہملانہ

از جنگ باز آیند سرحد جدا نمایند

صُلحے کنند اما — صلح منافقانہ

مادر بہ دختر خود سازد بسے بہانہ۔ نہ۔ نہ۔

حسین پورنیہ نے اس کی طرف تشویش سے دیکھا اور ابوزید اس کی طرف دوڑ پڑا۔

اے شور نہ کرو۔ ہماری آوازوں کی گونج سارے شہر کے در و بام میں پھیل جاتی ہے۔

ہماری آواز تو نہ جانے کب سے ہر شہر کے در و بام میں گونج رہی ہے۔ اب تو وہ ختم بھی ہو چکی ہوگی۔ اسی لئے ہم ایسے شہر کی تلاش میں نکلے ہیں جہاں آواز نہ گونجتی ہو۔

"تو کیا یہاں آواز نہ گونجتی ہوگی —" ابوزید نے حیرت سے عارف عبداللہ کو دیکھا۔

"پتہ نہیں —"

"اور اگر ہماری آوازیں وہاں سن لی گئیں تو — ؟"

"کون سن لے گا؟" عارف عبداللہ نے اوپر دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"اس شہر کے مکین —"

"کون سے مکین — ؟"

"مجھ سے بحث نہ کرو ــ یہ بات بھی حسین پور نیہ نے کہی ہے"۔

پہلا مسکرا پڑا ــ "کون حسین پور نیہ ــ ؟"

"آؤ میں نے راستہ تلاش کر لیا ہے"۔ حسین پور نیہ نے پکارا۔

آؤ ــ آؤ ــ عارف عبداللہ زور زور سے اپنے اثاثہ کو کھڑکاتا آگے بڑھا۔ راستہ مجھے بھی بہت پہلے سے معلوم تھا۔ ہو سکتا ہے یہی شہر تفلس ہو ــ یا ہو سکتا ہے کہ یہ ہرگز تفلس نہ ہو ــ کیا فرق پڑتا ہے؟

کیا دروازہ کے پیچھے دیدبان اور نیزہ بردوش پہرہ دار نہ ہوں گے"؟ ابو زید نے پھر مشکوک لہجہ میں پوچھا۔

"آؤ ہمیں خاموشی سے کوئی قیام گاہ تلاش کرنا ہے"۔ حسین پور نیہ نے گویا بہلاتے ہوئے کہا۔

اندر داخل ہوتے ہی ان کی آنکھوں میں سیاہ اور کرکڑا دھواں گھس پڑا۔ اور قدموں کی چاپ گونجنے لگی۔

"افسوس کہ ہم اپنے ساتھ نمدے کے تسمے لانا بھول گئے۔ ورنہ گھوڑوں کی طرح اپنے پیروں پر چڑھا لیتے"۔ عارف عبداللہ نے آہستہ سے ہنس کر کہا۔

دراصل ہم سب بہت جری ہیں اور سازش کے فن سے ناواقف جبکہ ہمارے گردو پیش سازش ہی سازش ہوتی ہے۔ کیوں نہ ہم اپنے پیروں کو اپنے کندھوں پر رکھ لیں۔

"اب کھڑا رہنا مشکل ہے۔ اور گھٹن بڑھتی جا رہی ہے"۔ حسین پورنیہ نے کہا۔

"ہاں اور یہ ہماری چاروں طرف گھٹن ہے"۔ ابو زید بولا۔

"ہمیں بیٹھ کر چلنا ہو گا۔ عارف عبداللہ نے کھڑے ہونا چاہا تو حسین پور نیہ نے روک دیا۔ "دھواں اوپر بہت کثیف ہے۔ بیٹھے رہو۔ اور اگر ممکن ہو تو اپنے تھیلہ کو یہیں چھوڑ دو۔ بہت آواز آتی ہے"ــ

ابو زید کھسک کر عارف عبداللہ کے پاس آگیا ــ کیا ہمارے خلاف کوئی سازش ہوتی ہے۔ مجھے تو اب یہی محسوس ہوتا ہے۔

عارف عبداللہ خاموش رہا۔

اچانک ابو زید چیخ اٹھا "میں نے دیکھ لیا ہے۔ اس مکان کی کھڑکی اور روشندان سے

دھواں خارج ہو رہا ہے۔"

"لیٹ جاؤ۔ لیٹ جاؤ گھٹن بڑھتی جا رہی ہے۔" حسین پورنیہ نے دبی آواز سے ڈانٹا۔

"میں آگ بجھانے کی تدبیر سے واقف ہوں۔" وہ رینگتا ہوا آگے بڑھا تو حسین پورنیہ نے اسے کھینچ لیا۔

ہشت ـــ یہاں کسی چیز کو چھونا نہیں۔ خاموشی سے کسی کھلے دروازہ تک بڑھتے چلو۔ وہ آہستہ آہستہ رینگتا ہوا بولا۔

عارف عبداللہ کھسکتے کھسکتے اچانک رک گیا۔

"کیا ہے؟" ابوزید نے اس کے کان کے پاس منھ لے جا کر پوچھا۔

"یہ سوراخ دیکھ رہے ہو۔ اس نے زمین پر بنے ایک سوراخ کی طرف اشارہ کیا۔

"ہاں ـــ"

"یہاں کبھی بچے گولیاں کھیلتے رہے ہوں گے۔"

"پھر ـــ؟؟؟"

"پھر کچھ نہیں ـــ"

"اگر کوئی کھلا دروازہ نہ ملا تو ـــ" ابوزید نے مشکوک لہجہ میں ہی سوال کیا۔" یہاں اتنی شدید تاریکی کیوں ہے؟ سارے شہر والے کہاں گئے۔ دوکانیں اور بازار کدھر ہیں؟"

"خاموش رہو ـــ بولنے سے دھواں اندر داخل ہو سکتا ہے۔" حسین پورنیہ نے جھڑک دیا۔

"شاید اس سامنے والے مکان میں روشنی ہے۔ کیوں نہ اسے کھولنے کی کوشش کی جائے۔ شاید کوئی حل جائے۔"

"خبردار ـــ! یہاں کسی شے کو نہ چھونا۔ نہ کسی کو آواز دینا۔" حسین پورنیہ نے پھر متنبہ کیا۔

"یہ روشنی نہیں۔ اوپر والے شہر تفلس کا پرتو ہوگا۔" عارف عبداللہ پھر ہنس پڑا۔

ابوزید اس کے پاس رینگ آیا۔

"تم اسے کیوں ساتھ لائے ہو۔ مجھے چاروں طرف دہشت اور سازش دکھائی دے رہی ہے۔"

"کسے ـــ؟"

"اسی حسین پورنیہ کو ـــ!"

"کس حسین پورنیہ کو ـــ؟"

"ارے اسی تیسرے کو۔" ابوزید جھنجھلا گیا۔

"کس تیسرے کو ــــ؟"

"اماں اس آگے والے کو ــــ؟"

"تمھاری وجہ سے!"

"کیوں؟"

"مجھے تم پر اعتبار نہ تھا۔ اور تم مجھ سے نالاں تھے۔ اس لئے مجھے تم سے خوف تھا اور مجھے سفر کرنا تھا" عارف عبداللہ نے بڑے سپاٹ لہجہ میں جواب دیا۔

"اور وہ کیوں آیا ــــ؟" ابوزید نے اس کے لہجہ کی پرواکئے بغیر پوچھا۔

"اس لئے کہ وہ مجھ سے خوفزدہ تھا اور تم سے نالاں ــــ اور اسے بھی سفر کرنا تھا۔"

"تو پھر ہم میں تیسرا کون ہے؟ اس لئے کہ میں بھی تم دونوں سے خوفزدہ تھا۔"

"ہر شخص دوسرے کے لئے تیسرا ہے۔ پرواہ نہ کرو۔ اسی لئے ہم ساتھ ہیں۔"

"اچھا ہم جا کہاں رہے ہیں۔ یعنی یونہی بلا مقصد۔ یہ سب ہے کیا۔ ہم واپس کیوں نہ ہولیں۔" ابوزید نے جھنجھلا کر کہا۔

ہاں ــــ مہاجر آبی پرندوں کو ایک موسم گذرنے کے بعد اپنے شہر واپس چلے جانے کی امید ہوتی ہے۔ اور ہمیں اب کہیں نہ کہیں کوئی شہر تفلس فرض کرنا پڑے گا۔ ہم کھو جائیں گے۔ یا پھر ہجرت کر کے شہر تفلس کی تلاش میں نکلیں گے۔ چلو اس کے ساتھ ہم بھی کسی کھلے دروازہ کی تلاش جاری رکھیں۔ دراصل ہم بلا مقصد ہی نکلے ہیں۔ جیسے رات میں ابابیل اپنے گھونسلے سے گر پڑے۔

"لیکن....."

بھئی بولو مت۔ گھٹن اور بڑھتی ہے۔ لیٹے رہو ــــ اٹھنا نہیں ــــ

تینوں لیٹے گھسٹتے رہے۔ دھوئیں کا حجم بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ اچانک حسین پورنیہ اٹھا اور ایک بند دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا۔ یہ دونوں بھی دھوئیں کی پرواکئے بغیر اس کے پیچھے جھپٹے۔

ساری راہداری میں بہت تیز روشنی بکھری تھی۔ دور سے مضبوط قدموں کی کھٹ کھٹ ابھر رہی تھی ــــ جیسے کوئی لکڑی کے تختوں پر چل رہا ہو۔

کھلے ہوئے دروازہ پر چکر لاتے ہوئے گاڑھے کثیف دھوئیں کی چادر تنی تھی۔ یہ دونوں

دور ویہ کمروں کے کھلے دروازوں میں جھانکتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے۔ ایک تکلیف وہ سناٹا انھیں خود بھی بولنے سے روکے ہوئے تھا۔ ہر کمرہ بہت تیز روشنی میں ڈوبا ہوا تھا۔ اور تمام کمروں میں گہرے سیاہ رنگ یا نیلے رنگ کی پالش ہوئی تھی ـــ ایک کمرہ میں لاتعداد ویسے ہی سفری تھیلے جسے انھوں نے اپنی پشت سے باندھ رکھے تھے۔ بھرے ہوئے تھے۔ چھت سے فرش تک۔

آگے جانے والے حسین پورنیہ کے قدموں کی آواز اب معدوم ہوگئی تھی۔ صرف عارف عبداللہ کے تھیلے سے برتنوں اور ٹین کے ڈبوں کی کھنکھناہٹ کی آواز آرہی تھی۔

برآمدہ کے آخری سرے پر پہونچتے ہی ان کے پیروں کی چاپ بھی اتنی شدت سے ابھرنے لگی کہ برتن کی کھنکھناہٹ اس میں ڈوب گئی۔

سامنے ایک کھلے دروازہ کے درمیان حسین پورنیہ کھڑا آسودگی سے سامنے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ کمرہ میں چھت اور چاروں طرف کی دیواروں میں ایک ایک بالشت کے فاصلہ پر نوکیلی کیلیں پیوست تھیں اور ان کے سرے بھی نوکدار تھے۔ درمیان میں ہر ایک دو کیلوں کے بعد کچھ سلاخیں سہ شعبہ تھیں۔ سامنے والی دیوار اور چھتوں میں لگی سلاخوں میں کچھ مُردہ، نیم مردہ اور بالکل زندہ پرندے اور جانور پھنسے ہوئے تھے۔ مثلاً گلہری، چھپکلی۔ گرگٹ۔ چڑیا۔ دیوار کی نچلی سطح پر مختلف قسم کی تتلیاں اور دوسرے چھوٹے پرندے پھنسے ہوئے تھے۔ اور چھت پر بڑے پرندیا جانور ـــ مثلاً کوّا، کبوتر، فاختہ یا چمگادڑ اور ابابیل۔ کچھ مردہ ہوکر سوکھ گئے تھے۔ کچھ کبھی کبھی لرز اٹھتے تھے اور کچھ مستقل پھڑپھڑا رہے تھے۔ اور تازہ تازہ خون نیچے فرش پر ٹپک رہا تھا۔ دیواروں پر بھی خشک اور تازہ خون کی لکیریں بنی ہوئی تھیں۔

نیم مردہ اور زندہ پرندوں و جانوروں کی آوازیں سارے کمرہ میں گونج اٹھتی تھیں۔ یا ان کے پروں کی پھڑپھڑاہٹ ابھر آتی تھی۔

ان دونوں نے گھبرا کر حسین پورنیہ کے چہرے کی طرف دیکھا تو ایک سرد سی لہر ان کی ریڑھ کی ہڈی کو گدگدا گئی۔ ابوزید نے کچھ کہنا چاہا تو عارف عبداللہ نے اس کا ہاتھ دبا دیا۔ جسے ابوزید نے مضبوطی سے پکڑ لیا۔ پھر کلائیوں پر اس کی گرفت سخت ہوتی گئی۔

اس کمرہ میں ایک ہی کھڑکی تھی۔ ایک شیشہ اس طرح ٹوٹا تھا کہ اس میں نوکیں پیدا ہوگئی تھیں۔ اس ٹوٹے ہوئے حصہ سے کبھی کبھی ہوا کا ایک جھونکا آتا تو مُردہ تتلیوں کے پَر تھرتھرا اُٹھتے تھے۔

حسین پورنیہ اچانک مڑ کر کمرہ سے نکل آیا۔ کھلے دروازہ سے یہ دونوں بھی باہر لپکے۔
ابوزید نے پھر کچھ کہنا چاہا۔۔ لیکن بھرائی ہوئی سانس کی آواز ہی اُبھر کر رہ گئی۔
حسین پورنیہ ایک کمرہ کے دروازہ پر کھڑا گھور گھور کر اندر کچھ تلاش کر رہا تھا۔ یہ دونوں اس کی بغل میں کھڑے ہو گئے۔

یہ کمرہ دوسرے کمروں کے برخلاف سفید تھا۔ سر سے پیر تک سفید اور درمیان میں ایک شمع جل رہی تھی ـــ جس کی ناکافی روشنی اس سفیدی کو اور واضح کر رہی تھی۔

یہ کمرہ بھی خالی تھا ـــ اس میں کوئی روشندان یا کھڑکی بھی نہیں تھی۔

حسین پورنیہ کمرہ کی دیواروں کو گھور رہا تھا۔ جیسے کسی کو تلاش کر رہا ہو۔ یہ دونوں کوشش کے باوجود کچھ نہ دیکھ پائے۔ حالانکہ براق۔ سفید کمرہ کا ایک ایک حصہ واضح ہو چکا تھا۔
حسین پورنیہ کے آگے بڑھتے ہی یہ دونوں بھی بڑھے اور ٹھٹھک گئے۔

سامنے کی دیوار سے ملے ہوئے تین مبہم سفید سے ہیولے نظر آئے۔ تینوں کے لباس سفید۔ جسم اور سارے بال اتنے سفید کہ وہ دیوار کی سفیدی کا جزو بن گئے تھے۔ اور اتنے نزدیک آجانے کے بعد بھی وہ صرف وہم معلوم ہوتے تھے۔ ان کی سفید پتلیاں بے جان انداز میں سامنے کے کھلے ہوئے دروازہ کے باہر ٹنگی ہوئی تھیں۔ یہ بالکل ان کے سامنے جا کھڑے ہوئے لیکن ان کے انداز میں کوئی فرق نہ آیا۔

حسین پورنیہ خاموشی سے انھیں گھور رہا تھا ـــ یہ دونوں کبھی انھیں دیکھتے کبھی حسین پورنیہ کو ـــ

اب پرندے آنے لگے ہوں گے ـــ وقت ہو گیا ہے۔ میں جا کر دیکھتا ہوں۔ اچانک کمرہ میں پاٹ دار آواز اُبھری تو دونوں ٹھٹھک کر پیچھے ہٹ آئے ـــ داہنی طرف والا ہیولیٰ بول پڑا تھا ـــ دونوں دوسرے ہیولے اسی طرح دیوار سے چپکے باہر گھورتے رہے۔

اچانک پہلے بوڑھے کا ہیولیٰ دیوار سے اٹھ کھڑا ہوا ـــ اور بغیر ان کی طرف دیکھے کمرہ کے دروازہ سے باہر نکل گیا۔

حسین پورنیہ خاموش کھڑا اپنے داہنے ہاتھ کی انگلیوں میں سیاہ رنگ کا رومال لپیٹ رہا تھا۔ ابوزید اور عارف عبداللہ نے پلٹ کر جاتے ہوئے ہیولے کو دیکھا۔ اب حسین پورنیہ ان کی بغل میں کھڑا انگلیوں سے رومال کھول رہا تھا.... اس کی آنکھیں اسی دیوار کو گھور رہی تھیں۔

جبڑے ابھر آئے تھے اور کنپٹیوں میں شدید تناؤ تھا۔ ان دونوں نے سادہ دیوار کی طرف دیکھا۔

جہاں وہ بوڑھا بیٹھا تھا اس جگہ سیاہ لکیروں سے سفید براق دیوار پر اس کا پورا خاکہ بنا ہوا تھا۔ دونوں دوسرے بوڑھوں کی آنکھیں اب بھی دروازہ کے باہر جمی تھیں۔

حسین پورنیہ انھیں ہاتھ سے اشارہ کر کے کمرہ سے باہر نکل آیا۔

سلاخوں والے کمرہ کے دروازہ پر وہ سفید بوڑھا کھڑا ہوا تھا۔ اندر کھڑکی کے ٹوٹے ہوئے شیشے سے پرندے کمرہ میں داخل ہو رہے تھے۔ شیشے کی نوکوں سے پرندوں کے پنکھ ہوئے پر کھڑکی کے نیچے ڈھیر ہو رہے تھے۔ اور پرندے اس سے زخمی ہو ہو کر کمرہ میں آ کر پہنچ رہے تھے۔

سیاہ رنگ کے کوّے سے مشابہ پرندے اُڑتے اُڑتے سلاخوں کی نکلی ہوئی نوک میں پھنس جاتے تو ان کی کربناک چیخیں اُبھرتیں ــــ

آہستہ آہستہ کمرہ کی تمام سلاخیں پر ہوتی جا رہی تھیں۔ کچھ پرندوں کی گردنیں، کچھ کے سینے، پیٹ، کچھ کی ٹانگیں اور کچھ کے پر ان سلاخوں میں پھنسے ہوئے تھے۔ اور پرندے اب بھی کھڑکی کے راستے داخل ہوتے اور پھنستے جا رہے تھے۔

بوڑھا دروازہ سے مڑ کر پھر اسی کمرہ کی طرف چلا اور دروازہ سے ہی پکارنے لگا ــــ

اٹھو۔ اٹھو۔ پرندے آ گئے ہیں۔ تقریباً تمام سلاخیں بھر گئی ہیں ــــ اور لاتعداد پرندے اب بھی اڑ رہے ہیں۔ چلو ورنہ .....

اچانک اس کی نظر سامنے کی سفید دیوار پر داہنی طرف بنے سیاہ رنگ کے خاکے پر پڑی تو وہ لڑکھڑا گیا ــــ اور پاگلوں کی طرح چیختا ہوا دیوار کی طرف دوڑا ــــ پھر جھٹکے سے مڑ گیا۔ اس کی آنکھیں دہشت سے پھیلی ہوئی تھیں۔ وہ ایک ٹک اسی سیاہ خاکے کو گھور رہا تھا پھر ان دو ہیولوں پر ٹوٹ پڑا۔

یہ ــــ خاکہ میرے جانے کے بعد کس نے بنایا ہے ــــ پرند آ گئے ہیں۔ دونوں ہیولے جھٹکے سے دیوار سے علیحدہ ہوئے اور اس خاکے کو دیکھتے ہی کانپنے لگے۔

"ہم ــــ نہ ــــ نہیں جانتے !!"

پہلا والا خوف سے اب بھی لرز رہا تھا۔

"میں تم لوگوں کی انگلیاں دیکھوں گا۔ کس کے پاس کوئلہ ہے ؟"

"ہم ــــ میری ــــ ہماری انگلیاں صاف ہیں۔ ہمارے پاس کوئلہ نہیں ہے ؛"

تم نے ہی شہر کے دروازہ کے باہر بیٹھ کر کوئلے سے اپنی ڈائری پر روشن حروف میں کچھ لکھا تھا۔ تیسرے ہیولے نے نظریں جھکا کر کہا۔

ابوزید اور عارف عبداللہ نے چند نظروں سے حسین پورنیہ کی انگلی کی طرف دیکھا — پھر ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔

"کیا واقعی پرند آگئے ہیں —؟" دونوں ہیولوں نے سہمے ہوئے انداز میں پوچھا۔

"ہاں — پہلے ہیولے نے بیٹھی ہوئی آواز میں کہا — اور مُردہ چال سے چلتا ہوا مُڑ گیا۔ دونوں ہیولے اس کے ساتھ ہی باہر نکل گئے۔

حسین پورنیہ نے اپنا تھیلہ اتار کر دروازہ کے باہر ڈال دیا۔ پھر عارف عبداللہ اور ابوزید کو اشارہ کر کے کمرہ میں داخل ہو گیا۔ اور داہنی طرف کی دیوار سے لگ کر بیٹھ گیا — اور اپنی بائیں طرف ان دونوں کو بیٹھنے کے لئے اشارہ کیا — تینوں برابر سے بیٹھ گئے۔ اور خاموشی سے سامنے والی سفید دیوار کو گھورنے لگے — دھیرے دھیرے ان کے سانس کی آواز کم ہوتی گئی۔

تھوڑی دیر بعد وہ تینوں ہیولے پھر کمرہ کے دروازہ پر آئے اور درمیان میں جلتی ہوئی شمع کو دیکھتے رہے۔ پھر تینوں تیزی سے آگے بڑھے۔ اور سامنے کی دیوار پر بنے اس سیاہ خاکہ کو ہتھیلیوں اور دامن سے رگڑ رگڑ کر مٹانے لگے۔

خاکہ مٹانے کے بعد تینوں ہیولے برابر سے کھڑے ہو کر کمرہ کی داہنی طرف کی دیوار کو اس طرح گھورنے لگے جیسے کچھ تلاش کر رہے ہوں۔ ☐

آگ الاؤ صحرا

(ناولٹ)

"جب تم اسے کسی پرسکون گوشہ میں بیٹھ کر — آمادگی سے پڑھوگے تو تمھیں ایسا محسوس ہوگا کہ میں صرف تم سے — اپنے سے اور سب سے کچھ کہنا چاہتا ہوں —

اپنی باتیں۔ تمھاری باتیں — اور سب کی باتیں۔"

— قمر احسن

ابتدائیہ

ابھی ابھی اچانک بالکل سکون ہوگیا تھا ——— کہ "گڈو ظفریاب" کی آواز کمرہ میں گھس آئی۔ اور دوڑ دوڑ کر چیزوں کی ترتیب بگاڑنے لگی۔

میں فوراً چونک کر اٹھ بیٹھا ——— "اب وہ بھی آتی ہوگی"۔ لیکن ابھی تک تو گڈو ظفریاب ہی سارے کمرہ میں اچھل رہی تھی۔

"دلا بو تھوب لگے دی۔ ہاں۔ ستا بو تھوب لگے دی"۔ کہ وہ بھی آگئی۔ ہش ہش۔

"ہوتے اس مہروش کے جلوۂ تمثال کے آگے۔ پر افشاں جوہر آئینہ میں مثل ذرہ میں روزن میں"

گڈو گڈو اب خاموش ہوجاؤ۔

پھر دونوں کمرہ سے نکل کر برآمدہ میں آگئیں ——— گڈو! دیکھو آ۔ بڑی سوئی اب کتنے پر ہے؟

اچھا۔ جی جی!

میں جلدی سے برآمدہ میں آیا تو وہ باہر نکل گئی۔ صرف گڈو ظفریاب رہ گئی تھی۔ جی جی بڑی سوئی ۸ پر ہے۔

اف! ابھی تو آدھا گھنٹہ باقی ہے۔

جب میں نے دروازہ کھولا تو سچ ——— وہی ہوا جو اس نے کہا تھا۔

"ہر رات جب میں دروازہ کھولتا ہوں تو سورج دوڑ کر اندر آجاتا ہے۔ پھر اس کی تپش، سوزش اور اس کا قہر وجلال میرے سینہ میں ذخیرہ ہوجاتا ہے ——— اور میں ہر روز صبح کو سوچتا ہوں کہ میں نے اس بارِ عظیم کو کیسے اٹھالیا ———؟"

لیکن محسوس تو مجھے کچھ نہیں ہوا۔ صرف سورج دوڑ کر اندر آگیا ہے اور سب باہر نکل چکے ہیں۔

جیسے ہی میں نے انگڑائی لینے کے ہاتھ اٹھایا ویسے ہی انگلیاں پھر اس کی آواز سے ٹکرا گئیں ــــ گڈو ــــ گڈو ــــ!!

ابھی تک تو وہ بگی صرف سامنے والے کوڑے کے ڈھیر پر بیٹھی رہا کرتی تھی۔ چپ چاپ اور خاموش۔ اور چونک چونک کر اپنے ادھر ادھر دیکھ لیا کرتی تھی۔ جیسے اسے کوئی آہٹ ملی ہو۔

"اگر اس وقت اس کے نزدیک کوئی ہو تو لمحہ بھر کے لئے اس کی آنکھوں کی چمک ضرور دیکھ لے۔ (یہ بھی اس نے کہا تھا) بس اسی پل اس کی آنکھوں کی ساری میل بھی نہ جانے کہاں گم ہو جاتی ہے"۔

آج صبح سے ہی سرخ سورج میں اس نے آگ جلائی تھی، اور ایک ماچس اتنی دور سے بھی اس کے گھٹنوں پر چمک رہی تھی ــــ رات شاید مجھ سے ہی غلطی ہو گئی تھی ــــ کہ ماہے بگڑ کر چلی گئی۔ شاید وہی ماچس بھی اٹھالے گئی تھی۔ رات تو نہیں تھی۔

رات ہی بھائی کاظم بھی بگڑ گیا تھا ــــ لیکن مجھے ماہے کے آجانے پر پرسکون رہنا ہی پڑتا ہے۔

ارے بولو نا ــــ مجھ سے تمھیں کیا کیا شکایت ہے ــــ ؟ منھ سے بولو!

اس کے جانے کے بعد احساس ہوتا ہے کہ جیسے میرے پاس کوئی اور ہے ــــ شاید گڈو ظفر یاب اٹھ گئی ہو؟ یا 'اس' نے تکیہ اٹھا کر کھینچ لیا ہو ــــ ؟ اب اندھیرے میں کون جھانکتا پھرے؟ کسم کے انگریزی، اردو، ہندی خطوط سے عجیب سا احساس ہوتا ہے۔ جیسے ہم دونوں ایک دوسرے کو بیوقوف بنا رہے ہوں ــــ یا شاید وہ سوچتی ہے کہ میں کیا کہوں گا۔؟ شاید میں سوچتا ہوں ــــ کہ وہ کیا کہے گی۔ یا شاید وہ سوچتی ہے کہ وہ کیا سوچے گی اور شاید میں سوچتا ہوں کہ میں کیا سوچوں گا؟؟

ارے بھائی کاظم تم ہی بولو ــــ! ماہے کو کیا جواب دوں ــــ

"اشو چیاں ان وشوچ ستوم" ــــ ٹھیک ہی تو ہے"۔ جو بات لائق غم نہیں اس کا غم کیوں؟

اب میں اسے یہاں آنے کا خط لکھ ہی دوں۔ ظاہر ہے کہ وہ نہ آسکے گی۔ لیکن اگر اس میں اپنے ماں باپ سے آنکھیں ملانے کی ہمت پیدا ہی ہو گئی ــــ تو ــــ؟ اگر وہ آہی گئی تو ــــ؟ مجھے لگتا ہے کہ ماہے ہر وقت مجھ سے مجھ کو ہی مانگا کرتی ہے۔ اس اندھے فقیر کی طرح جس کے سامنے کوئی ہو یا نہ ہو لیکن وہ مانگا کرتا ہے۔ ہے مائی۔ ہے باپ۔ ہے بھائی۔ ہے ماں۔

مجھے ایسا لگتا ہے کہ وہ ابھی کچھ مانگ لے گا ــــ؟ اور وہ مانگ کیوں نہیں لیتا۔؟

ماہے۔ تم کہہ کیوں نہیں دیتیں ــــ؟ لیکن کتنی جلدی دھوئیں کی تحریر کی طرح دونوں کی طلب ختم ہو جاتی ہے اور لکھ اٹھتا ہے ــــ" کیا تم یہی سب پڑھنا چاہتے /جانتے ہو۔ میں نہیں بانگتا

مانگتی حاصل کرلیتا رہتی۔ ہوں ــــ میرا رجوگن، تموگن دونوں اتنے ہی زیادہ مضبوط ہیں۔"

"اور تمہارا انگوٹھا پیچھے کی طرف مڑ جاتا ہے۔ اس کی تیسری پور بہت لمبی ہے۔ زہرہ کا ابھار بھی سرخی مائل ہے"ــــ لاحول ولاقوۃ۔

لیکن میرے جھنجھلانے سے پہلے ہی وہ برآمدہ پھلانگ کر وہاں چلا جاتا۔

دونوں پھر برآمدہ سے ہوکر کمرہ میں آگئیں ــــ آگے آگے گڈو ظفریاب چیزوں کو بے ترتیب کرتی ہوئی۔ اور پیچھے پیچھے وہ ــــ چیزوں کو سجاتی ہوئی ــــ میں برآمدہ سے نیچے جھانکنے لگا۔

کوڑے کے ڈھیر کا بایاں حصہ سامنے تھا۔ پاس ہی سے سائیکل گذری تو ایک کتا تیزی سے کوڑے کی طرف دوڑا ــــ پھر اس سائیکل کے پیچھے سے ماہ نکل آئی۔ اور اسی لڑکی کی بغل سے بھائی کاظم ــــ ارے نہیں۔ یہ ماہ نہیں ہے۔ شاید ڈاکٹر داس کی بہن رمو داس ہے۔ وہی جسے اسلامی لباس پہننے کا شوق ہے۔ بکھرے سی..... بھائی کاظم کا ایک ہاتھ حسب عادت کنپٹی کے بالوں پر تھا۔ اور وہ انگوٹھے کی حرکت پر غور کرتا چلا آرہا تھا۔ اچانک شاید کمر میں کھجلی لگی اور اس نے اوپر دیکھ کر جلدی سے کمر پہ ہاتھ رکھ دیا ــــ میں برآمدہ میں کھڑا مسکرا دیا ــــ کاش اس وقت کوئی اس کی تصویر کھینچ لیتا ــــ؟

یقین ہے کہ اس نے پچھلے موڑ سے نکلتے ہوئے بھی رمو کو نہ دیکھا ہوگا۔ یا شاید اتفاقیہ اس کے پیروں پر نظر پڑ گئی ہو۔؟

اسی وقت شاید رمو نے قدموں کی آواز سن کر پیچھے دیکھا اور ٹھہر گئی۔ لیکن کاظم اسی طرح کنپٹی کے بال کھینچتا اور کمر کھجاتا اس کی بغل سے نکل آیا۔

"ارے ارے۔ تم آدمی ہو یا ہونق"ــــ میں جلدی سے برآمدہ سے ہٹ گیا۔ اور سوچنے لگا کہ آج اس کے آنے پر اسی طرح خاموش بیٹھا رہوں گا۔

جب دروازہ پر مخصوص ہچکچاہٹ کے ساتھ ہی آواز آئی ــــ "میں آؤں"، تو میں حسب عادت ترش ہوگیا۔ ادھر شاید اس کی آواز سن کر گڈو ظفریاب نے زبردست بے ترتیبی پھیلادی تھی جسے شاید وہ بھی نہیں سجا پارہی تھی۔

"اماں کبھی تو آدمی بن جایا کرو۔" میں نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ "کیا مطلب سمجھا نہیں۔؟"

"ارے ابھی تم رمو کے پاس سے گذرے تھے۔ وہی ڈاکٹر داس کی بہن۔"

"تو۔"

"تو کچھ نہیں" میں جھنجھلا گیا "یار کبھی تو اسمارٹ بن جایا کرو۔ ہر وقت انفرادیت سوار کئے رکھتے ہو"

وہ میری آنکھوں میں دیکھ کر مسکرا پڑا "اچھا تو اسی لئے تم برآمدہ سے کمرہ میں آگئے تھے کہیں اسمارٹ بن کر رمسو کے پاس سے نہیں گذرا تھا؟"

"تمھیں کیسے معلوم کہ میں برآمدہ میں تھا؟"

"میں شاید پہلے بھی کئی بار کہہ چکا ہوں کہ میں تیسری آنکھ بھی رکھتا ہوں۔ اور جہاں تک انفرادیت کا سوال ہے۔ بھئی میں نے کبھی منفرد ہونا نہیں چاہا۔ تم لوگ اپنی کمزوریوں کو اسمارٹنس اور انفرادیت کا لیبل لگا کر اس طرح چھپاتے ہو جیسے کنواری لڑکی اپنا پھولا ہوا پیٹ ڈھیلے کپڑے پہن کر چھپاتے — بس میں نہیں چھپاتا — اب منفرد تو تم لوگ بننے کی کوشش کرتے ہو نہ کہ میں۔ ہاں یہ دوسری بات ہے کہ اب تمھاری تعداد زیادہ ہو گئی ہے"

مجھے ایسا لگا جیسے میرا چہرہ مضحکہ خیز ہو گیا ہے — "لیکن کچھ"

"لیکن کچھ کیا بھئی — ؟ تم نے تو آتے ہی موڈ خراب کر دیا۔ تم جانتے ہو کہ میں صرف اپنے کو دیکھتا ہوں۔ دوسروں کو دیکھ سکنے کی منزل پر ابھی آ ہی نہ سکا ہوں — میں نے تمھیں بھی صرف مشورہ دیا ہے۔ نہ کہ تمھاری کمزوریوں سے ہمدردی۔ یا غلطیوں پر نصیحت کی ہے"

"ہاں میں یہ پوچھنے آیا تھا کہ تمھاری کل والی ماچس بگلی کے پاس کیسے پہونچ گئی؟"

"میری ماچس؟"

"ہاں۔ رات میں اس پر بانسری کی تصویر بنا رہا تھا۔ اس لئے پہچان گیا"

"نہ جانے کیسے چلی گئی — شاید ماہے نے اٹھائی ہو"

"بہر حال یہ چیز غلط تھی۔ وہ آگ جلائے بیٹھی ہے"

اور میں سوچ رہا تھا۔ واقعی اس کا رجوگن چنچل اور غیر مقیم ہے۔ اسے اپنے تموگن کا احساس ہے۔ احساس عظمت پر غرور ہے۔ اس لئے شاید ستوگنی بھی ہے۔ اور اسی لئے شاید جزا سے لاپرواہے۔ ورنہ ماچس پر بنی تصویر کیسے دیکھ کر پہچان لیتا — ؟

"سنو! ماہے رات ایک افسانہ دے گئی تھی۔!"

"سناؤ — یار رہنے دو۔ زبانی بتا دو۔!"

"اس میں ایک لڑکی ہے جسے یقین ہے کہ اس سے کوئی محبت نہیں کرتا۔ پھر بھی لگتا ہے سب اسے

چاہتے ہیں۔ یا وہ سب سے محبت کرتی ہے۔ اسی لئے وہ سوچتی ہے کہ فلاں سے اظہار محبت کر دوں۔ یا فلاں سے لکھ کر پوچھوں کہ اس کا میرے بارے میں کیا خیال ہے۔ ؟ لیکن ہر صبح وہ پھر اپنے کو اسی بے فیصلگی کے بستر پر پاتی۔ اور سوچتی کہ شاید وہ اپنے کو دھوکہ دے رہی ہے۔ یا شاید وہ صرف اپنے سے محبت کرتی ہے۔ یا شاید نہیں کرتی —— اور ایک دن صبح کو وہ اپنے بستر پر مردہ پائی جاتی ہے "۔

" لاحول ولا قوۃ —— لوگوں کے ذہن نہ جانے اتنے پراگندہ کیوں ہیں۔ کسی شئے کی حقیقت جاننے کی کوئی خواہش نہیں —— اچھا میں چلتا ہوں۔ ذرا پڑھا دوں۔ پھر سمجھاؤں گا۔ !"

" چائے پیو گے ؟"

" اِں۔ ؟ یار آج تو چائے میرے یہاں بھی بن گئی تھی —— پھر کبھی سہی —— تم جلدی سے پی لو۔ اس لئے کہ ابھی کسی نہ کسی بات پر مجھ سے مشورہ کرنے کے لئے تم کو وہاں بھی تو آنا ہے "۔ وہ مسکراتا ہوا برآمدہ سے نکل گیا۔ اور میرا خون کھول گیا "۔ ذلیل۔ اُلّو کا پٹھا "

برآمدہ سے باہر ایسا لگ رہا تھا جیسے سب کچھ بہت پرسکون ہے۔

میری اس سے ملاقات نہ جانے کب۔ ؟ کس موقع پر ہوئی تھی۔ شاید ہم پہلی بار کسی کے ساتھ ملے تھے۔ یا شاید ؟ لیکن تھا وہ شروع سے عجیب۔ مجھے ہر دم ایسا لگتا جیسے ابھی یہ ساری پرتیں نوچ ڈالے گا۔ اور اپنے کو عریاں کر دے گا۔ لیکن ایسا کبھی نہیں ہوا۔ شاید یہ صرف میری خواہش رہی ہو۔ اور میں ہی نہیں بہت سے ایسے خواہش مند تھے۔ لیکن جب اس کے پاس آتے تو بلا وجہ گھبرا جاتے۔ یا ہکلانے لگتے۔ اور وہ آہستہ آہستہ اوپر اٹھنے لگتا تھا۔

" گھبراؤ نہیں۔ بولو۔ بولو —— چہ چہ "۔ دوسرا ہونٹ چبانے لگتا۔ اور دوسروں کی طرح کوشش کرنے لگتا کہ اس کی کسی خاص کمزوری کا پتہ چلائے —— لیکن جب کوئی کمزوری معلوم ہو جاتی تو —— اس کی آنکھیں کہتیں —— " یہ کون سی خاص بات ہے۔ یارو۔ ! دوسروں کے بارے میں کیوں سوچتے ہو ؟ اپنے بارے میں سوچو —— ثواب ہے۔ !".....

جب میں نے گنڈو ظفریاب سے کھیلتے ہوئے اس کی طرف دیکھ کر کہا " تو جب ماسٹر صاحب نے ان سے پوچھا کہ تم فیس لائے کہ نہیں۔ ؟ تو انھوں نے جواب دیا —— "

" جی۔ ابی نے کہا ہے کہ اب کی یونی پلیٹ پر گل رُخ کا ٹکٹ لیا ہے۔ اس کے آتے ہی ساری فیس دے دینا —— تو ساری کلاس ہنس پڑی تھی "۔

" لیکن یار تم تو اس وقت تھے ہی نہیں۔ بلا وجہ میرے بارے میں اتنی تحقیق کیوں کی۔ ؟

پھر بھی بہت کچھ نہ جان سکے — میرے ساتھ تو اس سے بھی زیادہ مضحکہ خیز حالات رہ چکے ہیں جنھیں شاید میں بھی بھول چکا ہوں بھئی یاد دلا دیا کرو! یا اگر تم انھیں اور لطیفے سنانا چاہو تو میں چلا جاؤں؟"

میں نے دیکھا کہ وہ حسب معمول مجھے اکتاہٹ سے دیکھ رہی تھی جیسے چیزوں کو سجاتے سجاتے وہ خود اندر سے بہت بے ترتیب ہو گئی ہو۔

آج ابھی تک ماہے نہیں آئی — شاید پہلی ڈاک سے کسم کا خط آتا ہو — سمجھ میں نہیں آتا کہ میں کسم اور ماہے میں کسے ترجیح دوں؟ اس کی نظروں میں تو دونوں میرے معیار کے مطابق ہیں۔ اس لئے کہ دونوں میری طرح کم زور ہیں۔ الو کا —

اس کے سامنے اکثر لوگ اپنے آپ کو کیوں کھو بیٹھتے ہیں۔ یہ راز آج تک نہ جان سکا۔ جب کہ اس میں کوئی ایسی خاص بات نہیں تھی۔ پھر بھی دوسرے اپنے آپ کو اس کے سامنے اگل دیا کرتے تھے اور وہ غلاظتوں سے بچتا آگے بڑھ جاتا۔ اس کی آنکھیں دوسروں کے بڑی محنت سے چھپائے ہوئے رازوں اور احساسات کو کرید کرید کر لطف اندوز ہوتی رہتیں۔

یقیناً وہ بہت معمولی ہے۔ اسی لئے ہم سب کے ذہن پر سوار ہے۔ اور شاید ہم سب کم معمولی ہونے کی خواہش میں اور زیادہ معمولی ہو گئے ہیں۔

ا

دن کو سارے فلسفے اپنے پر لادے رہتا ہوں۔ لیکن رات کو صرف اپنے کمرہ میں آکر وہ ساتھ کیوں چھوڑ دیتے ہیں؟ کمرہ سے باہر نکلو۔ پھر وہی پرتیں دوڑ آتی ہیں — یہ سب تو بڑا بوجھ بن گئی ہیں — نہ جانے کب مجھے ان سے چھٹکارا ملے گا — کاش کوئی جسم — مجھ میں گداز پیدا کردے۔!

نہ جانے من میں کتنی ڈرامائیں اور کروکشیتر ہوتے رہتے ہیں۔ اب تو ان کی پیہم جھنکار سے آتما ہی بے حس ہوتی جا رہی ہے —

ان آنسوؤں میں نہ جانے کیسا پھیکا پن آ گیا ہے۔ پہلے تو ایسا نہ تھا۔ کیا ان تھوکوں کا ذائقہ میرے آنسوؤں میں مل گیا ہے؟ لیکن میں اس سے بے خبر کیسے رہا؟ اپنا سارا اندر باہر کا حال مجھ سے زیادہ کون جان سکا ہوگا — ؟ لگتا ہے کہ باہر کا وہ قبرستان اب من میں ہی آکر چھپ گیا ہے — اور وہ سارے اعمال جو میں نے گذشتہ برسوں میں انجام دیئے ہیں۔ اب چھینی بن کر زندگی کے پتھر کو توڑ رہے ہیں۔ اور میں ان کے سامنے بے بس ہو کر ان کی جانچ پڑتال ہی میں لگا ہوں — نہ جانے کس جنم کی سزا ہے یہ جنم۔ کاش یہ آخری ہو۔ اس لئے کہ اب اگلے جنم کے امتحان کی ہمت ہی کس میں

رہ گئی ہے۔ اسی سفر نے آخر اس منزل پر لا کر کھڑا کر دیا ہے۔ جہاں گذشتہ کل کا علاقہ ختم ہو گیا ہے۔ اور اگلا کل ابھی دھوئیں میں پوشیدہ ہے

پل کے کتنا ڈنے راستے بھی تو مسدود کر دیتے ہیں ـــ کاش بچپن کی سلیٹ کے سارے نقوش مٹ سکتے یا مٹ چکے ہوتے ـــ لیکن وہ تو ذرا سا چھینٹا پڑتے ہی اُبھر آتے ہیں اور گھنٹوں سلیٹ کی سیاہی پر کوندتے رہتے ہیں.......

صبح پانچ بجے جب نئی جگہ پر آنکھ کھلی تھی ـــ تو یقین ہی نہیں آیا کہ میں وہاں نہیں ہوں جہاں پرسوں تھا ـــ اور پھر سات برس تک لگاتار کھلی آنکھوں سے اپنے کو یقین دلانے کی ناکام کوشش کرتا رہا کہ یہ مناظر اجنبی نہیں ہیں ـــ لیکن آنکھ کھلی رہی اور میں بچہ بنا بغیر پلک جھپکائے سارے نئے مناظر کا کرب سہتا گیا.....

"اف وہ پچھلے جنم کی موت" دھواں پھیل رہا ہو ـــ اندر باہر اندھیرا ہو۔ کرشن پکش کا چاند دھیرے دھیرے مفقود ہو رہا ہو ـــ دکشنائن میں میلا اور بادلوں سے بھرا آکاش پھیلا ہو ـــ تو ضرور یہ پنر جنم اور پنر مرن کے چکر میں پڑے گا۔

آخر وہی ہوا نا ـــ

بچپن کی سلیٹ پر بنے سارے نقوش جب جب بھی مٹنے لگے ـــ کسی منچلے نے آکر چند چھینٹے برسا دیئے ـــ اور وہ نقوش فاسفورس کی طرح کوندنے لگے ـــ خطوط اُبل کر چمک اٹھے۔

اب وہ کیا کرتا۔ کہ اسے پچھلے جنم کو بھوگنا ہی تھا۔ اسی لئے تو اسے سات برس تک آنکھیں کھلی رکھنے کا حکم دے دیا گیا ـــ لیکن وہ سب نہ جان سکے ـــ کہ ـــ

"سنیاس تو من کا ہوتا ہے" اگر کبھی اوپر سے لاد بھی دیا جائے تو کیا ہوگا، جنگل میں بھی اسے تحفظ کا خیال تو آئے گا ہی۔ کوئی نہ کبھی جانور ہی تکریم کریں۔

جب اس جہانیاں جہاں گشت کو درخت کے نیچے سکون نہ ملا۔ اس لئے کہ پرندے بیٹ کر رہے تھے۔ تو وہ بستی میں چلا گیا۔ لیکن راستوں نے ساری گندگی اُبال کر اس کے سامنے ڈھیر کر دی۔ وہ وہاں سے بھی بھاگا۔ اور پانی میں جا کر کھڑا ہو گیا۔ وہاں جب اس نے دیکھا کہ بڑی مچھلی چھوٹی مچھلیوں کو کھا رہی ہے تو اسے ابکائی آگئی۔ اور تب اس نے اپنے سارے جسم پر تیل چھڑک لیا..... دوسرے نے دور سے دیکھا ـــ روکا ـــ تم گندگی سے بھاگ کر کہاں جاؤ گے؟ ـــ جب تمھارے جسم کی چربی جلے گی تو کیا اس کی چراندھ کو برداشت کر سکو گے ـــ؟

اس نے گھر آکر اپنے جسم سے سارا تیل چھڑا دیا۔ اور پھر پانی میں کود پڑا ــــ جہاں اسے سخت سردی میں ۹ آنہ گز کی ایک قمیص اور ۲ آنہ گز کا ایک پائجامہ دیا گیا۔ پیروں میں زبردستی کھٹ پٹی پہنا دی گئی۔ اور سر منڈوا کر اس پر خالص سرسوں کا تیل لگا کر اسے زبردستی سنیاس پر آمادہ کیا گیا ــــ اور وہ روتا ہوا سنیاس لیتا رہا ــــ ہر سال ایک مخصوص دن اسے کاغذ کے پھولوں سے منڈپ سجانا پڑتا۔ اور دوسرے آکر اس کی تعریف کرتے "بھئی واہ۔ خوب۔ اے جزاک اللہ"

لیکن رات میں اسے پھر وہی سڑی ہوئی دال دی جاتی ــــ جب وہ اس کی کھٹاس اور اور بدبو کی شکایت کرتا تو اس پر تازہ دال کا پانی ڈال کر دوسروں کو اس کی تازگی کا گواہ بنایا جاتا۔

"دیکھتے ہو ؟ بھاپ اٹھتی دال کو سڑی کہہ رہا ہے"

اب وہ بے چارہ محبوس سنیاسی ستوگنی نہ ہوتا تو کیا کرتا ــــ سارے افعال جز اسے لاپرواہ ــــ تب ہی رجوگن کے کچھ حصے بھی اس کے قبضہ میں آگئے ــــ جیسے ازدیاد عمل اور بے قراری بلکن چنچلتا اس کے ہاتھوں سے پھسل گئی۔ اس لئے کہ جب پیاز کو اس نے پیاز کہا تو ہاتھوں پر پڑنے والی پیلو کی شاخ نے اتنا ورم ڈال دیا تھا کہ گرفت لامحالہ ڈھیلی پڑ جاتی۔ اور تموگن اسے حاصل نہ کرنے دیا گیا۔ کہ اس طرح ہم زادوں کی فطری آزادی میں خلل پڑ جانے کا اندیشہ تھا

اسے بہر حال روز صبح و شام گہری اور تاریک مٹکی سے معینہ مقدار میں جنس نکالنا پڑتی اور اس کے بعد کے سارے افعال بجا لانا اس کا اولین فرض تھا۔ اس لئے کہ اسے بہر حال تیاگ کرنا تھا ــــ لیکن کس چیز کا تیاگ ــــ ؟ وہ آج تک نہیں سمجھ سکا ــــ

کیا اس ایک بادام اور پانچ کشمکش کا تیاگ ؟ جو اس کی ماں نے امام ضامن کے کپڑے میں چھپا کر اسے بھیجا تھا۔ (اس لئے کہ ماں ان ہم زادوں سے بخوبی واقف تھی کہ وہ بھی اعمال گزیدہ تھی) کیا عنابی رنگوں کا تیاگ ؟ یا اپنے شام کے کھیلوں کا تیاگ ؟ کہ اسے تو گندلے برتنوں کی سیاہیوں سے اپنے جسم کو داغ دار کرنا تھا ــــ بوشرٹ، ہاف پینٹ اور سفید جوتوں کا تیاگ ؟ یا ٹھنڈی میٹھی آئس کریم کا تیاگ ؟ اور یا قلم تراش چاقو کا تیاگ ــــ اسے روز صبح بتایا جاتا کہ ــــ

" الف اینتوری وبھوتی ہے " ــــ لیکن روز شام کو وہ اپنے منڈے ہوئے سر پہ گوبھی کے پتوں کا گٹھر رکھتے ہوئے یہ سبق بھول جاتا۔ بس اسے وہ معصوم و پر خلوص بکری یاد رہ جاتی جس میں اسے اپنی ماں کی شبیہہ نظر آتی ــــ معصوم۔ بے بس۔ صرف دودھ دینے کے لئے۔

اور راتوں کو اکثر جب ایک ہم زاد اٹھ کر دوسرے ہم زاد کی پلنگ پر چلا جاتا تو وہ

چونک چونک کر خوفناک کراہوں کو سنتا ــــ اور صبح کو گڑگڑا کر کہتا۔

مجھے اس ٹھنڈے پانی سے نہ نہلاؤ! مجھے سکون سے فراغت حاصل کر لینے دو۔ مجھے کٹہڑے سے باہر نکلنے دو۔ کہ میں صبح کے پھول تو اپنی پوجا کے لئے چن لوں۔

لیکن نفرت کی ہر دوپہر کو اسے ان سب کو گلاس میں بلغم تھوک کر پانی پلانے پر مجبور ہونا پڑتا تھا ــــ اور انھیں لمحات میں وہ نیم کی زہریلی شہد کی مکھیوں سے التجا کرتا ــــ کہ وہ ان سب کو ڈس کر اپنے ڈنک ان کے جسموں میں توڑ دے ــــ تاکہ۔

وہیں اسے وہ لڑکی یاد آتی جو ایک باغ میں دھان کے ایک ڈھیر پر ملی تھی۔ دبلی پتلی سی لڑکی جو اسے گڑ اور مٹر کھلایا کرتی تھی۔ آم کے درختوں سے گوند نکال کر اس کے تیروں کے لئے جمع کرتی تھی اور صبح کو جنگل جا کر اس کے لئے سرخ و سیاہ گھچیاں لاتی تھی۔ اور یہاں سب اس کے پیوند لگے لباس کو دیکھ کر اسے یتیم سمجھتے ہیں جب کہ اس کا باپ ہر ماہ پابندی کے ساتھ گھوڑوں پر پچاس روپے لگایا کرتا تھا۔ اور اس کی ماں اس کی ترقی کے لئے دعائیں مانگا کرتی تھی۔ لیکن یہ بھی ہر ماہ نئے فرضی مطالبات کا بل ان کے پاس بھیج دیا کرتے تھے۔

"باسم سبحانہ ــــ سیپ کا بٹن ۱۰؍، نرکل کا قلم ۴؍، روشنائی سیاہ ۲؍، کھریا مٹی ۸؍، چیچک کی دوا ۱۰؍۔ ۷؍۔ ر ــــ"

لیکن وہ نہیں جان سکے کہ دودھ خواہ کتنا ہی سفید، لذیذ اور میٹھا کیوں نہ ہو مچھلی اس میں زندہ نہیں رہ سکتی۔

اور حفاظت کی باڑھ لگانا ہماری عین فطرت ہے۔

اور اس طویل بانس کے اونچے سرے پر ایک پیر سے کھڑے لڑکے کو دیکھنا ہی عین فطرت ہے۔

اور گھسی ہوئی کھٹ پٹی میں پیروں کے تلوؤں کا زخمی ہو جانا عین فطرت ہے۔

تب چوری کرنا ــــ ہماری عین فطرت ہے۔

جب اس کے پاس سے چرائی ہوئی کھریا مٹی۔ نرکل کے قلم، سیاہ روشنائی، سفید کاغذ کے اوراق، سیپ کے بٹن نکلے تو ان کی فہرست اسے خود بتانا پڑی۔

اور شاید اسی کی سزا رہی ہو کہ سال کے ایک مخصوص دن گلے میں جھولی ڈال کر، کاغذ میں کباب لپیٹ کر اسے گھر کے باہر ڈھکیل دیا جاتا ــــ اور حکم ہوتا کہ اپنے سارے جسم میں اتنا کچھ جمع کر لاؤ کہ ــــ تین دن تک تمھیں سڑی دال کا ذائقہ نہ یاد رہے ــــ لیکن ہمیشہ یہ ہوتا کہ واپسی میں اسے قے

آجاتی ـــ اور اسے صرف اس لئے مار کھانا پڑتی. کہ تم کیوں آگئی۔؟

"سب کچھ تو نے زائل کر دیا ـــ اور ان سب نے کتنے خلوص سے تمہاری جھولی میں یہ سب ٹھونسا تھا. افسوس. افسوس" اب اسے چوسے ہوئے ٹماٹروں کا فضلہ کھلاؤ ـــ تاکہ اس کے جسم میں خون پیدا ہو"

لیکن وہ وہاں سے اپنی چچی کی پرانی سینڈل پہن کر بھاگ کھڑا ہوا.

اور سارے ہم زادوں کے ماش سے بنے ہوئے جسم پراگندہ ہو گئے.

تپ کا ایک یگ ختم ہو چکا تھا ـــ

۲۰

جب مجھے خبر لگی کہ وہ سارے ماش سے بنے ہوئے ہم زاد پراگندہ و منتشر ہو گئے ہیں تو میں فیصلہ نہ کر سکا کہ میں خوش ہو جاؤں یا رنجیدہ ـــ کچھ بھی ہو، انھوں نے ایک یگ کی تپسیا میں میرا ساتھ دیا تھا. اور ان سے میری یادیں وابستہ ہیں ـــ ورنہ میں آج شاید.....

لیکن اس وقت تو میں اپنی پسینہ سے بھیگی ہوئی مٹھی میں دو پیسہ کا سکہ دبائے بسکٹ والے کا انتظار کرتا رہا. کہ اب یہی میرا آزوقہ تھا.

میرا سر اب بھی منڈا ہوا تھا لیکن فضا آزاد تھی ـــ اور نرکل کے ڈھیروں پودے چاروں طرف بکھرے ہوئے تھے. کہ لو جو جی چاہے چن لو ـــ شاید یہ تمام مردہ انسانوں کے ابھرے ہوئے فاضل ناخنوں کی ہی پیداوار تھے ـــ؟ شریفہ کے ابھرے دانت اب مجھے نئے مناظر میں کھینچ لے جاتے تھے اور تب میں ان سے چشم پوشی کی کوئی ضرورت بھی نہ محسوس کرتا. اب اگر کوئی کرب تھا بھی تو وہ طاری کردہ ہی تھا. اس لئے کہ وہ آنکھیں مد مقابل ہونے پر بھی مشفق تھیں ـــ وہ لوگ بد نظری کے باوجود مخلص تھے. کہ پانچ لیمن جوس کے بدلہ میری آتما کو داغدار نہ کرنا چاہتے تھے ـــ پھر میرا ان کا اب زیادہ تعلق بھی نہ تھا ـــ نہ ہی ان کو مجھ سے بہت زیادہ شکایت تھی ـــ.

وہ میرے لئے کباب کے ساتھ روٹی کا انتظام کر دینا اپنا فرض سمجھتے تھے اور خبر گیری اپنا منصب. اسی لئے میں خوش، آزاد اور مطمئن تھا ـــ

لیکن ـــ یہیں سے مجھے لگاتار سفر کی خواہش ہوئی. اور میرے قم کے ابھار پر ایک عمودی لکیر ابھرنے لگی. پھر بھی میں احساس کمتری کا شکار رہا اور نہ جان سکا کہ سودھرم کتنا ہی مشکل، غیر مستحسن (بہ زعم خود) کیوں نہ ہو ـــ اس میں رہ کر نشو و نما کرنا چاہیئے ـــ کہ یہی ارتقا ہے ـــ

اور اسی بنیادی غلطی کی وجہ سے وہ دھوکا کھا گیا ــــ اب تک کا پسلا دھوکا ــــ کہ راتوں کو بجس ہوتے ہوئے ستونوں کی نمی دیکھ کر قہقہہ لگاتا رہا۔ جامن کے درخت کے نیچے بندھی ہوئی مادہ گدھی کو دیکھ کر مسکراتا رہا۔ پیلے ہاتھی کے لئے داغ دار ہوتی ہوئی روحوں کو دیکھتا رہا۔ اپنے اور اپنوں سے منسلک دوسروں کے نو (۹) پائجاموں کو پھاڑتا رہا ــــ اور جب بچے اس کا مذاق اڑاتے تو چھپ چھپ کر رُوتا رہا۔ گھٹتا رہا کہ اب اسے اس لادے ہوئے سنیاس سے دلچسپی نہ رہ گئی تھی۔ بالکل نہیں رہ گئی تھی ــــ

شاید یہی وجہ تھی جنگل کے باہر امرودوں کے باغ میں جب ممتحن نے آکر کہا ــــ

بیٹے اب باہر جاؤ۔ یہاں امتحان ہوگا ــــ

تو وہ یہ نہ کہہ سکا کہ۔ میں بھی اپنے کو امتحان دینے کے لائق پاتا ہوں۔

بس وہ رُو دیا تھا ــــ جب کہ رونا اس وقت اپنی کم روزی کا اظہار تھا۔ تب راتوں کو دریاؤں کی سیر۔ اس سفر کا پیش خیمہ بن گئی۔ جس کی ابتدا ہو چکی تھی ــــ

۳

میں جانتا ہوں کہ وہ جان چکا تھا کہ وہ بنیادی طور سے کم زور و لاغر ہو چکا ہے ــــ سنا ہے کہ ایک رات وہ یہ بھی جان گیا تھا کہ ایک کی داشتہ ہر ایک کی داشتہ نہیں ہو سکتی یا شاید میں صرف اتنا جان سکا ہوں کہ وہ کچھ نہیں جان سکا تھا۔ اپنے اس تیسرے سفر سے پہلے۔ اس لئے کہ اس دن بھائی کاظم نے بتایا تھا کہ وہی اس کا تیسرا سفر تھا۔

جہاں حقیقت میں پہلی بار تیسرا اور نیا منظر دیکھنے کو ملا تھا۔ پھر وہ منظر نہ جانے کہاں غائب ہو گیا۔ کہ سلیٹ پر ہزاروں من پانی ڈالنے پر بھی نہ ابھر سکا۔

شاید اس لئے کہ وہ نیا منظر اپنا نقش کہیں اور چھوڑ چکا تھا۔ اور اب منظر مطمئن تھا۔ یا شاید اس منظر کو اپنی قوتوں پر اعتماد رہا ہو جسے ہم سب نے بے اعتنائی جانا تھا۔

گو کہ میں اس سے ہمیشہ دور رہا۔ لیکن پھر بھی وہ میرے پاس تھا۔ لگا لگا سا۔ اور میں تقریباً اس کے ہر فعل سے واقف ہوتا رہا۔ جو مجھے پسند تھے۔ جو مجھے ناپسند تھے۔ گو کہ وہ تمام ناپسندیدہ افعال کی تاویلیں پیش کر دیا کرتا تھا۔ لیکن میں جو اس کا بھائی ہوں۔ بخوبی جانتا ہوں کہ ابھی وہ اس قابل بھی نہیں ہے کہ تاویل پیش کر سکے ــــ منحنی سا لڑکو شخص ــــ گو کہ آج اپنے ہر قدم (خواہ وہ بنیادی طور سے کتنے ہی کم زور اور مہمل ہوں) کے لئے اس کے پاس فلسفہ کا بنا بنایا اصول تھا ــــ لیکن میں تب سے اسے جانتا ہوں جب وہ فلسفوں سے ماورا تھا۔ جہاں وہ صرف اتنا جانتا تھا ــــ کہ "مرغی غلاظت کھاتی ہے۔ انسان

مرغی کھاتا ہے۔ اس لئے انسان غلاظت کھاتا ہے"۔

میں تو اس وقت بھی اس کے ساتھ رہا کرتا تھا جب مٹر کے کھیتوں کی ہریالی دیکھ کر اس کا پاخانہ بھی ہرا ہو جاتا تھا۔ اور وہ کھیتوں میں اپنے کو چھپا کر لیٹ جاتا تھا — پھر کسی دوسرے کے گنے کے کھیت میں چھپ کر وہ بیک وقت گنا بھی کھاتا اور فراغت بھی حاصل کر لیتا تھا۔ پھر پانی ہی کے کسی ڈھیلے سے پاک ہو کر مسکراتا مطمئن و مسرور کھیت سے نکل آتا۔ تب میری زیر لب مسکراہٹوں کا اس کے پاس اکثر یہی جواب ہوتا تھا کہ — وہ پھر سے مٹر کھانے لگتا —

ہو سکتا ہے کہ اپنی ہی غلط حرکتوں کی بنا پر وہ دوسروں کے لئے باعث نفرت رہا ہو۔ لیکن میں نے اگر کبھی اس سے نفرت محسوس کی ہے تو دوسرے اس سے بالکل ہی لاعلم رہے ہیں — جب کہ وہ پہلے بھی بہت ہلکا تھا۔ اپنی ساری باتیں مجھ سے کہہ دیا کرتا تھا — اس لئے کہ اس وقت اس کے پاس کوئی فلسفہ نہ تھا۔ نہ ہی کوئی خبط تھا۔ صرف کم زور سا مجہول انسان —

ہاں وہ اتنا ضرور جانتا تھا کہ کبھی تلسی کو پیاسا چھوڑ کر پانی نہ پینا چاہئے"۔ اکثر — فاختاؤں کے شکار سے وہ بغیر کسی سبب کے ہی واپس لوٹ جاتا۔ اس لئے کہ "کیا ہم جانتے ہیں کہ اس فاختہ نے پانی پی لیا ہے۔ یا اس کے انڈے اس کے گھونسلہ میں نہیں ہیں"۔

اور اسی بات پر آج مجھے افسوس ہوتا ہے کہ کاش میں نے پہلے ہی جان لیا ہوتا — کہ — پریشو ہزار پھنوں والے ناگ پر سوتے ہوئے بھی پر سکون رہتے ہیں — تو مجھے اس کا کیمرہ گرو رکھ کر ہی اسے تیس روپے اس کے معینہ سفر کے لئے نہ دینے پڑتے۔ کاش میں نے اپنے کو اس سے اتنا الگ نہ رکھا ہوتا — کہ آج ....

اکثر تو میں نے اس کے ساتھ ظلم بھی کیا ہے۔ مثلاً اسی وقت جب گرمی کی سخت لو میں بیٹھا وہ کچے آموں کے چٹلے میں اوسط سے کئی گنا زیادہ مرچیں ڈال رہا ہو۔ اور اس نے پہلے ہی سے پانی کا انتظام نہ کر لیا ہو۔ اس وقت تو میرا فرض تھا کہ اس کی اس غلطی سے آگاہ کر دوں۔ لیکن میں نہ جانے کیوں خاموش بیٹھا دیکھتا رہ جاتا۔ یا چٹلانہ کھانے کا اظہار کر کے الگ جا بیٹھتا — اور جب وہ مرچ کی زیادتی سے پریشان ہو کر اِدھر اُدھر دوڑتا — اور کسی کو کسی کے گھر سے پانی مانگ لانے کا حکم دیتا — تو بھی میں اس سے نہ کہہ پاتا کہ اب آئندہ پانی کا انتظام کر لینا — مجھے اقرار ہے کہ اکثر میں نے اس کے معاملات سے لاپرواہی برتی ہے۔ اس لئے کہ میرے خیال میں وہ بالکل میرے جیسا تھا۔ پھر یہ انفرادیت کیوں؟ وہ اپنے کو چھپا کیوں لے جاتا ہے؟ پہلے کی طرح کہہ کیوں نہیں دیتا؟ کیا صرف اس لئے وہ

منفرد ہے کہ وہ گھر سے باہر نکل کر مجھ سے ملتا ہے اور میں گھر میں رہ کر ملتا ہوں ؟ اس طرح اب تو وہ کسی تیسرے سے اظہار نفرت میں بھی مجھے مات دے دیتا۔ کہ اب وہ خاموش رہتا۔ اور میں اُبل پڑتا تھا۔ حالاں کہ میں اس کے بارے میں سب سے زیادہ جانتا ہوں۔ شاید اس سے بھی زیادہ۔

میں تو یہ بھی جانتا ہوں کہ جب وہ گاؤں کی ایک بھوکے کسے ہوئے گریبان میں جھانکنے کی کوشش کرتا ہے وہ بہو بہت خوش ہوتی ہے (اس لئے کہ جب میں نے یہ کوشش نہیں کی تھی تو وہ بہت ناراض ہوئی تھی) اور ایسا کرتے وقت اکثر اس کا ادھ میلا پاجامہ نم ہو جاتا تھا۔ لیکن میں اسے روک نہ سکتا تھا۔ اور کیوں روکوں۔ کہ وہ اپنے افعال کا خود مختار ہو کر بڑبڑایا کرتا ــــ "آتما صرف دیکھتی ہے، سب کچھ دیکھتی ہے مگر رائے یا منظوری نہیں دیتی ــــ اس لئے کہ آتما کو اس کا کوئی حق ہی نہیں ہے۔"

اسی لئے میں اس وقت بھی مطمئن و خاموش تھا جب اس پر اسی بیاہتا عورت سے تعلقات کا الزام بھری محفل میں لگایا گیا ــــ اگر اس دن اسے غصہ نہ آتا تو شاید میں اسے کھو بیٹھتا۔ اس لئے کہ اس کا غصہ ہی مجھے سدا عزیز رہا ہے۔ اس لئے کہ وہ اسی وقت سے "اُبھے" کا حامی تھا۔ تب ہی تو لوگ کہتے ہیں کہ اگر وہ کسی درخت کے نیچے بھی کھڑا ہو کر کہے۔ ــــ کہ تو نے پھل چرائے ہیں ــــ تو وہ درخت بلا پس و پیش سارے پھل اُگل دیگا۔ ـ جنھیں کہ وہ اگلی فصل کے لئے محفوظ کر چکا ہوگا ــــ

اکثر لوگ تو اس کے اسی "ابھے" کی وجہ سے ناراض رہے ہیں۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ شاید یہ 'ابھے' بھی انھیں ناراض لوگوں کا عطا کردہ ہے ــــ یہ میں اس کی صفائی نہیں دے رہا ہوں۔ اسلئے کہ وہ اکثر مواقع پر اب بھی اتنا ہی خود غرض بن جاتا ہے۔ کہ سوائے اپنے کوئی نظر نہیں آتا ــــ گو کہ وہ اس کی تاویل بھی پیش کر دیتا ہے۔ "کیا کروں کہ مجھے اپنے علاوہ اس کا حق دار اب تک کوئی دوسرا نظر ہی نہیں آیا ہے ــــ اور چونکہ میں اپنے کو سب سے زیادہ جانتا ہوں اس لئے اپنے سے ہی قریب ہو جاتا ہوں" ــــ مگر میں جانتا ہوں کہ یہ تاویل بھی اس نے بعد میں سوچی ہوگی اس لئے کہ

"جب چیزوں سے لگاؤ کا موہ ــــ فرض شناسی کو ہڑپ کر لیتا ہے ــــ تو ہمیں فلسفہ یاد آتا ہے۔" (یہ اس نے خود کہا تھا) "اور ہم چیخ چیخ کر اپنی بزدلی کو چھپاتے ہیں ــــ کہ جنگ بذات خود گناہ ہے۔"

پھر بھی اسے دکھ رہ جاتا ــــ ایک بار اس نے خود مجھ سے کہا تھا۔

"اس خونی چھتری دھرم سے تو سنیاس ہی اچھا تھا۔"

شاید اس وقت وہ بھول گیا تھا ــــ کہ وہ سنیاسی نہیں ہو سکتا ــــ اسی کے بہ قول ــــ تحفظ کی

باڑھ لگانا تو ہمارا فطری عمل ہے ـــــ اب اگر جنگل میں بھی کسی کو باڑھ لگانے کی ہوس ہوئی تو ـــــ ؟ نہ جانے کتنے درختوں کی سوکھی ٹہنیوں کا خون ہوگا" ـــــ بے چارہ فلسفی ـــــ

لیکن یہ ساری باتیں تو اس نے تیسرے سفر کی واپسی کے کئی سال بعد سوچی ـــــ اور کہی تھی ـــــ

پہلے سفر پہ وہ خاموش رہا۔ دوسرے سفر پہ اس شکارگاہ کی شان بتاتا رہا۔

تیسرے سفر کے بعد "بے ستون" کے پاس اس نے بتایا کہ جس کی انگلیاں ذرا سا بھٹکی ہوں گی۔ میں اسی سے بیاہ رچاؤں گا ـــــ !!

لیکن اگر کہیں اس نے کہہ دیا کہ 'میں مالا اسی شخص کے گلے میں ڈالوں گی جسے میری چاہ نہ ہوگی'

ـــــ تب ـــــ ؟ تب میں اپنے کو لیجا کر کہاں پھینکوں گا ـــــ ؟

میں خاموش اوپر اڑتی ہوئی چیل کو دیکھتا رہا۔

ہو سکتا ہے کہ کچھ لوگ اسے گہرا، عجیب سمجھتے ہوں لیکن میں جانتا ہوں کہ وہ ہلکا، کم نفد اور بندل بھی ہے۔ اس لئے کہ اکثر اس نے اپنے کو ابال دیا ہے۔ جب کہ میں نے کبھی ایسا نہیں کیا۔ بزعم خود۔

لیکن اپنے تیسرے سفر کے بعد سے ہی اس میں تتو گیانی کی جھلکی نظر آنے لگی تھی۔ جب کہ اس نے کہا "میں یہ فانی جسم نہیں ہوں۔ میں کبھی نہ مرنے والی غیر منقسم وسیع آتما ہوں" تو میں نے اپنے آپ سے کہا۔ اب اس کا سارا کریڈٹ تو اس کے تیسرے سفر کو ہی ہے۔ اس کا اپنے پاس اپنا کیا ہے۔ تیسرا سفر۔ تیسرا سفر۔ تیسرا سفر۔ بس ختم۔ اس کے نزدیک تو اب بھی جسم اتنا ہی اہم ہے جتنا دوسروں کے لئے۔ بس یہ اپنے معاملات میں چالاک ہے۔ کہ جب تک جسم خود ہی اس کے ہاتھوں میں نہ ٹپک پڑے۔ ماحول پر سکون نہ ہو۔ وہ ہونٹ لگانا تو دور اس کی طرف دیکھے گا بھی نہیں ـــــ لیکن جب دیکھے گا ـــــ تو دھاگوں کے بہت سے جال بھی فوراً ضرور بن ڈالے گا ـــــ "جو جال تمہارے مزاج سے مطابقت رکھتا ہو۔ آؤ۔ اسی میں پھنس جاؤ ـــــ !!

یہیں کہیں پر اس کی ماں بھی اس سے دھوکا کھا جاتی تھی ـــــ اس لئے کہ وہ واقعی 'ان' سے بہت بلند تھا۔ جو آنکھیں بند کر کے جسم، جسم، جسم، جس۔ ج۔ ج ـــــ ج۔ کرتے ہیں ـــــ اور ایسوں ہی سے نفرت میں ہم دونوں بالکل ایک ہو جاتے تھے۔ اور میں بہت خوش ہوتا تھا کہ میرے ساتھ ایک ہی بیت الخلا میں بیٹھ کر بھی اس نے اپنے کو مجھ سے الگ نہیں کر لیا۔ مجھے کمتر نہ جانا۔ شاید اس کے لادے ہوئے سنیاس نے خود اسے ہی اس احساس کمتری میں مبتلا کر رکھا تھا۔

اس لئے اکثر وہ بڑی حسرت سے میرے ہاف پینٹ۔ میرے مفلر، میری سفید بنیائنوں اور

چمکتے ہوئے سیاہ جوتوں کو دیکھا کرتا تھا اور جب میں اسے بتاتا کہ نئے جوتوں کی خواہش میں اکثر میں نے اپنے نیم کہنہ جوتوں کو پھاڑ دیا ہے۔ یا بلیڈ سے رگڑ ڈالا ہے تو ان نیم کہنہ جوتوں کا سارا کرب مجھے اس کی آنکھوں میں دکھائی دے جاتا تھا۔ اور تب وہ پیال کے بستر پر لیٹ کر دیر تک خوشبودار بنیائن، چمک دار جوتے، میٹھی ٹھنڈی آئس کریم کی بہت پر اسرار باتیں کیا کرتا تھا۔ اور اس طرح وہ اپنے اردگرد کی قدیم لوبانی بو سے نجات پالیا کرتا تھا جس کی نشان دہی اس کی گہری نیند کیا کرتی تھی ——

اسی طرح تین پتیا کے ساتھ سونٹھ اور ناریل پڑا ہوا گڑ کھاتے وقت بھی وہ اکثر اپنے اس ملبے چوڑے جیب کو بھول جاتا۔ جو صرف جوار کا لاوا رکھنے کے لئے ہی بنایا جاتا تھا۔ تاکہ بچے رات کو لحاف میں گھس کر اسے کھاتے رہیں۔ لیکن وہ تو رات میں گھر کے اندر جاتا ہی نہ تھا۔ اس لئے کہ گھر میں اس کے لئے کوئی لالٹین نہ تھی۔ اور ڈیوڑھی کے سانپ ہمیشہ سے اس کی گھات میں بیٹھے رہے ہیں —— ہزار پروں والی چمگادڑیں اور بڑے دانتوں والے بھوت۔ جن کے پیر کے پنجے ہمیشہ اینڈی کی طرف ہوا کرتے تھے۔ اس کے منتظر رہتے۔ اس لئے کہ وہ تو گوبر کے ایک معمولی ڈھیر میں بھی چھپ سکتے ہیں۔

وہ تو یہ بھی بھول جانا چاہتا تھا —— کہ اس کے چچا نے اتنے طویل سفر میں بھی اسے ایک چپل (جوتہ نہیں) خرید کر نہ دی تھی۔ اس لئے کہ اسے تھرموس میں چائے۔ کافی اور چیپس کے پیکٹ لینے تھے۔ تاکہ وہ سکنڈ کلاس کے مسافروں میں اپنے کو ایڈجسٹ کر سکے۔ اور اسی لئے اسے اپنی چچی کی بہت پہلے اتار کر پھینکی ہوئی زنانہ سینڈل پہن کر ہی سفر کرنا پڑا —— طویل دوسرا سفر۔

کتنا مجبور دکھا تھا وہ —— کہ نہ ہی سفر سے انکار کر سکتا تھا۔ نہ ہی وہ زنانہ سینڈل اتار کر پھینک سکتا —— یا سہولت سے کونے میں سجا سکتا تھا —— اس لئے کہ صرف عطاؤں کو قبول کر لینا ہی تو اس کی عادت بنائی جا رہی تھی۔ اور اسی لئے ہمدردی کا اظہار بھی اس کے لئے غیر ضروری تھا۔ اسے تو بہر حال تزکیۂ نفس کرنا تھا اور اسی لئے امتحاناً اسے صرف چارمینار کا ایک پیکٹ لینے کے لئے پانچ میل دور بھیجا جاتا —— اور تاکید ہوتی کہ سورج کے غروب ہونے سے پہلے آ جاؤ —— (دیکھیں تو سہی گھوڑا چلا۔ یا نہیں؟) اور واپسی پر اس کا دوسرا درس شروع ہو جاتا ——

"اب تم اور بفاتی —— بیٹھ کر چیری بلاسم سے ان جوتوں کو چمکاؤ —— جو کامیاب ہوگا اسے ایک پیسہ ملے گا۔" (دیکھیں تو سہی کہ اسے اپنا خیال تو نہیں آ جاتا۔ یا اس نے مساوات کے دیرینہ اصولوں کو تو نہیں بھلا دیا ——؟)

"لیکن عمو جان —— میں وہ والا پیسہ لوں گا —— جس کے بیچ میں سوراخ ہوتا ہے۔ اور چچی جان سے

ایک چوڑی بھی لوں گا. تاکہ بچا سکوں — ہاں —!"

کتنا معصوم تھا — وہ — یا کتنا مجبور تھا وہ. اس لئے کہ وہ خود ایک مادہ سانپ کا بچّہ تھا. ننھا سنپولیا — جس مادہ کو اسے جنتے وقت صرف ابلی ہوئی سوہیا اور مرچیہ بھری ہوئی مٹر کھلائی جاتی تھی (تاکہ دودھ بڑھے، بچہ طاقت ور ہو جائے) — لیکن جب اس ننھے سنپولیا کو بھوک لگتی تو خود اپنا ہی پاخانہ کھا کر پیٹ بھر لیا کرتا تھا — اس لئے کہ وہ ایک مادہ سانپ کا جنا ہوا ننھا سنپولیا تھا. سنپولیا بیچارہ.

خیریت تھی کہ دوسروں کو اس سے ملنے سے نہ روکا گیا. ورنہ ہم سب کو مجبور ہونا پڑتا. صرف مادہ سانپ سے روکا گیا. کہ وہ بہت زیادہ زہریلی تھی — اور نر سانپ — خاموش — اپنے سوراخ میں اپنی کینچلی کے اندر تحفظ کے خواب دیکھا کرتا — اس لئے کہ وہ بھی مجبور تھا. کہ وہ بھی سنیاسی ہوتے ہوتے بچا تھا — وہ تو صرف اپنے سامنے کی زمین ہی نم کر سکتا تھا. بزدل بے چارا. جو پھن اٹھا کر اپنا حق بھی نہ مانگ سکا. بلکہ اپنے سارے کے سارے من کو انڈیل دینے کی خواہش میں حلق میں انگلی ڈال ڈال کر تے کرتا رہا. بغیر کسی عمل اور ریگیہ کے. افسوس بے چارہ. جو اپنے سنپولئے پر ہی اپنا قبضۂ قدرت دیکھتا رہا. اور دھمکاتا رہا — "دو بوند شبنم کا سہارا بھی چھین لوں گا" (اس لئے کہ انھیں شبنم کے قطروں نے اسے ذہنی، جسمانی اور روحانی اذیت میں مبتلا کر رکھا تھا.) تمھارے اس فرضی مامن سے تمھیں نکال دیا جائے گا (شاید اس لئے کہ وہ خود بھی سارے فرضی مامنوں کے کھوکھلے پن سے واقف ہو گیا تھا — بے چارہ گھر سے نکالا ہوا نر سانپ.)

یا شاید اس کے اندر بھی کوئی تتوگیانی چھپا بیٹھا رہا ہو؟ جس نے کبھی نہ خود ہی اپنے پھن کے امرت سے فائدہ اٹھایا. نہ کسی منسلک کو اپنے پھن کے امرت سے آشنا ہونے دیا — کاش وہ یہی بتا دیتا کہ اس پھن کے نیچے زہر پلاہل ہے. اسے نہ چھوڑ — لیکن شاید یہ بھی اس کے اصولوں کے خلاف تھا — یہ اس مادہ سانپ نے بتایا تھا.

اور اسی سبب سے وہ بھی اپنے پھن کے امرت سے واقف ہو کر تتوگیانی ہوتا گیا. اس لئے کہ تیسرے سفر کی واپسی پر اس نے مجھے سفید اور بسنتی رنگوں کے درمیان یہی سب بتایا تھا — تب ہی میں نے جانا کہ اب سب کچھ دیکھنے کا فراخ دلانہ نظریہ اسے حاصل ہو گیا ہے —

یہ سچ ہے کہ اس کا تیسرا سفر اسے بہت کچھ دے گیا تھا. اس لئے اس کا سارا کریڈٹ اسے نہیں اس کے تیسرے سفر کو ہے. پھر بھی میں نہیں قیاس کر سکا ہوں کہ کبھی وہ استھت پرگیہ بھی ہو سکتا ہے یا نہیں، بالذات قائم العقل — حالاں کہ وہ اب بھی بہت پرامید ہے. لیکن میں جانتا ہوں کہ جب تک

نرگن سانکھ بدھی۔ نہ ہو۔ ساکار آسخت پر گیہ۔ اور تکمیل کا خیال بھی کتنا مضحکہ خیز بن جاتا ہے۔

۴

میں نے اسے کتنا منع کیا کہ اس تیسرے سفر کو ابتدا نہ بناؤ۔ لیکن وہ نہ مانا جس کے ہی نتیجہ میں آخر کار اسے 'سودھرم' بھی بھوگنا پڑا ___ اور وہ اسے مسلسل بھوگتا رہا۔ کہ وہ اس تیسرے سفر کو انجام دے چکا تھا۔

دوسروں کے نزدیک خواہ وہ کتنا ہی اہم اور ارتقاء کا پیش خیمہ رہا ہو۔ لیکن خود اس کے لیے کتنا خطرناک اور محبوس کن تھا ___؟ اور ہے ___ یہ مجھ سے زیادہ کون جان سکتا ہے۔ اس لئے کہ میں اس وقت بھی اس کے اندر موجود تھا۔ جب اس کے ذہن میں کسی سفر کے نقوش تھے ہی نہیں۔ لیکن جب اس نے یہ سفر شروع کیا تو بھی میرے سامنے اس کے اتنے بھیانک نتائج نہ تھے اسی لئے اس سفر کے سارے خطوط مندمل ہوتے جا رہے تھے۔ شاید اب اس خانہ میں تین ہی دروازے منھ بند ہوں ___ ورنہ سارے خانوں میں تو گرد بھر چکی ہے۔ میں کر بھی کیا سکتا تھا کہ میرا طمئمد ___؟

مجھے یاد نہیں کہ میں اس کے پاس کب آیا تھا۔ یا کون سی طاقتیں مجھے اس کے پاس لے آئی تھیں یا شاید وہی سب سے پہلے مجھ سے ملا ہو۔ اس لئے کہ جب میری آنکھ کھلی تھی تو میں نے اپنے کو اسی کے اندر پایا تھا۔ محبوس۔ اپنی ہی کیچلی کا قیدی ___ اور بچ بچی آنکھوں سے اِدھر اُدھر دیکھتا رہا ___

اور وہ اس آوارہ رُوح کی طرح چکرا رہا تھا جس کے سارے رشتے سارے عالم کی ارواح سے منقطع ہو چکے تھے۔ شاید اسی کو تنہا نسبی کہتے ہوں گے ___؟

میں اس وقت بھی اس کے ساتھ تھا جب وہ اپنے بارے میں بھی کچھ نہیں جانتا تھا ___ صرف ماں کی ان مقدس چھاتیوں کا تصور تھا جن کی طرف وہ ہر دس منٹ کے بعد ہمکا کرتا تھا ___ اور بہن کی تلاش میں وہ ساری خلوتوں میں جھانکتا پھرتا۔ جو اسے گود میں اٹھا سکے۔ اور یہ جس سے لڑ سکے ___ پھر میں شاید۔ بہ اس وقت بھی اس کے ہی اندر محفوظ تھا جب کہ وہ لاتعداد ارضی بدروحوں کا محبوس تھا ___ مجبور مقید ___ جہاں کرب زدگی میں وہ صرف اپنے ابھرے ہوئے بازوؤں کا گوشت نوچ لیا کرتا تھا ___ اور پھر میں نے اس وقت آنکھ کھول کر اسے دیکھا جب وہ قبرستان کی قدیم ترین قبروں پر سر ٹکا کر لیٹا رہتا تھا۔ میں نے اندر ہی اندر اپنی ادھ کھلی آنکھوں سے کئی بار اسے اشارہ کیا کہ ان قبروں سے الگ

ہٹ جاؤ۔ یہ بھی تمہاری دشمن ہو سکتی ہیں۔ اس لئے کہ تم انھیں نہ دیکھ سکو گے نہ ہی محسوس کر سکو گے اور وہ نہ صرف تمھیں دیکھ سکتی ہیں۔ چھو سکتی ہے بلکہ تم میں سرایت بھی کر سکتی ہیں۔ میں نے اندر ہی اندر اسے جھنجھوڑ کر کہا "ہوشیار" ۔۔۔ لیکن وہ کیسے سنتا کہ وہ تو ان قدیم ترین روحوں، سے درس لے رہا تھا ۔۔۔ ہاں واقعی۔ میں جو اس کے اندر محفوظ تھا۔ علم کی ساری مرتعش لہروں کو محسوس اور اپنے میں جذب کرتا جا رہا تھا۔ اور وہ روحیں ۔۔۔ نہ جانے کیوں ؟ اپنا سارا علم اسے سونپ رہی ۔۔۔ تھیں .... اور میں خاموشی سے اپنے معینہ لمحے کا انتظار کر رہا تھا۔ اور اب ادھر سے ناکام ہو کر میں نے اسے سمجھایا ۔۔۔ روکا۔ کہ وہ سفید اور بسنتی رنگوں کو کبھی نہ پسند کرے ۔۔۔ لیکن .... اور میں بھی کیا کر سکتا تھا۔ کہ ابھی میرا ظہور ۔؟

میں اسے نہیں بتانا چاہتا تھا کہ ہماری زمینوں کے نیچے بھی ایک زمین ہوا کرتی ہے۔ اس لئے کہ اس کے آباد اجداد میں سے کسی نے یہ راز نہ جانا تھا۔ اسی طرح میں نے اسے کنول کے پھولوں سے محفوظ رکھنا چاہا کہ ان کی سفیدی اور سرخی میں بد روحیں رہتی ہیں جو چاندنی رات میں اپنے اپنے مسکنوں سے باہر آ کر روتی ہیں ۔۔۔ لیکن یہاں تو وہی بد روحیں اسے روحانیت کا درس دے رہی تھیں اور اپنے ساتھ بیکراں خلاؤں میں اڑا لے جاتی تھیں اور پھر صحیح و سالم واپس کر جاتی تھیں۔ مجھے حیرت ہوتی کہ یہ سورج تک (جو ساری ساکن و متحرک آتماؤں کا مسکن ہے۔) جا کر بھی اس کے اوپر کیوں جانا چاہتا ہے۔ میں تو بے بس ہوں۔ اور وہ لاپروا۔ اپنے ابتدائی 'ابھے' کا حامل۔

لیکن میں جانتا تھا کہ گناہ تو ہمیشہ ہمارے وجود کی دراڑوں سے جھانکتا رہتا ہے۔ اور جسے ختم کر دینا ہم سب کے بس سے باہر ہو جاتا ہے اور بس انھیں باطن کی بھٹی میں جلا دینا ہی ہماری ارتقا ہوتی ہے ۔۔۔ ہم میں سرشاری آتی ہے ۔۔۔

لیکن اس میں تو سرشاری کے بجائے ہوش و واقفیت آتی جا رہی تھی۔ اور نہ جانے کس دراڑ سے وہ بوڑھیوں کی طرح غم کا احساس لے آیا تھا۔ اور وہی ہنسی ہنسنے لگتا تھا جو اکثر راتوں کو۔ قبرستان کی گیانی روحیں ہنسا کرتی ہیں۔ جہاں شاید سارے کرب اپنی اصلیت کھو بیٹھتے ہیں۔ یا ہم ایسا سوچتے ہیں کہ وہ اصلیت کھو چکے ہیں۔ لیکن اس نے تو کالے پھولوں پر سفید اور بسنتی رنگوں سے نہ جانے کیا لکھ دیا تھا ۔۔۔ اور اب ان کنول سے بھرے تالابوں سے بھی بہت اوپر اٹھ رہا تھا۔ غیر محسوس طریقے سے جسے میں بھی نہ محسوس کر سکا ورنہ شاید روکنے کی کوشش کرتا۔ اس لئے کہ میں تو اسی کے اندر محفوظ تھا ۔۔۔ لیکن کیا کرتا کہ اس پر تو اس کے آبا و اجداد کی نہ مری ہوئی روحوں کا قبضہ تھا۔ اور وہ مقدس روحیں اپنا سارا علم اسے سونپ رہی تھیں۔ جنھیں وہ چوس چوس کر اپنے میں سرایت کرتا جاتا تھا اور میں بے بس تھا۔

اس لئے کہ نہ جانے کس نے مجھ سے کہہ دیا تھا کہ — اس کے گرنے سے بہت سے عالم گر جائیں گے۔ اور چاروں طرف ماتم ہونے لگے گا — ان مردہ قبرستانوں کا ماتم کتنا شدید ہوتا ہوگا —؟ کیا جانے پہلے کبھی ہوا ہے یا نہیں۔!!

لیکن میرے ظہور کے لئے تو ایک وقت معین ہو چکا تھا۔ اور اسی درمیان اس نے تیسرے سفر کی ابتدا کر دی تھی۔ اور میں وِشاد یوگ، جذبۂ غم و یاس کے چکر میں پڑ کر پرشاد یوگ یعنی آخری جزا کا انتظار کرتے رہنے پر مجبور ہوتا گیا۔ دیکھیں یہ پرساد یوگ اب کون سا رنگ لے کر آتا ہے۔

آم کے درختوں میں چھپے قبرستان سے نکل کر اس نے کہا، سنو ہمارا فرض صرف اتنا ہی نہیں ہے کہ ہم اپنے ہم عصروں میں ممتاز ہوں — بلکہ ہمیں اپنے بعد والوں کے تجربہ کی کسوٹی پر بھی پرکھا جانا ہے — جس کا نتیجہ ہم نہیں جانتے۔

اس لئے ہماری ذمہ داری اب آج سے کئی گنا بڑھ گئی ہے۔

اور میں ڈرا سہما اسے اس قبرستان کی حدود سے نکال لایا۔

اکثر میں اس سے نفرت بھی کرنے لگا ہوں — جہاں وہ رُوحوں سے چشم پوشی کر کے نچلی سطح پر آ جاتا تھا اور تینجی چرا کر خلوت کی مٹیوں میں دفن کرنے لگتا تھا — یا — بوڑھیوں کی ڈھلی چھاتیوں کا تصور کر کے اپنی ہی پھوپھی کو اپنی بغل میں عریاں سوتا ہوا دیکھتا تھا — لیکن نہ جانے پھر بھی میں کیوں بے بس رہ جاتا۔ صرف یہ سوچ کر کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ "پیاری گائے کی شکل میں وہ خود ہی دروازہ پر کھڑا ہو۔" اس لئے بے زبان ہو کر ان حرکات کو صرف 'آسری سمپتی' کہہ کر 'دیوی سمپتی' کا روشن دن تلاش کرنے لگتا تھا۔ اس لئے کہ ابھی وہ خود ہی مجھ سے غافل تھا۔ اور میں خود بھی تب اپنے وجود میں سفر طاقتوں کا احساس نہ کر سکا تھا —

۵

اسی طرح جب اس نے تیسرے سفر کا آغاز کر دیا تو بھی اسے اس کا احساس نہ تھا کہ کل یہ سفر اتنا بھیانک ہو جائے گا۔ اس وقت تو میں بھی اسے سمجھا نہیں سکتا تھا کہ آتما صرف دیکھتی ہے رائے یا منظوری نہیں دیتی۔ بس میں سوچا کرتا اور بڑبڑایا کرتا.....

"ماٹی ناٹ تمارے ہاتھے۔ پربھو سنبھال جو رے!"

یہ بھی میں نے اس وقت کہا تھا جب تیسرے سفر کے تیسرے واقعہ کے بعد اس نے مینڑکی کتابوں پر سر ٹپکنا شروع کر دیا تھا۔

"یا خدا۔ ابھی تو یہ اپنے کو چن چن کر جمع ہی کر رہا ہے ابھی اسے اداسی اور کرب کی خوشبو سے آشنا نہ کر۔"

لیکن وہ تو مسکرا رہا تھا ـــ کہ یہ تو تتوگنی ہونے والا تھا ـــ بے چارہ تتوگنی لڑکا۔

پھر جب وہ چھت کی اٹھارہ کڑیوں کو گواہ بنا کر کھڑکی کی طرف جانے لگا ـــ تو میں چیخ اٹھا۔ اور زبردستی اسے دوسری کھڑکی سے مسجد میں کھینچ لے گیا اور پھر خود بھی اس کے ساتھ سربسجود ہو گیا ـــ "اسے اپنے حفظ و امان میں رکھنا۔ تاکہ یہ تتوگنی ہو سکے ـــ کاش یہ اپنے اس تیسرے سفر کو فراموش کر سکے۔"

لیکن اسی سجدہ کے دوران ہی دونوں طاقتوں میں ٹکراؤ ہو گیا جب تک طاغوتیت رحمانیت سے الگ رہی میں مطمئن تھا کہ وہ محفوظ ہے۔ لیکن جب طاغوتیت نے لبادہ اوڑھ لیا تو مجھے اس کی طرف سے شدید خطرہ محسوس ہوا ـــ اب پھر کوئی 'پیر' اپنے تقدس کے حصار میں لے کر اس کے سر پر چوٹ کا۔ اور چیخے گا۔ انت قلبی ـــ انت دینی ـــ دانت ربی۔

پھر اب تک تو اسے وہ ہالہ بچائے ہوئے تھا۔ جو اس کے فطری رجوگن نے تان رکھا تھا۔ اور تہ خانے کی مسموم، نم زدہ سیلی ہوئی باس سے یہ بغیر کسی امداد کے محفوظ تھا ـــ لیکن کب تک؟ سب ہی تو علم رکھتے تھے اس تہ خانے کا.... کسی نے کیا کر لیا؟ اس کی تاریکیاں تو صدیوں سے ایک کے بعد دوسری روشنی کی قربانی لیتی رہی ہیں ـــ گو کہ میں جانتا تھا کہ میں خود بھی ابھی کمزور ہوں لیکن اسے وہاں سے نکال لینا مجھے میرا فرض لگا۔

بس میرا یہی فعل ایک نہیں کئی بہت بڑے طوفانوں کا پیش خیمہ بنتا گیا۔ اور میں اپنے آپ سے شرمندہ محدود ہوتا گیا ـــ اگر میں جانتا کہ میرے اس فعل کا انجام اتنا خطرناک ہوگا تو کبھی یہ اقدام نہ کرتا۔ اس لئے کہ اپنی بعد کی کمزوریوں کا احساس خود مجھے بھی نہ تھا ـــ گو کہ اس نے کبھی مجھ سے شکایت نہ کی بلکہ ہمیشہ ہی میرے اس اقدام کو سراہتا رہا۔ لیکن میں نادم تھا۔ اس لئے کہ یقیناً اس کے بعد کی روحانی و جسمانی اذیتوں کا ذمہ دار میں ہی تھا۔ صرف میں۔ اسی لئے دوسروں کی گالیاں سُن کر۔ نفرت زدہ تیر سہہ کر بھی خاموش رہ جاتا اس لئے کہ اس کا 'ایلھ' بھی خاموش اور متفکر تھا۔

ہوا یہ کہ جب میں اسے لے کر نکلا تو میرے سامنے بھی کوئی لیک نہ تھی۔ ایک ہی راستہ تھا وہ بھی کافی پامال اور گندہ جس پر چلنا خود اپنی موت تھی اور میں اپنے ظہور سے پہلے مرنا نہ چاہتا تھا۔

اور میری یہی خود غرضی میری بنیادی غلطی ہوگئی ۔۔ جب پاک باز روحوں نے میرے فرار کو جانا تو سمجھیں کہ میں اسے قلعہ نجات سے باہر کھینچ لے گیا ہوں۔ اور نفرت زدگی کی انتہا ہوگئی ۔ میں مجبور بے بسی سے روتا رہا۔ اور جب کچھ سمجھ میں نہیں آیا تو اپنی کم زوری کا اعتراف کرتے ہوئے میں نے اسے تمھارے سپرد کر دیا.... اور کاش میں نے یہ دوسری غلطی نہ کی ہوتی۔

گو کہ اب بھی اسے یہ یقین نہیں ہے کہ میں نے ہی مجبوراً اسے تمھارے حوالہ کیا تھا۔ وہ تو یہی سمجھتا ہے کہ وہ لاشعوری طور سے اس بار کو اٹھا رہا ہے جس کا اٹھانا اس کا مقدر ہو چکا ہے۔ کہ یہ اہل افلاک کا طے شدہ منصوبہ تھا۔ اور اسی لئے خاموشی سے برداشت بھی کرتا گیا ۔۔۔ یہی اچھا ہوا ورنہ میں آج منہ بنا کر، تیوریاں چڑھا کر اس کو ملامت کیسے کرتا۔ اور اپنی اکتاہٹ کا اظہار کر کے واپس چلے جانے کی دھمکی کیسے دیتا۔ لیکن کاش مجھے معلوم ہو جاتا کہ تمھارے حوالہ کر دینے کا مقصد ہے کہ خود اس سے ہاتھ دھولوں ۔۔ جس کا نتیجہ ہے کہ آج جب کہ میرا ظہور عین قریب ہے میں اس پر اپنی گرفت کم زور پاتا ہوں۔ اور اسی لئے تو مجھے اس سے استدعا کرنی پڑتی ہے۔

آجاؤ ۔۔ ! بھائی کاظم آجاؤ۔ میں ہی تمھارا ہم درد ہوں۔ میں ہی اصل حقیقت ہوں ابدی حقیقت۔ میں ہی تمھارا عرفان ہوں۔ ازلی عرفان۔

لیکن اب تو اکثر وہ پھسل جاتا ہے۔ اور تب میں افسوس و بے چارگی سے اسے دیکھا کرتا ہوں۔ جب اس کی حلق میں گو کھرو پھنستا ہے تو میرا ہاتھ اپنی حلق پر پہونچ جاتا ہے۔ جب اس کے نتھنوں میں فولادی اسپرنگوں کا تناؤ بڑھ جاتا ہے تو میری سانسیں رکنے لگتی ہیں۔ جب اس کی آنکھیں سمندر کے موہوم دھاگوں سے بندھ جاتی ہیں تو میں ٹکٹکی لگائے صرف اسے دیکھتا رہتا ہوں ۔۔ ہائے بھائی کاظم میں نے تمھارے ساتھ یہ کون سا ظلم کر دیا۔؟

لیکن یہ نہ کرتا تو کیا کرتا کہ میں کم زور پڑ چکا تھا۔ اور وہ مکمل طور سے مسمرائزڈ ہو چکا تھا ۔۔ جس کا ثبوت ۲۶ مئی کا سفر تھا ۔۔

"بھگوان ! ذرا میرا گانڈیو تو مجھے دیجئے۔ اور ان دونوں فوجوں کے درمیان میرے رتھ کو کھڑا تو کر دیجئے۔ تاکہ میں ایک بار ان لوگوں کے چہرے تو دیکھ لوں جو مجھ سے لڑنے آئے ہیں ۔۔"

اور یہ کہتے ہی اس کی تمام شب بیداریوں کا خاتمہ ہو گیا۔ میں نے دور سے پھر سمجھایا ۔۔

"ذرا اکرم کے ساتھ و کرم کا بھی خیال رکھنا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ...." لیکن اس نے مجھے جھٹک دیا۔ اور فرار کے لئے گھر کے عقبی دروازہ کو اختیار کر بیٹھا۔ اور بولا۔

"افعال میں اپنی آتما۔ (جواب تمھاری نہیں خیر کی ہو چکی ہے) انڈیل دو۔ اور سبک دوش ہو جاؤ"
تب میں نے اس کے کاندھے پر کھڑے ہو کر دیکھا اور واقعی کافی دور تک دیکھ سکا — ورنہ میں تو ابھی بچہ تھا — جو — اور سوچا کہ — ہر دے شنتھن کے بغیر عرفان کا نام لینا بھی واقعی ایک مذاق ہی ہوگا۔
لیکن کیا سودھرم بتانے کے لئے اسے بھی کسی کی ضرورت ہوگی جو گیتا کے شلوک سنا سکے؟ شاید نہ ہو اس لئے کہ وہ تو اپنے تیسرے سفر کے بعد سے ہی مسحور ہو گیا تھا۔ اب اس کے سارے اقدام کسی دوسری بندھی ہوئی ڈور سے منسلک ہو چکے تھے۔ اور اب تو میں نے خود ہی اسے اس کے حوالہ کر کے کسر پوری کر دی ہے اور خود سے کھو بیٹھا ہوں۔ کاش تیسرے سفر کا کوئی وجود ہی نہ ہوا کرتا۔ تاکہ کسی کو کسی کے حوالہ کر دینے کے کرب سے گذرنا ہی نہ پڑتا — کاش میں نے اسے اس کے حوالہ نہ کیا ہوتا — اکاش قبرستان کی مقدس روحوں نے اسے اپنے حلقہ میں نہ لیا ہوتا — کاش اسے سودھرم کا منھ بند راز نہ معلوم ہوا ہوتا۔

۶

لوگوں نے سمجھا کہ میں نے مسحور ہو کر غلط قدم اٹھایا ہے — یہ بات تو خود اس شخص نے بھی مجھ سے کہی تھی جو نجانے کب میرے اندر آ بیٹھا تھا؟ لیکن شکر ہے کہ مجھ میں اتنی طاقت آ چکی تھی کہ اپنے فیصلوں پر اٹل رہ سکوں۔ اس لئے کہ میرا انگوٹھا مضبوط اور سیدھا تھا۔
لوگوں نے طنز میں میرے اس تیسرے سفر پر کیچڑ اُچھالی — لیکن میں تو جانتا تھا کہ وہ — معصوم ہے۔ یہ سب تو پہلے ہی میرے مقدر میں لکھا جا چکا تھا۔ شاید میں ہی وہ ذبح عظیم ہوں جسے اطمینان نفس کی منزل پر پہونچنا ہے — ؟ یہ بات مجھے اس کنول کے پھول اور اس قبرستان کی قدیم اور مقدس روحوں نے بتائی تھی — جن کا بھوگنا اب میرا فرض تھا۔ اور میں اسے بھوگتا رہا۔
وہ لوگ جنھوں نے اس سفر میں ہم رکابی کا وعدہ کیا تھا راستے ہی دغا دے گئے تو میں صرف ایک عطر کی شیشی اور صرف ایک ہی پیر میں لشپا دری سینڈل پہنے کارواں کے ساتھ ہو لیا۔ مجھے آج بھی اس سفر پر افسوس نہیں ہے کہ میں آج تک ثابت قدم ہوں۔ وہ شخص تو بلا وجہ شرمندہ ہے کہ اس نے مجھے اس کے حوالہ کیا۔ میں تو اس کا متشکر ہوں کہ اسی کی وجہ سے مجھے میرا اپنا کھویا ہوا آتموگن واپس مل گیا۔ اس لئے کہ اس داستان کے اس مخصوص حصہ کو تو قبرستان کی مقدس روحیں بھی چھپائے گئی تھیں — کہ.
جب مجھے شدت سے بھوک لگے تو میں کسی سے نہ مانگوں (تاکہ تزکیۂ نفس کر سکوں) جب مجھے ٹھکرایا جائے تو میں قہقہہ لگاؤں (تاکہ سب کچھ دیکھ سکنے کا فراخ دلانہ نظریہ ہاتھ آئے) جب بے پیش کش ملے تو میں انھیں ٹھکرا دوں (تاکہ عطا کا جذبہ پروان چڑھ سکے) اور سدا اپنے کو نم سی

آلودگیوں سے محفوظ رکھوں (تاکہ بلند ہو کر لطیف ہو جاؤں) اور ناک کو تین بار کچے سوت سے ناپنے پر ہی ہمیشہ اکتفا کرتا ہوں۔ شاید اسی لئے مجھے تو اس وقت بھی لطف ملا تھا جب رکشہ کی یخ بستہ ہینڈل پر میرے ہاتھ جم کر اکڑ گئے تھے اور صرف یہ احساس ڈنک مار رہا تھا کہ ابھی جاکر مجھے اپنے اس اکلوتے کرتے پائجامہ کو دھونا بھی ہے انھیں سکھانا بھی ہے تاکہ ان میں لپٹ کر صبح یونیورسٹی جا سکوں۔ اس نے کہ یہ اس کی وصیت تھی۔ لاشعوری وصیت۔ کہ تمھیں یہ سب کرنا ہے ...... اور تب جسے میں نے مرا ہوا فرض کر لیا تھا۔ اسی نے مجھے سم درشٹی دی ___ سب کچھ دیکھنے کا فراخ دلانہ نظریہ۔ اس لئے بہرحال میں اس کا ممنون ہوں۔

گو کہ وہ شخص اکثر افسوس کرتا کہ مجھے کیوں اس نے کسی دوسرے کے قبضہ میں دے دیا۔ لیکن وہ کیا کرتا۔ اس بے چارہ کو بھی کیا علم یہ تو میری تقدیر تھی۔ اور جو افلاک میں طے ہو جاتا ہے وہ ہو کر رہتا ہے۔ اس لئے کہ ان کی طاقت ہم سے بہت زیادہ ہے۔ وہ دیکھے نہیں جا سکتے اور ہم سب اپنی تمام پرتوں کے باوجود عریاں ہیں ___

اسی لئے تو کہتا ہوں کہ ساری زندگی ایک بہت بڑا المیہ ہے ___ اپنے ان طے شدہ مقدرات سے چھٹکارا پانے کی سعی ناکام کا۔ یا ان ہی پر ثابت قدم رہنے کا۔

لیکن اب ان شب و روز میں کتنا کرب سمٹ آیا ہے ___ کبھی تم نے بھی آکر دیکھا ہے۔ بس ایک حسن ظن ہی تو لے ڈوبا ___ کہ شاید اس تیسرے سفر کی کچھ یادیں محفوظ ہوں ___؟ اور وہ واقعی غیر محسوس طریقہ سے محسوس کر سکا ہو ___؟ میرے ان خون میں لت پت کاندھے کے کپڑے کو یا بھیگے ہوئے تکیوں کے دونوں حصوں کو ___ دیکھ سکا ہو ___ یا رات کے دو بجے میری آتما کی سسکیوں کو ___ سن کر پھر اکر جاگ سکا ہو ___ اگر نہیں ___ تو میرا یہ خود پر طاری کردہ ضبط مجھے لے کر کہاں کہاں بھٹکے گا ___؟ نہ جانے کون اسے پناہ دے گا؟

ایسے ہی اوقات میں وہ مجھے اکتاہٹ سے دیکھا کرتا تھا ___

ایک معمولی سے سفر کی معمولی سی یاد ___ اور پاگل پن۔ تمھیں ضرور مالی خولیا، ہو گیا ہے۔ کیا ان روحوں نے بس تمھیں یہی سبق دیا تھا ___؟ اگر ایسا تھا تو وہ سب ہرگز مقدس نہ تھیں۔ تم میں تو اہل افلاک نے تو گنی پتسوی کے عنصر چھپائے تھے ___ اب تم آخر اتنے معمولی کیوں ہو؟

اور اگر ہو تو۔ پھر یہ منفرد سے کیوں؟

بس وہ تو اس وقت خوش ہوتا تھا ___ جب میں انگلیوں کے لمس سے ہی کسی کو حاملہ

بنانے کا تصور کیا کرتا تھا۔

وہ اس وقت مطمئن ہو کر آنکھیں بند کر لیتا تھا جب میں گداز چھاتیوں کے لمس سے نظریں ملاتا۔ اور ان عورتوں کے بھیگے جسم کو مس کرنا ہی اپنا فطری عمل سمجھتا تھا۔ جہاں میرا فلسفہ اور سارا اصول یوں ختم ہو جاتا تھا جیسے میری اصل یہی نرم نرم سی غلاظت ہو۔ سارے سنسار کی اپسرا دیوتی یہی گدرائی ہوئی عورت کا غیر پاکیزہ جسم ہو۔ یہی لمس ہو اسی لئے کہ عورت کو صرف لمس کی خواہش ہوتی ہے۔ اس لئے کہ وہ سارے لمسوں کی گہرائی سے واقف ہوتی ہے۔

لیکن پھر کبھی جب میں اپنے کو بچا لینے کی کوشش میں کامیاب ہو جاتا تو ان عورتوں کے ساتھ ہی وہ بھی مجھے کدورت اور مضحکہ اڑانے کے انداز میں دیکھنے لگتا۔۔۔

میں آج تک نہیں سمجھ سکا ہوں کہ آخر مجھے اس نچلی سطح پر لا کر اسے کون سا حظ ملتا ہے۔؟ شاید اب وہ مجھے اس طرح سے گندا کر کے، میرے عمل کو خراب کر کے اس کے قبضہ سے نکالنا چاہتا ہے۔ کہ وہ میرے نہ ہو سکیں جن کے قبضہ میں رہنا ہی۔۔۔ افلاک میں طے ہو چکا ہے۔ یہ میں بھی اب جان گیا ہوں۔۔۔ اور یقیناً وہ بھی جانتا ہو گا۔۔ لیکن مجھ سے مخفی رکھے رہا۔

وہ تو بلا وجہ شرمندہ ہے کہ اس نے مجھے اس کے حوالہ کیا۔۔ بہر حال یہی سوچ کر سہی۔ خوش ہو لینے دو۔۔ ورنہ یہ تو اہل افلاک۔۔ لیکن کمزور ہم دونوں ہیں۔۔۔ وہ مجھے پستی میں ڈال کر اس کے قبضہ سے نکالنا چاہتا ہے اور میں پستی سے محفوظ رہ کر اس سے نکلنا چاہتا ہوں۔ لیکن دونوں ناکام ہوتے ہیں۔۔۔ تب میں اس حظ سے محظوظ ہوتا رہتا ہوں اور لگاتار ہونا چاہتا ہوں۔۔۔ اس لئے کہ جب پاپ سے مجھے پرمیشور کی یاد آتی ہے وہی پاپ مجھے ملنے دو۔۔ میں نادان ہوں۔۔۔ اس لئے گناہ کرتا ہوں۔ اس لئے اب تم مجھے اپنے آنچل میں لے لو۔۔۔ اور بچا لو۔ مجھے تو گناہ کرنے کے بعد تمہارا تصور ہی مقدس بنا دیتا ہے۔۔۔

ہو سکتا ہے کہ کچھ لوگ اسے بھی تاویل کہہ دیں۔۔۔ حالاں کہ۔

جب جنک نے شک سے پوچھا۔" راہ میں تم نے کیا دیکھا؟

تو شک نے جواب دیا۔" میں نے شہر میں چاروں طرف سجی ہوئی مٹھائیوں کی دوکانیں دیکھی ہیں۔۔۔ چلتے پھرتے۔۔۔ بولتے۔۔۔ شکر کے پتلے دیکھے ہیں۔۔۔ پھر شکر کا محل دیکھا، شکر کی سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آیا۔۔۔ اور تمام شکر کے سامان دیکھے"

اور تب جنک نے پوچھا:" لیکن اب کیا دیکھ رہے ہو۔۔۔؟"

شک نے فوراً جواب دیا ـــ" ایک شکر کا پتلہ ـــ دوسرے شکر کے پتلے سے بات کر رہا ہے۔"

تب جنک نے کچھ سوچ کر کہا: " جاؤ شک ـــ اب تم آستھت پر گیہ ہو چکے ہو ـــ اب تمھیں میری ضرورت نہیں ہے کہ تمھیں گیان دوں۔"

" جھینی جھینی بینی چندریا ـــ" میں نے تو تمھارے لئے سارے لمحات کو ایک چندری بننے میں گذار دیا ہے۔ اب مجھے کیا پتہ کہ میرے اردگرد اور کیا کچھ سجا ہوا تھا ـــ؟ کہاں پر گناہ کی سرحدیں شروع ہوتی ہیں اور کہاں سے تقدیس کی دلدل ختم ہوتی ہے؟؟

میں نے تو آتما کو من میں ہی پرو لیا تھا ـــ کہ شاید اب ایکار مل جائے ـــ ؟ شاید؟؟ میں تو اس آرت بھگت کی طرح بے قرار تھا۔ جو انتظار میں رہتا کہ کب اپنے من اور آتما کا امرت اس کے قدموں میں انڈیل دوں۔ کب پریم رس کو چکھوں۔؟ اور کب گلے مل کر ـــ سارا کرب اس کے حوالہ کر دوں اور اس کے دامن میں اپنے کو انڈیل کر سبک دوش ہو جاؤں۔ مجھے کیا پتہ کہ کن کن لطیف و رس دار پھلوں نے خود کو چکھے جانے کی پیش کش کی تھی۔ اس لئے کہ مجھ سے تو کسی مہا تیاگی نے بتا دیا تھا کہ تم جسم ہو ہی نہیں ـــ تم صرف آتما ہو۔ جو اپنا فرض اور مقدر کے لکھے کو پورا کرنے کے لئے ہی بھیجی گئی ہے ـــ اور جب جب اس حقیقت ابدی پر گندگی آ جانے کا اندیشہ ہوگا۔ تب تب تمھیں اس کو بچانے کے لئے ـــ جسم کو دور پھینکنا ہوگا۔

اسی لئے 'میں صرف جسم ہوں'۔ اس نے کبھی نہ سوچا ـــ

اس لئے کہ شاید وہ پھل بھی یہ نہ جانتے ہوں گے کہ چکھے جانے سے یا انگلیوں کے لمس کی خواہش میں وہ خود بھی ضائع ہو سکتے ہیں ـــ یا ضائع ہو رہے ہیں؟

میں نے تو اپنے سارے افعال اس کے سپرد کر دیئے تھے پھر ـــ سبک دوشی کیوں نہ حاصل ہوئی؟ مجھ میں ہراس کیوں پیدا ہوا؟ کیا وہی ٹھیک کہتا ہے کہ یہ میری بنیادی کمزوری تھی یا ـــ خون کا فساد ـــ؟

وہ تو کہتا ہے ـــ کہ: " تم خلوص سے ایک پتی چڑھاؤ ـــ! میں قبول کرتا ہوں۔" پھر اس نے میری اس چادر کو کیوں نامنظور کر دیا۔ جسے میں نے ۱۱ سال کی انتھک محنت میں بنا تھا ـــ کیا واقعی میں مخلص نہ تھا ـــ؟ سچا نہ تھا؟؟

میں نے تو سا تیتہ یوگیوں کی طرح اپنی سادھنا کو آخر وقت تک مسلسل جاری رکھا ہے۔ پھر

اس نے مجھے کیوں منع کر دیا تھا کہ ان متبرک پھولوں کو اتنا مس نہ کرو کہ ان کی خوشبوؤں میں تمہارے گندے پسینہ کی باس آجائے۔

مجھے اقرار ہے کہ میں بنیادی طور سے کمزور تھا ــ اسی لئے تو عبادت کی جزا مانگ بیٹھا ــ اور جس کے ہی نتیجہ میں ساری کرامات کھو بیٹھا ــ اور چوتھا سفر جاری ہو گیا۔ جہاں میری آتما کے بجائے۔ میرے ستوگن کو سکون بخشا گیا ــ گو کہ یہ بھی اسکی مشکوک عطا تھی ــ لیکن اس دوران میں نے، کتنے دکھ سہے ہیں۔ اس کا حساب کون دیکھے گا اور میں بھی کس کس کو حساب دیتا پھروں گا؟

میں نے تو فیصلہ کر لیا تھا کہ ــ لوں گا۔ تو پھل کے ساتھ۔ چھوڑوں گا تو کرم کے ساتھ۔ ورنہ لوں گا۔ نہ چھوڑوں گا ــ اب تو اداسی ہی میری پسندیدہ غذا ہے۔ اس لئے کہ روحوں نے خود ہی اپنے سارے غموں کو اپنی قبروں سے باہر چھوڑ دیا تھا۔ اور میں جیتا جاگتا دیر تھا جس میں ان نہ مرے ہوئے لوگوں کی ساری روایات مضمر تھیں۔ جن کا ہی میں نتیجہ ہوں۔ اور اب تو یہ سارے غم زدہ دید مجھ میں کئی گنا بڑھ گئے ہیں۔ اس لئے کہ میری گندگی اور آلودہ روح نے اس کی پاکیزگی کو اور بھی جلا دے دی ہے۔ صلہ اور جزا سے لاپرواہ ہو کر ــ اس لئے کہ میں پہلے سے ہی ان کا قرضدار ہوں تو پھر اجر کیسا؟

۷

میں یقیناً اپنی طبعی عمر سے پہلے ہی مار ڈالا گیا ہوں۔ اب تو مجھے اس وقت تک یہیں بھٹکنا ہوگا۔ جب تک کہ معینہ برس پورے نہ ہو جائیں۔ میں بھٹکوں گا۔ دروازہ دروازہ ٹھوکر کھاؤں گا۔ اور درد سے چیخوں گا ــ لیکن کوئی نہ ہوگا جو بڑھ کر پوچھے گا ــ "بھائی کا ظم کیا ہوا ہے تھیں؟"

بس وہ میری تعریف کریں گے۔ اور آنسوؤں کے چھینٹوں سے اس طرح بچیں گے جیسے جذام کے مسموم قطرے ہوں۔

یقیناً اب اسے اس منزل پر لا چکا ہوں جہاں سارے الفاظ معانی کھو بیٹھتے ہیں۔ جہاں رشتے ــ سارے تعلقات اپنی اصلیت اور سنہراپن زائل کر دیتے ہیں اور دوسرے یہ سمجھتے ہیں کہ کہ وہ تنہا نسبی کا شکار ہو گیا ہے ــ اور میں خود اب اس منزل پر ہوں جہاں خود اپنے سے بھی اظہار ہمدردی نہیں کر سکتا۔

اس لئے میں اس سے الگ ہو گیا تھا ــ اور اپنی کھوئی ہوئی قوتوں کو مجتمع کرنے لگا تھا ــ بالکل بے بس۔ بے حد مجبور کہ یہ اہل افلاک کا طے شدہ منصوبہ تھا۔ ان کی مصلحتیں وہ خود ہی جانیں۔ وہ تو اب کمرہ ۵۳ ـ ۵۵ میں محبوس ہو چکا تھا ــ ہر صبح پتھرائی ہوئی آنکھوں سے تین

میل کا سفر کرتا اور ہر شام الٹے پاؤں واپس آتا — نہ معلوم کتنے نیزوں نے اس کی ہڈیوں کو توڑا۔ کتنے تیروں نے اس کی رگوں کو کاٹا۔ اور کتنے پتھروں نے اس کے پیروں کے بڑھے ہوئے ناخنوں کو زخمی کیا — لیکن وہ چلتا رہا۔ کہ اس نے اپنے سارے کے سارے افعال کسی اور کے سپرد کر کے سبک دوشی کی خواہش کی تھی — شاید۔ اسی لئے تو مسحور ہو گیا تھا۔ بے چارہ مجبوس۔ تنہا نسب اور رب زدہ شخص —

میں اپنی پہلی ہی بنیادی غلطی پر نادم۔ اس سے بچا بچا پھرتا — اور وہ پھڑ پھڑاتا رہتا۔ اس کے سامنے صرف تین پر اسرار اور دیمک زدہ کھنڈروں کے بوسیدہ مناظر پھڑ پھڑاتے رہتے۔ اور ان پر ایک مبہم مبہم سا۔ پر اسرار سا۔ نقش لہرایا کرتا — خوابوں کے جتنے محل بھی وہ سجاتا۔ ہر ایک میں ایک ہی شبیہہ — سائبانوں — ستونوں — آتش دانوں میں لرزاں — صرف وہی ایک۔ اور اس کی آنکھیں انھیں محدود مناظر سے بندھ گئیں — تب وہ کیسے دیکھتا کہ چاک کے ڈبے کہاں رکھے ہیں ؟ ڈسٹر کہاں ہے ؟ ڈسکوں پر کتنی گرد ہے — ؟ وہ تو سوچا کرتا — کہ گنگا میں بہائے ہوئے اس ریشمی رومال کا جانے کیا حشر ہوا ہو گا۔ کیا کبھی وہ در حضور پر پہونچ سکے گا — بہتا بہتا — گنگا کی ساری کثافتوں سے بچتا ہوا —

اور جب یہ خواب کے بلوریں نقوش کسی سخت تر دیوار سے ٹکرا جاتے۔ ریزہ ریزہ ہو جاتے تو فضا میں دیر تک بہت سی کراہیں رقص کرتی رہی تھیں۔

اس لئے کہ افعال میں حسن تو اسی وقت آتا ہے جب قبول یابی کا امکان ہو — اب اگر اس نے ان سب سطحیات کو قبول ہی نہ کیا تب ؟

کس کس سے کتنا پھروں گا — ؟ پھر میرے یہ خواب بھی تو شکستہ اور ڈراؤنے ہیں — نہ جانے افلاک میں بغیر رائے لئے کیوں کوئی بات طے کر دی جاتی ہے — کاش انھوں نے میری بساط دیکھی ہوتی — کیا میں۔ اس بار عظیم کے لائق تھا — ؟ کاش میں صرف ایک چرواہے کا معمولی سا لڑکا ہوتا — نہ ستوگنی — نہ تموگنی — آخر ان روحوں نے مجھے ہی کیوں چنا۔ میں نے کب نرگن بھگتی کا دعویٰ کیا تھا — ؟ میں تو سدا کا سگن تھا — جزا کا خواہش مند — لیکن اب تو میرے آنسو ہی خشک ہو چکے ہیں۔ جو حاصل زندگی تھے۔ کاش میں انھیں تمھارے سامنے بکھیر کر پرسکون ہو جاتا — کاش کوئی ایک ٹھوکر اور مار دیتا — لیکن یہاں تو لگاتار خواب تھے — جو اور بھی بے بس مجبوس اور خشک تر بنا دیتے تھے — لیکن اگر وہ ہی ان آنسوؤں کے بار کو نہ

سنبھال سکا تو — ؟؟

جب کبھی میں اپنے سے فرصت پاکر اس کی خیریت دریافت کرنے اس کے پاس جانے کی کوشش کرتا۔ تو وہ اس کو، گالیاں دینے لگتا — اور میں اس کی کمزوری پر افسوس کرتا ہوا پھر الگ ہٹ جاتا۔ کہ یہ اپنے ہوش میں نہیں ہے۔ گو کہ میں خود بھی اب اسے گالیاں دیا کرتا تھا۔ اور کیا کرتا کہ مجبور و بے بس تھا۔ اپنی پہلی بنیادی غلطی پر نادم بے چارہ میں — پھر یہ بھی سوچتا تھا کہ — ان خیالوں کا آخر ہوگا کیا — ؟ کیسے اداس — پریشان، پریشان ہوں گے — کہاں کہاں بھٹکیں گے — ؟ اچھا ہے جو یہ ساری زندگی مجبور و بے بس گالیاں ہی دیتا رہے۔ کہ وہ خوابوں کی رنجش برداشت نہ کر پائے گا —

لیکن جب کبھی میں اس کے اندر داخل ہو جانے کا موقعہ پا جاتا۔ تو دیکھتا کہ وہ اندر سے بالکل خاموش خاموش۔ اپنے اردگرد سے سہما سہما چپ چاپ لیٹا ہے — تو میں سمجھاتا —!

دیکھو! یہ پاگل پن ہے، خبط ہے۔ اس طرح تو تم نے اپنی انفرادیت زائل کر دی ہے۔ کیا تمہاری شناخت صرف یہی تھی — ؟ کچھ بھوری آنکھیں ابھی تک تمہاری واپسی کی منتظر ہیں — ان روحوں کی مانگی ہوئی دعاؤں کا کیا ہوگا — جن کی سرسراہٹ آج بھی آم کے گنجان باغوں میں موجود ہے — پھر اس طرح تو تم اپنی عبادت کی بھی توہین کر رہے ہو۔

لیکن جب وہ یہ کہنے کے بجائے کہ تم نے ہی تو مجھے اس عذاب میں مبتلا کیا ہے۔ صرف میری طرف دیکھ کر پھر رو پڑتا — تو میں اپنی آنکھیں جھکا لینے پر مجبور ہو جاتا۔ اور سوچتا کہ کاش میں ہی اسے اپنی گود میں بھر کر اس کے سارے دکھوں کو اپنا لوں — لیکن میں کیا کرتا کہ میں خود بھی تو مجبور و بے بس تھا۔

— اور وہ — لرزتی ہوئی، سہمی ہوئی آواز میں سرگوشی کرتا۔

"میں ایک لعل چاہتا ہوں — روشن اور چمکدار جسے میں اپنے آنسوؤں سے پگھلا کر اس کے سارے وجود پر پھیلا دوں۔ اس لئے کہ میرا وجود تو اب مجھے کہیں بھی نہیں ملتا۔ مجھے تو اب چاروں طرف وہی ستارہ نظر آتا ہے جسے میں پہلی بار دیکھ کر ہمکا تھا —

اور ان یاد دلانے والی ہچکیوں کے بعد کا کرب تو لذت انگیز ہوتا ہے جیسے جاڑے کی لرزتی کانپتی اور شرماتی ہوئی دھوپ کا قرب۔

لیکن اب تو تمہارے ہر بن مو سے رباب کے کراہنے کی آواز آتی ہے۔ آخر کیوں — ؟ ذرا ان روحوں پر رحم کھاؤ۔ جو راتوں کو بہچے سفید کفن میں لپٹی ہوئی قبرستان کے باہر آکر سایہ دار درختوں کے

نیچے جمع ہو کر دعائیں مانگتی ہیں، ماتم کرتی ہیں۔ وہی دعائیں جو وہ اپنی زندگی میں نہ مانگ سکی تھیں۔ انھیں ناکام آرزوؤں کا ماتم جو ان کی زندگی میں نہ پوری ہو سکی تھیں۔ پھر وہ ان کی تکمیل اور قبول یابی سے لطف اندوز ہونے کے لئے ہی ہمارے درمیان آجاتی ہیں ـــ اب اگر ہم اس حقیقت پر گیسہ ہو جائیں (کاش) تو انھیں دیکھ بھی سکتے ہیں۔ سن بھی سکتے ہیں اور محسوس بھی کر سکتے ہیں۔ اس لئے کہ وہ ہمارے ہی آباء و اجداد کی مقدس اور غم زدہ روحیں تو ہوتی ہیں۔

لیکن مجھے تمھارے وعدوں کا اعتبار نہیں۔ کیونکہ دنیا کی کوئی طاقت اب میری مدد نہیں کر سکتی ـــ اس لئے کہ دیکھو اس کی تلاش میں ہی میں کتنا سطحیت میں لت پت ہو چکا ہوں ـــ اگر وہ 'تتوگنی' مانگے تب ؟ اگر وہ کہہ دے کہ میں مالا اسی کی گردن میں ڈالوں گی جسے میری چاہ نہ ہوگی۔ تب ـــ ؟

اب تو شاید مجھے پاتال کی گہرائیوں میں ہی سکون مل سکے۔ اس لئے کہ اوپر بہشت ہے نیچے زمین۔ بیچ میں کون و مکاں کی لامحدود پہنائیاں جن میں میرے لئے کوئی جگہ نہیں ہے۔ ہر شاہ راہ مجھ پر بند ہے' ہر سڑک کے دروازے مقفل ہیں، کھڑکیوں کی درازوں میں پگھلا ہوا سیسہ انڈیلا جا چکا ہے ـــ اور ساری طاغوتی طاقتیں کمند پھینکا کر اپنی کمین گاہوں میں پوشیدہ ہو چکی ہیں ـــ خلا میں بھی غیر مرئی چمکتے ہوئے تاروں کا جال بچھا ہے۔

اف وہ روحانی طاقتوں کی بے بسی یا زبردستی اور انتقام ـــ سارا افلاک میرا دشمن ـــ ؟ ان سب کے بھیانک غیر مرئی ہاتھ میری سوکھی ہوئی گردن کی طرف بڑھ چکے ہیں۔ اور نہ جانے کب بے رحمی سے دبوچ بیٹھیں۔

مجھے بچاؤ ـــ مجھے بچاؤ ـــ ! ـــ نہ جانے یہ کیسا خوف انھوں نے میرے دل میں بٹھا دیا ہے۔ وہ نہ ملے گا ـــ نہ ملے گا ـــ نہ نہ ـــ ـــ اور اب یہ خوف مجھ میں سرایت کر چکا ہے۔

تم کہتے ہو کہ ظہور کا ایک دن مقرر ہے ـــ وہ ملے گا ـــ تو میں اسے بہلاوا کہنے پر مجبور ہوں۔ لیکن پھر بھی جب تک قوت کی ایک چنگاری موجود ہے۔ میں امید کی راکھ کو گرم رکھوں گا ـــ اس لئے کہ ایسا کرنے پر مجبور ہوں۔ اسی لئے مجھ میں بہ یک وقت بہت سے کرو گشیتر ہوتے رہتے ہیں۔ اور میں ان سب کا قیدی ـــ ؟

تو میں اسے اٹھا کر مجبوراً پھر کمرہ نمبر ۵۳ یا ۵۵ میں خود ہی محبوس کر دیتا اور وہ بند بند، ٹھہری ٹھہری آنکھوں سے ایک بار صرف ایک بار میری طرف دیکھتا تھا۔ اف ـــ رے ان آنکھوں کی بے چارگی ـــ اور پھر اپنا عمل دہرانے لگتا تھا ـــ ٹھک ٹھک ـــ کھڑ کھڑ ـــ

تب — میں — دور چھوٹے پام کے گملوں میں چھپ کر بیٹھ رہتا — اور خود کو یقین دلانے لگتا کہ — میں یہ فانی جسم نہیں ہوں — میں کبھی نہ مرنے والی غیر منقسم وسیع آتما ہوں — تو گیانی جو ابھی آتما کی مشق کر رہا ہے — غیر مطمئن و گناہ گار —

جب ایک دن اس کی آنکھ کھلی تو اس نے اپنے کو ایک دروازہ پر کھڑا پایا — جاگا جاگا سا — سویا سویا سا — ملگجے اندھیرے میں بھینا بھینا سا احساس بکھرا ہوا تھا۔ اور دور سے کافور، لوبان اگربتی کے دھوئیں کی خوش بو دوڑی آ رہی تھی تب اسے ایسا لگا جیسے وہ کسی مامن میں آ پھنسا ہو — ایسا مامن جس کی تمنا کرتے بھی خوف آ جائے — لیکن جب وہ اس مامن میں داخل ہو گیا تو نیند سے جاگنے لگا۔ پھر چلمن کی درازوں سے آتی ہوئی ہواؤں نے اسے اپنے تجزیہ پر تیار ہی کر لیا۔

۸

وہ نم نم سی بھیگی بھیگی راتیں اپنی ایک صدی پر پھیلی ہوئی نیند کا تجزیہ کرنے لگا۔

"ایک ایک بوند دھار اپڑنا ہی تو پوجا ہے — دکھ کو — دکھ کر کے ہی برداشت کرو۔ جب اندر باہر رنگ جاؤ گے تو رنگ ساری زندگی پر پھیل جائے گا۔ اور تب تم آنند مئی ہو جاؤ گے۔"

"شیو پر پوری تیس بالٹی ڈال کر پوجا کا حق کب ادا کر سکتے ہو مورکھ؟"

"کبھی تم نے کوئی اچھا خواب بھی دیکھا ہے؟"

حسن کوزہ گر نے جہاں زاد سے کہا —

"جہاں زاد تیری آنکھوں میں وہ تابناکی ہے کہ میں جس کی حسرت میں پورے ۹ سال پھرتا رہا ہوں۔ جہاں زاد!"

'یہ وہ طویل ترین جگ تھا جس میں میں نے کبھی اپنے مخزن کوزوں کی جانب پلٹ کر نہ دیکھا۔ اور جب ان سے ملتا تو وہ سوال کرتے حسن کوزہ گر تم کہاں چلے گئے تھے — تب بھی میں بسا آرزوئی کے خلا میں تمنا کا بے پایاں الاؤ جلائے خاموش بیٹھا رہتا!

سارے ساٹے اپنا وجود ختم کر چکے تھے جن کی لاحاصل تمنا میں نو سال تک انھیں سایوں کے تلے سوتا رہا تھا۔ لیکن پھر بھی ان لازمی سوالوں کی لرزش نہ محسوس کر سکا تھا — جب اندھیروں میں کالے غم کی آنکھیں اور میلے دانت چمک اٹھتے، سارے غم کے بادل گرجنے لگتے۔ برسنے لگتے۔ تب بھی میں ان اجڑے ہوئے سینوں کی خلائی آواز نہ سن پاتا۔

ارجن نے تو کہہ دیا تھا کہ "پربھو میں آپ کا مکمل ترین روپ دیکھنا چاہتا ہوں جس میں آپ کا

سارا عظیم ترین جلال ظاہر ہوا ہو" لیکن میں....؟؟

میں تو ابھی امرت کے ایک قطرہ کی مٹھاس کے ہی سارے ذائقہ کو نہیں چکھ سکا ہوں تو کیسے سارے امرت کی خواہش کروں؟

ہاں — اگر دے دے تو میں اسے بہت سنبھال کر رکھوں گا۔ وعدہ کرتا ہوں۔ اس لئے کہ میں خواہش مند اور لاپرواہ دونوں ہوں۔ نرگن اور سگن بھگت — کم زور اور لاچار۔ بےبس اور مجبور۔

پھر بھی میں نے اپنے سارے افعال اس کی نذر کر دیئے ہیں۔ اس لئے پر سکونی کا غلاف مجھ پر خود بہ خود تن جانا چاہیئے — یہ تو میرا وہ حق ہے جس کا افلاک میں وعدہ کیا گیا تھا۔ لیکن وہ آم کے درختوں کی سرسراتی اور غم زدہ روحیں؟

ہل اتی وہ لمحہ — کہ — آگ روشن ہو۔ سورج بھی ابھر چکا ہو۔ ساتھ ہی شکل پکش کا چاند بھی لمحہ بہ لمحہ بڑھ رہا ہو — اترائن میں بے ابر خوب صورت آکاش ہو — پھیلا ہوا وسیع اور نیل گوں —

لیکن وہ تو خود ہی ڈرامہ لکھتا ہے اور خود ہی اداکار بن کر سامنے آتا ہے اب اس کے کس رخ کو عقل و دل کا نذرانہ پیش کیا جائے۔ اسی لئے تو اندریوں کو آتما کی مشق کرنی پڑی — تاکہ آتما — نتھر جائے۔

اس لئے کہ آتما کا کوئی رنگ نہیں ہوتا۔ اور سارے رنگ اسی سے منسوب ہوتے ہیں —

مجھے یاد ہیں تمھاری پلکیں — گہری چمکیلی اور سیاہ آنکھوں پر ٹھہری ہوئی۔ جنھیں صرف دیکھنے کے لئے ہی میں ہمیشہ بے قرار رہا — لیکن تم تو اس حصار میں تھیں جس کے اندر میں اپنی کالی آتما کے ساتھ آ ہی نہ سکتا تھا — یا مجھ میں چھپا ہوا دوسرا فرد مجھے اس کی اجازت ہی نہ دے رہا تھا —

مگر تجھ سے خوب صورت کوئی نہیں — تیری آنکھیں غزال کو شرمائیں۔ تیرے بال ریشم کی نرمی والے۔ تیری بانہیں شجر ممنوعہ ایسی پاک و شفاف، تیری آواز موسیقیوں کا سمندر — اور پھر ان سب پر تیری پلکیں — ساری آوارہ روحوں کا پر سکون مسکن، پر خلوص اور باوقار مامن۔ جہاں اکثر شام اپنا راستہ تلاش کرتی دکھائی دیتی ہے —

اور میں صرف ایک بار ان کے سامنے رو لینا چاہتا ہوں۔

میں صرف ایک بار تمھارے سامنے تمھارا نام لینا چاہتا ہوں۔

" اس لئے کہ اسے معبود کہہ کر میں نے اس پر نہیں خود پر احسان کیا ہے اس لئے کہ اسی پاکیزگی کے تصور نے ہی ہمیشہ مجھے پاک رکھا ہے۔ آلودگی تو صرف اسی پاکیزگی کی تھی —"

"اسی سے خیالات میں ترنم، جذبات میں پاکیزگی اور نظریات میں فلسفہ کی ہوا آتی ہے"
ورنہ میں موہنی کی محبوبہ صفورہ کی پشت سے نکل کر اس کے آگے چلنے والا کب تھا؟
مسلسل ۱۲ سال تک بھیڑیں چرائے۔ ابلق و سرخ و اصفر بھیڑیں پیدا کرنے کی جسارت مجھ میں کہاں تھی ــــ یہ تو اس بڑے جیوتشی کا کرم تھا ــــ جو کنویں کی جگت پر بیٹھا کسی ایسے ہی آنے والے کا انتظار کیا کرتا تھا۔

"لیکن ہمیں تو آج بھی وہ آگ کا درخت یاد ہے ــــ جس کی مجروح شاخ لے کر ہمیں نکلے تھے اور جس کی ہی طرف کئی بار لوٹ چکے ہیں۔ محروم و ناکام ــــ"

اور جب جب بھی راہ میں غم کے دندانے تیز ہونے لگتے ــــ تو ہم سارے مناظر سے نظر پوشی کر کے ــــ اپنے رنگ ــــ اپنے بدن ــــ اپنے قدم اور اپنے ہی قامت کے ساتھ اپنی ہی جانکاہ تنہائیوں کی غم انگیزی کے سوا کچھ نہ دیکھ پاتے۔ بیم و رجا۔ شک و گمان کے سمندر میں ڈوبتے ابھرتے ــــ پھولی ہوئی بے ہنگم سانسوں ــــ پانی کی نیلاہٹ سے مسموم آنکھوں ــــ اور تھکے ہوئے دست و بازو سے سوال کرتے ــــ

"در حضور پہ حاضر ہو کر مانگنے والا اگر اتنا من چلا ہوا کہ حضور کو ہی مانگ بیٹھا ـ تب ـ؟
اگر اس مانگنے والے کو مراد نہ ملی ــــ تو ان کے دامن پر ناقبولی کا دھبہ لگا ــــ اور اگر قبول کر لیا تو آپ ــــ اپنے کو کھو بیٹھیں ــــ!

پھر اس بامراد کے لئے بھی خطرہ کہ ــــ اسے حاصل کر کے کہیں وہ اپنے آپ کو نہ کھو بیٹھے ــــ اس طرح تو دونوں کا خسارہ ہے ــــ اور ناقبولیت ــــ صرف ایک دھبہ" ــــ ربا ــــ!
میرے پیا دی منزل کدی نہ ہو ــــ"

اچھا ہے کہ منزل مقصود کبھی ملا ہی نہ کرے ــــ کہ یہ تلاش تو باقی رہے۔ نہ ملنے کا دکھ تو زندہ رہے۔ یہ آبلے اپنے تو رہیں گے ــــ ملنے پر تو بس مل جانا ہوگا ــــ لیکن نہ ملنے پر نہ مل سکنے کا غم کتنا لذیذ تر ہوتا ہوگا ــــ اے کاش کسی منزل مقصود کا وجود ہی نہ ہوا کرتا۔ ـ لیکن پھر تلاش کس کی ہوتی ــــ؟؟

"سمندر تو پکار پکار کر یہی کہتا ہے کہ سدا مجھے یاد کرتے رہو ــــ اور سدا یدھ ــــ کرتے رہو۔ تو تمھیں سدا یہ محسوس ہوتا رہے گا ــــ کہ سمندر سے ہی تمھیں ابھر رہا ہے"

تو میں نے عمر صرف یدھ کرنا ہی اپنی نجات جانا۔ اور خون میں تر بہ تر گانڈیو لئے ــــ اپنے

جسم سے چیکے کرتے کی کڑکڑاہٹ محسوس کرتا رہا۔ کہ مجھے ہوش ہی نہ رہا کہ کب میں تھک کر گر پڑا تھا۔

جب ہوش آیا تب بھی میں ترپ تمر۔۔۔ اس سہمی ہوئی فاختہ کی طرح۔ اس کنوئیں میں آکر پناہ گزیں ہو گیا۔ جس کو خبر ہی نہ تھی کہ اس اندھیرے میں زہریلے سانپ بھی تو پوشیدہ ہو سکتے ہیں۔۔۔ بے چاری ہانپتی ہوئی فاختہ۔۔۔ ایک دن میں نے یوں ہی اسے سمجھایا۔ سنو! جب تم اس کا نام لے کر شعلہ ساں ہو جاتے ہو۔ نیم کی لکڑی کی طرح خشک کڑوا دھواں بکھیرنے لگتے ہو۔ تو کوشش کرو کہ کم از کم اس کا نام تمھاری زبان پر نہ آئے۔

تب اس نے آہستہ سے اپنے وزنی سر کو اٹھایا۔ دیر تک میری آنکھوں میں دیکھتا رہا۔ پھر آنکھیں بند کر کے کہنے لگا۔ ہاں! میرا سارا جسم چٹخنے لگتا ہے اور چاروں طرف بکھری ہوئی کڑواہٹ مجھے بھی محسوس ہوتی ہے لیکن۔۔۔

وہ تو ایک انگارہ تھا۔۔۔ جو سارے احساسات کو بھسم کر کے شعلہ بنا اور احساس کے پیکر پہ چھا گیا۔ اب تو میں ان پر تڑپ تڑپ کر ہی تسکین پاتا ہوں۔

لیکن اب مجھے ان دودھ میں بھگوئے ہوئے پھاہوں نے کہیں کا نہ رکھا۔ بلکہ انھوں نے تو اپنی مٹھاس کا ہلکا سا ذائقہ دے کر مجھ سے میری تپسیا کی انفرادیت ہی چھین لینی چاہی۔ (میں تو نیم کی کڑواہٹ کا متلاشی تھا) جس کے نتیجہ میں میرا جسم وزنی ہوتا گیا۔۔۔ اب اگر گھسٹنا بھی چاہوں تو ہل نہ سکوں۔۔۔ (بیٹھ کر احساس گناہ پر توبہ استغفار کروں) ریت کے بڑھتے ہوئے خار دار پنجوں نے کچھ ایسا جکڑا۔۔۔ یا مسحور کر دیا کہ میں دل کی دیوار پر لگے ہوئے شیشوں کی جڑوں میں۔۔۔ ماحول کی نمی اور زنگ بستگی سے کائی لگتے دیکھتا رہا۔ بے خبر۔۔۔ اس لئے کہ اب میں قید سے آزاد تھا۔ اور یہ عاشقِ

تب ہی میں نے سوچا۔ یہ رگ و پے میں نئی شر انگیزی کیسی ہے۔ کیا میں ان ساری غم زدہ روحوں کی گرفت سے نکلا جا رہا ہوں۔۔۔ لیکن یہ کیسی گرفت ہے جو کہ اپنی مٹھاس اور چپچپاہٹ سے بہلاتی ہے۔

یا ہم ہی لوگ بہت بھونڈے اور بے تیچر ہو گئے ہیں۔۔۔ جو بلا وجہ افکار و اوہام شک و گمان کے بگولوں سے اپنے ذہن و جسم کو ڈھکے رہتے ہیں۔ کبھی روتے ہیں۔۔۔ کہ اگر نہ روئیں تو کیا کریں۔۔۔؟ اور کبھی ہنستے ہیں۔۔۔ کہ اگر نہ ہنسیں تو کیا کریں۔۔۔؟ ہم سب شاید اب گردشوں کے ہی زندانی ہیں جنھیں بہت سی غیر مرئی زنجیروں نے جکڑ رکھا ہے۔ دیکھیں کب ان کا بھرم ٹوٹتا ہے؟ میں ازلی محبوس۔ اس مشکوک لمحہ کا بھی انتظار کروں گا۔

اس لئے کہ۔۔۔ ابھی تو میں مطمئن و خوش ہوں کہ کم از کم شیشے تو محفوظ ہیں۔ کائیوں کا کیا؟

وہ تو ایک معین وقت پر خود ہی اپنا آپ کھو دیں گی ــــ

میں اب بھی خوش و مطمئن ہوں کہ میں نے کسی کو کبھی کوئی یقین نہیں دلایا ہے ــــ اور وہ سب عمداً دھوکہ کھاتی رہیں۔ یہ جانتے ہوئے کہ میں انھیں کچھ نہ دے سکوں گا۔ وہ اپنے آپ کو عریاں کرتی رہیں ــــ اب میں کیوں اپنے کو عریاں کرتا ــــ

انھیں تو عریاں دیکھ چکا ہوں ــــ جن کی کنواری چھاتیاں مجھے دیکھ کر بھیگ جاتی تھیں ــــ اور میں گھن کھا کر ہٹ جاتا تھا ــــ جب تک میں ان جوان عورتوں کے سامنے رہتا ــــ ان کے سینوں کے بٹن تڑ اتڑ ٹوٹتے رہتے ــــ اور میں ان پر ہر وقت لرزتے ہوئے ماہتاب کا عکس دیکھتا رہتا۔

وہ سب مکمل ایثار و قربانی بن کر میرے سامنے آتی تھیں ــــ انھیں میری تلخ ترین باتوں سے بھی تکلیف نہ ہوتی تھی۔ اس لئے کہ ان کے اندر کا پوشیدہ شخص انھیں ایثار و قربانی پر ابھار رہا تھا ــــ اور میں لگاتار کھلی کھلی آنکھوں سے اپنا خسارہ دیکھتا رہتا تھا ــــ پھر مسکرا کر انھیں آنکھ مارتا تھا ــــ جو کہ میرے ہی گندے انڈر ویرس کو دھونے میں مشغول تھیں ــــ کہ انھیں اسی میں نجات نظر آتی تھی ــــ لیکن تب میں روحوں کی معصوم گرفت سے بھی نکلا جا رہا تھا ــــ اس لئے کہ اب درس کے سارے سلسلے منقطع ہوتے جا رہے تھے ــــ اور آنسو نہ جانے کیسے میری صورت کو مضحکہ خیز بنا دیتے تھے ــــ میں دیکھتا رہتا ــــ کہ "امن کی سرد دھوپ اب میرے جذبہ کی گرمی پر لگاتار سلیں برسا رہی ہے۔ جس سے میرا سارا جذبہ سکڑتا ــــ اور محدود ہوتا جا رہا ہے ــــ ایک ملک میں۔ ایک شہر میں۔ ایک محلہ میں۔ ایک گھر میں۔ ایک کمرہ میں۔ ایک مسہری میں۔ ایک انڈر ویر میں۔ پھر صرف ایک جسم میں ....۔ اور وہ کپڑے پھاڑتا ہوا آہستہ سے سرک جاتا ــــ"

"تب میں اپنی بھیگی ہوئی انگلیوں کو پھر پھیلانے لگتا ــــ تاکہ اپنے گم شدہ تموگن کو چھو سکوں ــــ لیکن نہ چھو پاتا ــــ تو پھر انھیں جسموں کو لگاتار چھوتے رہنے کی خواہش ابھر آتی ــــ اور خواہش سے پہلے ہی حادثات کا خوف جنم لیتا ــــ اور میں بے ہوش ہو جاتا ــــ

بعد میں اسی نے بتایا کہ میں بے ہوشی میں پھر وہیں پلٹ جاتا تھا ــــ شاید میرا تموگن واپس آ جاتا تھا ــــ میری غیر موجودگی میں۔ تب ہی تو ان ــــ ان دیکھے مناظر سے آنکھیں بند ہو جاتی تھیں واے کاش پہلے کی طرح محسوس ہی رہتا یا اب کی طرح بے ہوش) اور میں بڑبڑانے لگتا ــــ

"جہاں زاد ــــ جہاں زاد ــــ"

اب وہ نام جب بھی زبان پر آتا ــــ شعلوں سے چنگاریاں ابھرنے لگتیں ــــ اور میں ایک

کم فہم عامل کی طرح خود ہی ان شعلوں سے جھلس جاتا — اور پھر اپنی پاک و پاکیزہ روح کو ایک رات کیلئے ہی سہی — اپنے پاس سلا لیتا —

آؤ — دیکھو! میری اس عبادت کو — جس کی رات کا ایک قطرہ ستر سال کی عبادتوں پر بھاری ہے۔ یہ راتیں — یہ خوش گوار مناظر۔ یہ تنہائیاں — یہ غم اور یہ زندگی کی نام نہاد خوشیاں۔ دیکھو تو سہی۔ تمہارے بغیر کس طرح برداشت کر رہا ہوں — شاید تمہاری چمکیلی آنکھوں میں بھی ایک قطرہ پانی آجائے —

وہ بانہیں جنھوں نے بچپن میں نیم کی شاخ کا سہارا لیا تھا اب مجھے گرنے سے بچا کیوں نہیں لیتی —؟ آنکھیں — میری پلکوں کی نمی کو اپنا کیوں نہیں لیتی —؟

اپنی یادیں تم تک کیسے پہونچاؤں —؟ اب تو ساحل کا تصور بھی مضحکہ خیز لگ رہا ہے۔ کاش کوئی ان غم انگیزیوں کا احساس کر لیتا اور میں اطمینان سے سو جاتا۔ لیکن یہاں تو دور دور تک کوئی لہر نہیں ہے — کیا جانے کب سورج نکلے۔

لیکن جب سورج نکلتا تو میں پھر گوشت کی خوش بو پر لپک پڑتا۔ اور آسودہ ہو کر پھر بڑبڑانے لگتا — جہاں زاد — جہاں زاد — اے کاش — اے کاش — لیکن کیا۔ اے کاش —؟؟

"جب اس امن کی برف پر پڑے پڑے میری آتماسن گئی تو میں نے جانا کہ میں ابھی تک نیند سے جاگا ہی نہیں تھا — اور ابھی تک محبوس تھا —"

تب میں نے نیم بیداری کے عالم میں یہاں سے سفر کا ارادہ کر لیا۔

کہ شاید نجات پا جاؤں — اسی وقت ایک شخص نے نکل کر کہا — اب تم شجر ممنوعہ کو دیکھ چکے ہو — اسے چکھ چکے ہو۔ تمہاری انگلیاں لتھڑ چکی ہیں — اور ساری آتماسن ہو چکی ہے۔ اس لئے اب تم بھاگ کر بھی نہ بھاگ سکو گے — جب تک کہ تمہارا جسم سوئیوں سے چھلنی نہ ہو جائے — یا کوئی غم زدہ تمہارے ناپاک جسم پر اپنا پاک ہونٹ نہ رکھ دے —

لیکن میں نہ مانا — اس لئے کہ ان ہونٹوں نے ہی مجھے کہیں کا نہ رکھا تھا — ان کے پھیکے تھوک کا ذائقہ — اب دیکھیں کب مجھے آزاد کرتا ہے —

اسے تو میں نے ہمیشہ دور سے دیکھا۔ میں کیا جانوں کہ اس کا ذائقہ کیا ہوگا پھیکا یا میٹھا —؟ لیکن اب تو اس دوسرے نے مجھے زبردستی ہی اپنے پھیکے تھوک میں لتھیڑ دیا ہے —

اس لئے میرا یہ سفر ناگزیر ہے —!

۹

وہ سمجھتا ہے کہ اس نے سفر کو ناگزیر جان کر سفر کیا تھا — احمق بے چارہ — لیکن مجھے بھی کہنے کی کیا ضرورت ہے کہ وہ آیا نہیں ہے۔

بلکہ میں اسے لایا ہوں — میں جو کافی عرصہ سے اس کے ساتھ لتھڑ رہا ہوں — اور چپ چاپ ہر ممکن مناسب سے اپنی بساط کے مطابق اسے محفوظ رکھنے کی کوشش کرتا رہا ہوں — اب یہ دوسری بات ہے کہ وہ اپنے فطری رجوگن کی بنا پر کبھی کبھی مجھ پر ہی حاوی ہو گیا ہے — یا اکثر میں ہی مصلحت کوش بن گیا ہوں — کیا کرتا کہ مجبور تھا۔ میرے ظہور کا وقت معین ہو چکا تھا۔ اس لئے میں بے بس تھا۔ اور اسے اپنے اوپر حاوی ہوتے دیکھتے رہنا ہی ابھی میرا مقدر تھا۔

لیکن جب میں نے دیکھا کہ اب وہ غلاظت پھیکے بے رس تھوکوں اور ویسا دری پان کی پیکوں — حیض کے گاڑھے سیال میں اتنا پھنس چکا ہے کہ افلاک کے معینہ اور مطلوبہ مقاصد سے روگردانی پر آمادہ ہے — تو مجھے مجبوراً اسے وہاں سے کھینچ کر باہر لانا پڑا — اس لئے کہ یہ میرے قبضۂ قدرت میں تھا — جس ایثار کو اس کا خیال ہے کہ اس نے انجام دیا ہے۔ بے چارہ تو گنی۔

لیکن مجھے کیا پتہ تھا کہ — حسب معمول میں پھر غلطی کر رہا ہوں۔

شاید وہی مجھ سے زیادہ عقل مند ہے — کہ وہ جو کچھ کرتا ہے اس میں اسے آسودگی تو ملتی ہے لیکن جب جب میں نے اپنی مرضی سے کوئی قدم اٹھایا ہے۔ تو نہ ہی اس کے لئے سودمند رہا ہے اور نہ ہی میرے لئے سکون بخش —

اسے جسمانی و روحانی جبس ملا — اور مجھے اس سے علیحدگی کا غم برداشت کرنا پڑا — یا اسے غلاظت ملی — اور مجھے اس سے اکتاہٹ یا نفرت کے جذبہ کو دبانا پڑا کیسا المیہ تھا یہ؟

ہاں بس اتنا ہوتا کہ وقتاً فوقتاً اس پر میرا لمحاتی قبضہ ہو جاتا — اور میں اسی لمحہ کو اپنے معینہ سفر کا ایک قدم بنا لیتا — (اب یہ راز میں بتا ہی دوں) کہ مجھے حکم ہو چکا تھا کہ اس کے اندر پوشیدہ رہ کر میں اسے اسمعت پرگیہ کے شہر تک لے جاؤں اور وہاں پہونچا کر — کسی اور کے حوالہ کر کے آسودہ ہو جاؤں — اس لئے کہ وہی شہر میرا اسدرہ ہوگا — جس سے آگے بڑھ جانے پر نہ صرف پروں کے جل جانے کا بلکہ اپنے وجود کے بھی بھسم ہو جانے کا اندیشہ ہے — یہ مجھے بتایا گیا تھا —

اور لوح محفوظ میں (شاید ۔؟) یہ لکھا جا چکا ہے کہ اس شہر میں ضرور مجھے وہ مل سکتا ہے۔ جس کے حوالہ کر کے میں اپنا فرض پورا کر سکوں گا۔ اس لئے کہ (شاید) افلاک میں یہی طے ہوا تھا۔

بس شرط یہ ہے کہ وہ (یا میں) اسی معین راہ پہ چلتے رہیں ــ جس راہ پر اہل افلاک اپنی غیر مرئی انگلیوں کے غیر مرئی دھاگوں کے اشاروں پر چلانا چاہتے ہیں ــ گناہ گار یا پاک پانے ــ پھر وہ جانے اور اس کا کام ــ مجھے تو دور سے کبھی کبھی دیکھ آنے کی اجازت ہے۔ بس ــ تب تو اس کا مالک کوئی دوسرا ہوگا ــ جس کا خود اسے بھی انتظار ہے۔ کہ یہ اپنے آپ کو اس کے حوالہ کر دے ــ شاید قبرستان کی قدیم، غم زدہ اور پاک باز روحوں نے اسے بھی یہ راز بتا دیا ہے۔ حالاں کہ یہ اہل افلاک کا خفیہ معاملہ تھا ــ لیکن روحوں سے کون جیت سکتا ہے ــ؟

لیکن اگر وہ ــ وہاں ــ نہ ملا ــ تو ــ؟

لیکن اگر یہ ــ اس راستہ پہ ــ نہ چل سکا ــ تو ــ؟

تو نہ جانے کیا ہوگا ــ؟ شاید اس کے ساتھ ہی مجھے بھی ایسی بھیانک سزا دی جائے۔ کہ جس کا سلسلہ ناپید اکنار ہو ــ اس لئے کہ یہ اہل افلاک کی خواہش کے منافی ہوگا ــ اور اہل افلاک سے کون جیت سکتا ہے ــ؟

اسی لئے میں کسی بھی محفوظ لمحہ کو اپنے معینہ سفر کا ایک قدم بنا لیتا ہوں۔ خواہ وہ لمحہ کسی خانقاہ میں دستیاب ہو ــ یا شہر میں ــ

لوگ سمجھتے ہیں ــ کہ یہ اپنے پر طاری کردہ غلاف ہے ــ تاکہ لوگ اسے منفرد جانیں ــ بلند اور پر اسرار کہیں ــ

وہ سمجھتا ہے ــ کہ وہ یہ سب کھلا ہوا جھوٹ بول رہا ہے ــ جس پر کسی کو یقین نہ آئے گا ــ کہ ....؟ اسے اب بھی لوگ اندر سے کھوکھلا سمجھتے ہیں اور سمجھتے رہیں گے ــ یا پر اسرار اور گہرا کہیں گے ــ لیکن وہ اسے صرف بھونڈا پن ــ اور کبھی کبھی خود پر طاری کردہ مذاق ہی کہتا کہ ...؟

لیکن میں جانتا تھا کہ میں جو کچھ کر رہا ہوں ٹھیک کر رہا ہوں ــ جب وہ دوسری بار اپنا تجزیہ کرے گا تو ضرور فخر کرے گا ــ اور جب میرا ظہور ہوگا۔ تو احترام سے اپنے کو میرے حوالہ کر دے گا ــ نہ صرف احترام سے بلکہ تشکرانہ انداز میں ــ

اور میں اپنا معینہ فرض ادا کر کے اسے پھر آزاد چھوڑ دیتا ــ کہ جاؤ ــ اور جا کر لاٹری کے ٹکٹ فروخت کرو ــ اور لوٹ کر اپنا معینہ فرض ادا کرو ــ کہ تمہیں بھی اس شہر کے مقررہ سفر میں

معاون بنتا ہے ۔۔۔ اس لئے کہ روحوں نے مجھیں بھی اس راز سے آگاہ کر دیا ہے ۔۔۔

پھر میں الگ ہو کر ایک گوشہ میں بیٹھ رہتا اور اس کا تجزیہ کرنے لگتا۔

نہ روکو! اسے ۔ نہ ٹوکو ۔! اسے ۔۔ کہ یہ محزون روح تمہا لبنی کی شکار ہے ۔ اسے گوشت کی خوش بو بھلی لگے گی ہی ۔۔۔ اس لئے کہ اسے گوشت نہیں ملا ہے ۔۔۔ اسے بھیگی ہوئی چھاتیوں سے گھن آئے گی ہی ۔۔۔ اس لئے کہ یہ اس کی نفسیاتی کمزوری ہے ۔۔۔ اس کی انگلیاں لتھڑنے دو ۔۔۔ کہ یہ اس کی فطری طلب ہے ۔۔۔ اسے مغرور نہ کہو! کہ اس کے پاس غرور کی کوئی چیز ہے ہی نہیں ۔۔۔ اسے جھوٹا نہ کہو ۔۔۔ کہ وہ کس لئے جھوٹ بولے نہ ہی اسے کسی چیز کی لالچ ہے ۔۔۔ نہ ہی کسی کا خوف ۔ اسے اپنے سے الگ نہ جانو ۔ اس لئے کہ اسے تمہارے خلوص کی ضرورت ہے ۔۔۔ وہ بڑا معصوم گناہ گار ہے ۔۔۔ وہ بے چارہ تو اپنے لکھے کو پورا کر رہا ہے ۔۔۔ اور میرا پنجہ اس پر قابض ہوتا رہتا ہے ۔۔۔ جب میں ہی اسے ڈھیل دے دیتا ہوں تب ہی وہ چوندھیا جاتا ہے ۔۔۔ اب اگر تمھیں بے اعضائی کی سزا دینا ہے تو مجھے دو۔

پھر میں اسے دور چیڑ کی لکڑیوں میں قید دیکھتا تو دعا مانگتا " اے رب ۔ اے اہل افلاک اب اسے آزادی نہ دینا ۔ کہ یہ اپنا آپ کھو بیٹھے گا ۔ اسے محبوس ہی رکھنا تاکہ میں سکون سے اپنا عمل جاری رکھ سکوں ۔ اے رب ۔ میں تو اسے نہیں روک سکتا لیکن تو بڑا عظیم ہے ۔ اسے اس معینہ راستہ پر لے چل ۔۔۔ تو صرف میرے حوالہ کر کے اتنا لاپروا ۔ کیوں ہو گیا ہے ۔۔۔ ؟ ۔۔۔"

میں تو ادھر کسی گوشہ میں دعاؤں میں مصروف رہتا ۔ اور وہ میری نظریں بچا کر اپنا فرض پورا کرتے کرتے پھر چپکے سے دروازہ کھول کر پکے ہوئے گوشت کی ہری ہری خوش بو کی طرف بڑھ جاتا ۔ اندھیرے میں جب دروازہ چرچراتا تب میں گھبرا کر مراقبہ سے آنکھیں کھول دیتا ۔۔۔ تو اس کا ننگا ہیولی مجھے دروازہ سے باہر لہراتا دکھائی دیتا ۔۔۔ اور میں بے بسی سے ہاتھ ملنے لگتا ۔ کچھ دیر بعد جب وہ لوٹ کر آتا اور مجھے اپنی سلامتی کے لئے دعا خواں پاتا تو وہ کھسیانی سی مسکراہٹ کی پرچھائیں اس کی اس وقت کی بھنگی آنکھوں میں اور گہری ہو جاتی ۔ اب یا تو وہ نظریں چرانے لگتا ۔۔۔ یا مجھے سنانے کے لئے پاک بازی کے نئے وعدے کرنے لگتا ۔

اور میں تاسف سے اپنے گذشتہ افعال پر نظر ثانی کرتا ۔ کہ شاید مجھ سے ہی کہیں کوئی غلطی ہو گئی ہو ۔۔۔ ؟ کون جانے کس کی ۔۔ کیا مصلحت رہی ہو ۔

اور سوچتا ۔۔۔

یالائمی کف الملام عن الذی اضناہ طول سقامہ وشقائہ

جب میں نے اسے سخت و سست کہنے کے بجائے اس کے فرائض یاد دلائے۔ تو اس نے فوراً ہی گردن جھکا دی۔ اور پھر وہی روحانی و جسمانی اذیتیں سہنے لگا اور میں پھر مطمئن ہو کر پھر اس شہر کے اس مخصوص فرد کا تصور کرنے لگا جس کے حوالہ کر دینا ہی میرا فرض تھا۔

پر نہ جانے کیسا ہوگا وہ۔؟ کیا اسے سنبھال سکے گا۔؟ اس کی قدر کرے گا۔ یا میری اتنے دنوں کی محنت رائیگاں جائے گی۔؟؟ اور نہ مجھے اس سے کیا مطلب؟ وہ جانے اور اہل اطلاک جانیں میرا تو سدرۃ المنتہیٰ وہی ہے۔

لیکن جب بسی بھائی نے مجھ سے کہا۔

"سوچو۔ اگر تم جیسا سوچتے ہو ویسا نہ رہا تو۔؟ تب تمھیں کتنا دکھ ہوگا۔ یہ سارے سفر کے دکھ تو تم سہہ لوگے۔ لیکن کیا اس اذیت کو بھی برداشت کر سکو گے۔ بکھر نہ جاؤ گے؟؟ پاش پاش نہ ہو جاؤ گے؟ کہ وہ شخص ویسا نہ نکلا جس کے لئے نہ صرف تم نے کرب سہے بلکہ اسے بھی متواتر ۹ سال تک محبوس کئے رہے۔ جس سے وہ اذیتوں کا شکار رہا۔ ترک لذات کر کے جبراً تزکیۂ نفس کرتا رہا۔

تو مجھے بھی سوچنا پڑا۔ اور میں نے ساری بوسیدہ اور کرم خوردہ قدیم کتب کی ورق گردانی کر ڈالی۔ تاکہ معلوم ہو سکے کہ وہ معینہ شہر کا معینہ شخص کیسا ہے۔؟

ان کتابوں نے چیخ چیخ کر سارا آسمان سر پر اٹھا لیا۔" وہ تمھارا منتظر ہے۔ سفر کو جاری رکھو۔ فرض کو ادا کرتے ہو۔ طاعت میں مستعد رہو۔"

تب مجھے سیاحوں کو خوشامد کر کے۔ زاد راہ ساتھ کر کے۔ روانہ کرنا پڑا۔ (اس لئے کہ اس کے دربار میں اپنے کو پہونچا دینا بہت ضروری ہے۔ خواہ یہ سفر تحقیق اور تجسس کے لئے ہی کیوں نہ ہو)۔ کہ جاؤ اور اس کے بارے میں پتہ لگا کر آؤ۔

لیکن جب وہ سب لوٹے تو۔ ان میں سے کچھ گونگے ہو چکے تھے۔ بہت سارے وعدوں کے باوجود۔ ان کے پاس اس کی کوئی نشانی بھی نہیں تھی۔ اور بہت کچھ یقین دہانیوں کے باوجود راستہ سے ہی واپس چلے آئے تھے۔ اور یا تو مجھے بہلانے لگے۔ (ان میں سے کچھ) کہ" وہ شخص تمھارا بے چینی سے منتظر ہے۔ اس نے شہر میں آئینہ بندی کرا لی ہے۔ گلی کوچوں میں عرق گلاب و بید مشک چھڑکا جا چکا ہے۔ بیلے اور ہار سنگھار کے پھول بکھرائے جا چکے ہیں۔ خوش نما مرمریں حوضوں میں کنول کے پھول کھلائے جا رہے ہیں۔ ان پھولوں کی پتیاں چاندی ایسے پانی میں تیر رہی تھیں۔ ہاں میں نے خود دیکھا تھا۔

وہ تمہارا منتظر ہے۔ اب تم بھی کمربستہ ہولو"۔ یا ــ (ان میں سے کچھ) دھوکہ دینے لگے ــ وہ شخص کہیں اور جانے کی تیاری کر رہا تھا۔ بہت بناؤ سنگار کئے آئینہ دیکھ رہا تھا۔ اس کے ہونٹوں پہ کسی اور کے لئے کچھ گیت لکھے جارہے تھے ــ اسے تمہارے بارے میں کوئی علم نہیں۔ وہ تمہارا نام بھی نہیں جانتا۔ میں نے تمہارا نام لیا ــ تو اس نے نفرت سے منہ سکوڑ لیا۔ وہاں تو تمہارا کوئی تذکرہ ہی نہیں تھا ــ پھر اخلاک کے لکھے کا کیا سوال۔ ؟"

تو میں اپنے میں الجھ الجھ کر پکارتا" جہاں زاد۔ اے جہاں ۔! میرا انتظار کرنا۔ میں اسے لے کر ضرور آؤں گا ــ ضرور آؤں گا ــ تم اسے قبول کرنا ــ کہ میں نے بڑے جتن سے اسے سنوارا ہے۔ جہاں زاد ــ اب یہ بوجھ مجھ سے نہیں برداشت ہوتا۔ مجھے چھٹکارا دنیا ــ مجھے میرے ظہور سے پہلے ہی نہ مار ڈالنا ــ جہاں زاد ــ مجھے ابھی اور بھی بہت کچھ کرنا ہے۔ ابھی ان غم زدہ روحوں کا قرض ادا کرنا ہے۔ جہاں زاد ــ اے ....."

پھر گھبرا کر میں بھی بھائی سے ماہے اور کسم کی داستان سنانے کی فرمائش کرنے لگتا ــ اور وہ یوں گویا ہوتے ــ کہ ــ

(جھوٹ راوی کی گردن پہ) "ایک تھی ــ ماہے ــ اور ایک تھی کسم ــ اور ایک تھی کشتی ــ وہ دونوں ہی اس کشتی پہ بیٹھ کر دریا کے پار اترنا چاہتی تھیں ــ (بے چاریاں) اور کشتی تھی شکستہ"

اب میں فیصلہ نہیں کر سکا ہوں کہ مجھے کیا کرنا چاہیئے ــ ماہے ــ اور کسم ــ معصومیت اور روایت ــ اگر میں ماہے کو مایوس کر دوں ــ تو ــ ؟ ــ اگر میں کسم کو اکیلا چھوڑ دوں ــ تو؟

نہ اس کا کوئی رہے گا ــ نہ اس کا کوئی رہے گا ــ اور میں بہ یک وقت دو میں کیسے تقسیم ہو سکتا ہوں ــ ؟ یوں تو میرے کئی چہرے ہیں جو مختلف جگہوں پر آسودگی کی تلاش میں مختلف میک اپ میں موجود رہتے ہیں۔ اور ان میں سے اکثر آسودگی حاصل کرتے رہتے ہیں اور کچھ جھنجلا جھنجلا کر آسودگی پالینے کا انتظار ہی کرتے رہتے ہیں ــ لیکن اصل میں تو انھیں دونوں میں مقید ہے ــ ماہے کہتی ہے کہ میں کسی کی دشمن نہیں ہوں۔ بس تم ایک بار مجھے دیکھ لو۔ میں تو نرگن بھگتن ہوں جز اسے لاپروا ــ اور کسم کہتی ہے ــ تم بس میری طرف ہی دیکھتے رہو ــ کہ میں سگن بھگتن ہوں ــ صلہ کی خواہش مند ــ

اب تم بتاؤ بھائی کاظم ــ میں کیا کروں؟

اور جب بات مجھ تک جاتی تو میں پھر چونک اٹھتا" کیا کہہ رہے تھے تم سیمی بھائی۔ ؟"

تو وہ جھنجھلا کر چیخ اٹھتا" تم کیا بتاؤ گے ۔؟ کہ تمھاری آنکھوں میں خود ہی نہ جانے کتنے سوال، جواب کے انتظار میں قطار اندر قطار کھڑے رہتے ہیں۔ بھیانک اور زہریلے سوالات ۔! جنھیں تم خود ساختہ اصولوں اور تزکیۂ نفس کے سہارے دبائے رکھنے کی ناکام کوشش کرتے ہو۔ لیکن، تم شاید واقف نہیں ہو ۔ کہ جب کبھی تم دور کہیں دیکھنے لگتے ہو۔ تو وہ موقع پا کر چپکے سے باہر نکل آتے ہیں اور اپنے سامنے والے سے جواب کے طلب گار ہی نہیں بلکہ اس سے جواب کی بھیک مانگنے لگتے ہیں ۔ اور تمھاری ساری طاری کردہ انفرادیت کی پول کھول دیتے ہیں۔ جب تمھارے سامنے والا تمھیں اس کا احساس دلاتا ہے۔ تو جلدی سے تم پھر اپنے آس پاس دیکھنے لگتے ہو۔ اور وہ سارے سوالات تم سے خوف زدہ ہو کر پھر اپنی اپنی منھ بند کوٹھریوں میں چھپ جاتے ہیں ۔ پھر تم ۔ اپنے سامنے والے کی کمزوریاں گنانے لگتے ہو ۔ تم خود کو بھی دھوکہ دے رہے ہو۔ بھائی کاظم ۔ اور اس کو بھی دھوکہ دے رہے ہو ۔ کہاں کا شعور اور کیسا لاشعور۔ اور کون اہل افلاک۔ کیسا ان کا معینہ مقصد ۔ ؟ یہ سب تمھارے دن دوپہر کے خواب ہیں ۔ ہوشیار ہو کر جاؤ۔ ! اور نام نہاد اہل افلاک سے اپنے لئے۔ اس کے لئے آزادی مانگ لو ۔ پھر دیکھو۔ تمھاری آنکھ کے سارے سوال صرف خود بہ خود حل نہیں ہو جائیں گے۔ بلکہ اپنی موت آپ مر جائیں گے۔ اور تب تمھیں بھی ان سے کوئی پریشانی نہ ہوگی۔ نہ ہی وہ تمھارا راز افشا کرنے کی ہمت کر سکیں گے۔ جیسے ڈاکٹر داس نے اپنے لئے آزادی چھین لی تھی ۔ ....اور اب اس کی بہن رمو داس آزادی کے لئے درخواست دے چکی ہے۔ جاؤ تم بھی لائن میں کھڑے ہو جاؤ۔ فوراً آسودہ ہو جاؤ گے ۔ جاؤ!"

" جاؤ ۔ بھائی کاظم جاؤ نا ۔ اور خانقاہوں میں تعلیم حاصل کرو۔ خودداری، اصول، تزکیۂ نفس اور انفرادیت کے ڈھول پیٹو ۔ لڑکیوں کو دیکھو تو اپنے طویل ترین بالشت سے اپنی آنکھیں بند کر لو ۔ اور جب لوٹ کر آؤ تو ان سے منسوب کر کے دوسروں کو جھوٹے قصے سناؤ۔ ! آج میں نے فلاں لڑکی کو یوں ڈانٹا ۔ کہ وہ میری طرف یوں دیکھ رہی تھی ۔ آج میں نے فلاں لڑکی کو طمانچہ مار دیا کہ وہ مجھ سے ہی نوٹس کی کاپی لینے پر بضد تھی۔ اور مجھے مغرور کہہ رہی تھی ۔ جاؤ بھائی کاظم اسے زندہ رہنے کا سبق دو ۔ لیکن یاد رکھنا کہ خود تمھیں بھی ابھی کچھ نہیں آتا ہے۔ بس تزکیۂ نفس کئے جاؤ۔ جب آنکھ کھلے گی تو خود ہی سارے سبق جان لو گے ۔ جیسے ڈاکٹر داس نیم پاگل ہو کر جان گیا ہے ۔"

"کاظم بھائی۔ اب یہ صرف ایک روایت ہے جو تم نباہ رہے ہو۔ ورنہ اب تمھیں بھی اپنے فلسفوں کے کھوکھلے پن کا یقین ہو گیا ہے۔ لیکن تم بھی کیا کر سکتے ہو کہ سر گشتۂ رسوم ہو — اور سارے توہمات کو اسی رسم سے باندھتے چلے آ رہے ہو — تم خوف زدہ ہو — ان تصورات کو دوسروں کے حوالہ کرنے سے ڈرتے ہو — کہ وہ بھی کہیں اسے کھوکھلا نہ ثابت کر دیں — تم ڈرتے ہو — ڈ — ڈ — ڈ۔ دوسروں کے نزدیک تو جا کر دیکھو — تمھیں تمھارے علاوہ ہر شخص مکمل ملے گا۔"

تب میں گھبرا کر چیخ اٹھتا " ہاں! ہاں — یار یہ صرف دھوکہ ہے۔ جو میں اپنے آپ کو اسے۔ دیتا آ رہا ہوں، مسلسل سراب پیمائی کر رہا ہوں۔

لیکن کیا کروں۔ کہ کم زور پتھر کی طرح لڑھکنا، ٹھوکر کھانا — اور سر پر ایک لاش اٹھائے رکھنا میرا مقدر ہو چکا ہے — جس کا خون میری آنکھوں سے ٹپکتا رہا ہے۔ ٹپک رہا ہے — اور شاید ٹپکتا رہے گا —"

"ہاں سبی بھائی تم ٹھیک ہی کہتے ہو —"

۱۰

میں اس وقت بھی یقین رکھتی تھی کہ میری آنکھوں سے مسلسل میرا ہی خون ٹپکے گا — اور ٹپکتا رہے گا — لیکن نہ جانے کیا بات تھی — کہ اپنے کو نہ روک سکی۔ اور اس کے سامنے عریاں ہو جانا ہی اپنی نجات سمجھ بیٹھی — جب کہ اس کی خوش نودی بھی نہیں تھی — شاید میں اسے معصوم اور خوش بوؤں سے نابلد سمجھی تھی۔ یا شاید مجھے ہی اس عریانیت کی خواہش تھی — نہ جانے کیا — کاش میں ماہر نفسیات ہوتی۔ تو شاید — تو شاید — ؟؟

جب وہ پہلی بار میرے دروازہ پر آیا تو بہت بلند و بالا لگا تھا — اس وقت تو ہم سب نے پہلی بار کھڑکیوں میں آنکھوں کو پھنسا کر اسے دیکھا تھا — ہم نے سن تو پہلے ہی لیا تھا — کہ ایک شخص کسی پرانی خانقاہ میں مقید کیا گیا ہے۔ جس کی آنکھیں بند ہیں اور چہرے پر بہت زیادہ روشنی ہے۔ بہت سے لوگ اس کی زیارت کو جا رہے ہیں — زیارت کا اشتیاق تو ہم سب کو بھی ہوا تھا اور بہت روٹھے تھے کہ ہم سب بھی قیدی تھے — لیکن آنکھیں کھلی ہوئی تھیں — اور چہرے پر چمک کے بجائے بھیگا بھیگا پن تھا —

پہلی روشنی میں اس کے چہرے پر نظر پڑی تو چہرہ چمک اٹھا — لیکن دوسرے ہی لمحہ اس نے پکار پکار کر بتایا کہ — یرقان زدہ چہرے اور اندھیروں سے بندھی دھواں دھواں آنکھیں کیسی

ہوتی ہیں ـــ دھوکہ نہ کھاؤ۔

جب اس نے لب کھولے تو۔ ہمارے چاروں طرف انگلیوں کے ٹوٹنے کی آواز بکھر گئی ـــ یا جیسے کوئی شیشے کے ٹکڑوں پر چل رہا ہو ـــ اور دھوئیں کی کڑواہٹ ہم سب کی آنکھوں میں پھیلنے لگی ـــ... تب ہم نے اپنی آنکھوں کو مل مل کر سوچا۔

یہ کیسا قیدی ہے ـــ؟ کہ اس کے چہرے پر پیلا پن تو ہے ـــ لیکن قید کے کرب کی کوئی علامت کیوں نہیں ہے ـــ کیا عمداً یہ اس قید خانہ کی طرف گیا تھا ـــ؟ آخر کیوں ـــ؟؟؟ یا یہ قیدی سارے احساسات سے آگے جا چکا ہے؟

اس دم مجھے اپنی اندرونی خواہش کا علم ہوا ـــ اور میں اس سے پرہیز کرنے کا فیصلہ کرنے لگی ـــ لیکن مجھے لگا کہ میں بے بس ہوتی جا رہی ہوں ـــ اور کیوں کا؟ سوالیہ دائرہ ـــ میری چاروں طرف چکرانے لگا ـــ کیوں۔؟ کیوں۔؟

تب میں اس کے کمرہ کی حدود سے اس طرح دور بھاگنے لگی جیسے ابھی وہ مجھے دبوچ لے گا۔ میری نس نس کھینچ کر توڑ کر پھینک دے گا اور اپنے بھیڑیئے ایسے دانتوں سے میرے گوشت کے ریشے نکالنے کے لئے میری ہی ہڈیاں استعمال کرے گا۔ (جب کہ اس کے دانت بھیڑیئے ایسے نہیں تھے۔ جب کہ وہ مجھے دیکھتا ہی نہیں تھا ـــ ہائے کیوں نہیں دیکھتا ـــ؟)

اور دوسروں سے اس طرح بچتی پھرتی جیسے ابھی موقع ملا اور ابھی انھوں نے میرے اندر کا حال جھانک کر دیکھا ـــ

ایک رات میں نے خواب میں دیکھا کہ میرے مرے ہوئے پاپا میرے پاس آئے ہیں ـــ ان کے چہرے پر اداسی بکھری ہے ـــ انھوں نے ایک بار اپنا مشفق ہاتھ میرے سر پر پھرایا ـــ اور واپس چلے گئے۔

دکھ اور گھبراہٹ سے جب میری آنکھ کھلی تو ایسا لگا جیسے میرے سارے گھر پر کچھ کراہتی ہوئی روحیں منڈلا رہی ہیں ـــ ان کی سسکیاں پودوں، گملوں اور پھولوں پر سرسراتی پھر رہی تھیں۔

"افسوس، افسوس کہ افلاک کا لکھا پورا ہو کر رہتا ہے ـــ پورا ہو کر رہے گا"

جب تک میرا شعور ـــ حواس میں آئے۔ وہ سسکیاں لہراتی رہیں۔ اور میرے گھر کا حصار کئے رہیں ـــ پھر جب میں پوری طرح جاگ گئی ـــ تو ایسا لگا جیسے ساری روحیں پردہ ہٹا ہٹا کر اس کے کمرہ میں گھستی جا رہی ہیں۔ ایک کے بعد ایک ـــ سب کی سب سیاہ ماتمی لباس میں، بال

کھولے اور ان پر بھوسہ ڈالے ہوئے ـــــ

"ماں ــ ں ۔ ں ــ اسے بچاؤ ــ وہ سب اسے مار ڈالنے آئی ہیں ـــــ میں بہت زور سے چیخ اٹھی۔

امی کے جھٹکے سے اٹھنے پر میں اور گھبرا گئی ـــ اور ان کی بے چینی آنکھوں کا سوال پڑھتے ہی ــ وہ ــ وہ کہنے لگی۔

اسی وقت مجھے پھر سسکیاں سنائی دیں ـــــ

جب امی جلدی جلدی گھبرائے ہوئے قدموں سے اس کے کمرہ کی طرف بڑھیں ــ تو میں بھی اضطراب میں انھیں کے ساتھ چل پڑی ـــ

اور ــ جب امی نے جلدی سے اس کے کمرہ کا سوئچ آن کیا تو دیکھا کہ وہ اپنی سُرخ سرخ آنکھوں سے ہمیں گھور رہا ہے۔

"کون ہیں۔؟ کون ہیں آپ لوگ ــ؟"

آج میں نے پہلی بار اسے اتنے نزدیک سے دیکھا تھا۔ پھر میری نظریں۔ اس کے دونوں بھیگے ہوئے بازوؤں ـــ اور پھر لتھڑے ہوئے تکیہ پر مرکوز ہو گئیں ـــ امی اس کے سر پہ ہاتھ پھیر رہی تھیں۔

"تمھیں کیا ہو گیا ہے؟ تمھیں کون سا دکھ ہے کاظم ــ مجھے بتاؤ شاید میں کچھ کر سکوں"!

لیکن وہ تو ایسا پتھر بن گیا تھا ـــ جیسے ہم دونوں اس سے کچھ مانگنے آئے ہوں۔ جس پر وہ خاموش آنکھوں سے معذوری ظاہر کر رہا ہو۔ "جاؤ معاف کرو مائی"!

جب میری حلق میں اُچھو ہونے لگا تو میں گھبرا کر وہاں سے چلی آئی ـــ لیکن بقیہ ساری رات ـــ مجھے وہی سُرخ آنکھیں خوف زدہ کرتی رہیں ـــ اور صبح کو وہ کیوں؟ اور بڑا ہوتا گیا۔

لیکن پاپا نے خواب میں آکر میرے سر پہ کیوں ہاتھ پھیرا تھا۔؟ وہ اتنے اداس کیوں تھے ــ؟ ــ آہ پاپا ــ اگر آج تم ہوتے تو شاید یہ کیوں ـــ مجھے اتنا پریشان نہ کرتا لیکن تمھیں جانے کی اتنی جلدی بھی کیا تھی ــ ایں ــ

صبح کو امی شاید میرے بھاری بھاری پپوٹوں کو دیکھ کر چونکی تھیں اور ایک تاسف سا اُبھر آیا تھا ــ شام کو ہی انھوں نے ضویا سے پوچھا ــ

"ضویا یہ کاظم تمھیں کیسا لگتا ہے ــ؟" اور ضویا کے جواب دینے سے پہلے ہی وہ مجھے دیکھنے

لگی تھیں — ضویا نے کیا جواب دیا تھا۔ میں امی کی آنکھوں سے بچنے میں سن ہی نہ سکی تھی —

جب تک وہ کمرہ میں رہتا ہم سب خاموش خاموش اس کی ایک آہٹ پر کان لگائے رہتے۔ اور جب وہ چلا جاتا۔ تو ہم سب اس پر بحث کرتے کرتے اس کے کمرہ میں گھس پڑتے — اور پھر دیکھتے کہ اس کا تکیہ بھیگا ہوا ہے۔ اور اس کی اتاری ہوئی قمیص میں ابھی بھی نمی باقی ہے — تو ہم سب کے ذہن پر ایک ساتھ ہی پھر وہی 'کیوں' سوار ہو جاتا جو کہ روز بروز اپنا جسم بڑھاتا ہی جا رہا تھا۔

کالج میں جب زیبا ظفریاب نے کہا "وہ بنتا ہوگا —! تو مجھے نہ جانے کیوں تکلیف ہوئی — پھر جب اس نے کہا "ضرور اس نے اپنے پر پراسراریت طاری رکھی ہے یقیں — تمہارے گھر والوں کو متاثر کرنے کے لئے" تو مجھے یقین نہ آیا کہ کون کب تک اپنے پر کوئی چیز طاری رکھ سکتا ہے — جب اس نے کہا "تب وہ بہت گھاگ ہوگا" تو مجھے لگا جیسے وہ ایک صاف اور سادہ ترین صفحہ کو گندہ اور گنجلک کر رہی ہے — اس لئے کہ جو کچھ بھی اس کے اندر تھا — وہ تو سب ظاہر کئے دے رہا ہے لیکن کیوں —؟؟

پھر وہی بڑا سا کیوں میرے سامنے آجاتا۔ اور میں کلاسز چھوڑ کر گھر بھاگ آتی — تو دیکھتی کہ اس کی آنکھیں اب بھی سرخ اور نم ہیں — یا اللہ — کیوں —؟

تب مجھے ایسا لگا جیسے آج کل وہ اپنا تجزیہ کر رہا ہے — یعنی اب اس کے بعد پاکیزگی کا دور آئے گا۔ یعنی اب وہ اپنوں کو پہچاننے لگے گا۔

امی کہا " مجھے ایسا لگتا ہے کہ اس کے ساتھ کچھ پراسرار قوتیں ہیں۔ جن کی ہی وجہ سے وہ دوسروں کو اپنا گرویدہ بنا لیتا ہے — جب کہ وہ خود اتنا اکھڑ اور بدتمیز ہے کہ کسی سے سیدھے منھ بات بھی نہیں کرتا — نہ جانے — کیوں —؟"

اور میں سوچتی کیا اس کے ساتھ واقعی کوئی اور روح ہے .... یا کسی آسیب وغیرہ کا سایہ ہے۔ کاش امی اسے اس بنگالی عامل کے پاس لے کر چلی جاتیں —! کوئی اور ضرور اس کے ساتھ ہے — جو ہر وقت اس پر اپنا سایہ رکھتی ہے — "اے روح ہٹ جاؤ — اچھا تھوڑی دیر کے لئے اسے چھوڑ دو — تاکہ وہ مجھے بس ایک بار دیکھ لے — لیکن کیسی بے رحم ہو تم — کہ اس کا یہ خون — آسانی سے دیکھ لیتی ہو — برداشت کر لیتی ہو — کیا تم اس کی راتوں کی سسکیوں کو بھی نہیں سن پاتیں — کیا تمہارا لاشعور اس کی ہر کراہ پر چونک نہیں اٹھتا — نہ جانے

کتنی بے رحم ہو تم ۔۔۔؟ لیکن کون ہو تم ۔۔۔؟ کاش تم اسے چھوڑ دو۔ یقین جانو اے روح۔ میں اکی دوست ہوں۔ بہت سنبھال کر رکھوں گی۔ یقین دلاتی ہوں ۔۔۔"

لیکن کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ اس نے روح کو خود ہی اپنے پر طاری کر لیا ہو۔ ایک روح کے تصور کو اپنے ذہن پر سوار کر لیا ہو۔ اور اب اس کی قید میں رہنا ہی اُسے آسودگی بخشتا ہو ۔۔۔ اور وہ روح ۔۔۔ یا تو کہیں موجود ہی نہ ہو ۔۔۔ یا ۔۔۔ اس کو جانتی ہی نہ ہو۔ (اللہ کرے ایسا ہی ہو۔ اے کاش) اس لئے کہ جب جب بھی یہ اپنے قتل عمد سے فارغ ہوتا ہے۔ تب تب میں نے دیکھا ہے کہ ۔۔۔ اس کا دل صبح کی طرح شفاف۔ سانس کی طرح ہلکا اور برف کی طرح پاکیزہ ہو جاتا ہے ۔۔۔

لیکن کیوں ۔۔۔؟؟

کاش کوئی نہ ہو ۔۔۔

جب ایک دن امی نے اسے اپنا ایک خواب بتایا ۔۔۔ تو پھر اس کی آنکھوں سے خون ابل پڑا ۔۔۔ اور تھوڑی ہی دیر بعد ایسا لگا جیسے وہ روح قہر و جلال بن کر اس کی آنکھوں سے جھانک رہی ہے۔ اور اب اس کے منہ سے جھاگ نکلنے ہی والا ہے۔

امی کہہ رہی تھیں "تب آنے والے نے سدا کے لئے تمھیں میرے حوالہ کر دیا تھا۔ کچھ اور بزرگ دسن رسیدہ لوگ بھی اس کے ساتھ تھے۔"

جب وہ اٹھ کر اپنے کمرہ میں چلا گیا ۔۔۔ تو امی داد طلب نظروں سے ہم لوگوں کی طرف دیکھنے لگیں۔

تھوڑی ہی دیر بعد ضویا نے آکر بتایا۔ کہ وہ بلب پر گرتے ہوئے پتنگوں کو دیکھ رہا ہے اور خون اگل رہا ہے۔

پھر اس نے خود آکر کہا "میں مجبور ہوں۔ میں خواہش کے باوجود کچھ نہیں کر سکتا کہ شاید میں افلاک کے لکھے کو پورا کر رہا ہوں ۔۔۔ در اصل میں خود 'میں' نہیں ہوں۔ بلکہ کوئی اور ہے ۔۔۔ جو مجھ میں ہے ۔۔۔"

پھر وہ وضو کرتے کرتے شاید بوکھلا گیا ۔۔۔ یا وہ روح (کمینی۔ حرام زادی) اس میں حلول کر گئی۔

"نہیں میں آپ کو کچھ نہیں دے سکتا ۔۔۔ آپ مجھ سے مانگ کر اپنے سینہ پر ناقبولی کا داغ ہرگز نہ سہہ سکیں گی ۔۔۔ نہیں میں رب زدہ نہیں ہوں۔ میں تو اس کا عابد ہوں۔ ابھی تو مجھے قرض ہی اتارنا ہے ۔۔۔"

پھر اُس نے ایک کہانی سنائی — اور میٹھا ہی بیٹھا" ۳۰۸ تین سو آٹھ — آٹھ سو تین —
۸۰۳۔ تین۔ آٹھ۔ سو" کرنے لگا۔ اور پھر تر بہ تر ہونے لگا۔

میں نے اور سارے گھر نے تقریباً ساری کہانی سمجھ لی تھی — لیکن "تین سو آٹھ" کو آج تک
ہم میں سے کوئی نہیں سمجھ سکا ہے۔

جب میں نے دیکھا کہ اب میں مایوسی کی شاخ پر مصلوب ہونے والی ہوں۔ تو اپنے کو بہلانے
لگی — ارے وہ تو ایک کہانی تھی — اگر مجھ میں طاقت ہے تو یہ ضرور — ضرور — لیکن کیا ضرور
— ؟ جب کہ اس نے کہہ دیا ہے کہ میں مجبور ہوں۔

لیکن پھر بھی میں اپنے کو نہ بہلا سکی۔ اور اسے جیت لینے کی خواہش میں اپنے کو عریاں
کر بیٹھی — پھر بھی بے حیائی کی ہنسی ہنستی رہی —

اس لئے کہ جب میں اس کے سامنے عریاں ہوتی — تو اس آنکھوں کی چمک بڑھ جاتی اور
میں سوچتی کہ میں کامیاب ہوں — لیکن میں جب کپڑے پہن لیتی — تو اس کی آنکھوں سے حقارت
ٹپکنے لگی — اور میں کھسیا کر پھر ہنسنے لگتی — یا اس کی آنکھوں سے بچنے کی کوشش میں اس کے
گندے انڈر دیر کو اٹھا کر دھونے لگتی — شاید اسی میں اپنی نجات سمجھی تھی —

اور یا تو اسی سے اس کی شکایت کرنے لگتی — "بھائی کاظم میں آپ کو ایسا نہیں سمجھی تھی۔
کہ آپ مجھے عریاں دیکھیں گے — میں تو آپ کو بہت عظیم"

لیکن میں عریاں تو خود ہوئی تھی — اس نے کب کہا تھا کہ تم عریاں ہو جاؤ — پھر
اس سے شکایت — ؟

اس نے تو ایک بار نہیں کئی بار کہہ دیا تھا کہ تم میرے لائق نہیں ہو۔ اس لئے مجبور ہوں۔
کاش اسے یہ بہانہ نہ ملا ہوتا — !

اسی لئے اس کے اس بہانہ کو ہی ختم کرنے کے لئے میں اس کی پسند کو ترجیح دینے لگی۔
پھر بھی افسوس رہتا کہ کیوں نہ میں نے کم از کم وہی مضامین آرٹس کے جو اس کے پسندیدہ تھے شاید
اسی وجہ سے قربت ملتی — یا میں پڑھ لینے کے ہی بہانہ تھوڑی دیر اس کے پاس بیٹھ سکتی۔ تب تو
شاید وہ پڑھانے میں محو ہو کر میری کمزوریاں نہ بتاتا" دیکھو! تم احمق ہو۔ بچی ہو۔ جاہل ہو۔ تمہارے
دانت بڑے ہیں۔ جسم بے ڈھنگا ہے —" اور میں اسے دیکھتی رہتی — رات میں تو صرف اس کی
سانسیں دکھائی دیتی ہیں۔ وہ خود نہ جانے کیسے چھپ جاتا ہے —

مجھ سے تو اچھی زیبا ظفریاب ہی ہے۔

جب چچا جان نے امی سے کہا "سنا ہے یہ لڑکا سردس وغیرہ کے لئے پریشان ہے۔ اس سے کہہ دو کہ زیبا کی ہسٹری اور اردو دیکھ لیا کرے۔ میں پچاس روپے مہینہ دے دیا کروں گا۔" تو اتفاق سے بھائی کاظم بھی اسی وقت آگئے۔ جب چچا جان نے اس سے بھی تقریباً یہی جملے دہرائے تو کتنی بے تعلقی سے وہ کہتا اپنے کمرہ میں چلا گیا تھا۔ کہ میں ٹیوشن نہیں کرتا۔ میرے اصول کے خلاف ہے۔ اور چچا جان امی کا منھ دیکھنے لگے تھے۔

وہی بے تعلقی اس وقت بھی اس کے لہجہ میں تھی۔ جب زیبا اسے دیکھنے اور اس سے کچھ۔؟ باتیں کرنے آئی تھی۔

جب اس نے کہا تھا کہ میں انھیں دیکھنے اور ان سے بات کرنے کی کوئی ضرورت نہیں محسوس کرتا ہوں۔

تیسرے دن جب چچا نے امی کے مشورہ سے کہا۔ "اچھا بھئی آپ بغیر پیسہ لئے تو ہمیں تھوڑا سا وقت دے سکتے ہیں۔؟"

تو ہم سب کئی منٹ تک اس کی طرف جواب سننے کے لئے دیکھتے رہے۔ شاید امی ڈر رہی تھیں کہ وہ۔ کوئی سخت بات نہ کہہ دے۔؟

اور میں یقیناً ڈر رہی تھی کہ۔ کہیں وہ منظور ہی نہ کرلے۔؟

اس نے امی کی طرف دیکھ کر کہا۔ "اچھا۔ یہ ہو سکتا ہے۔ لیکن میرے پاس وقت صبح آٹھ بجے کا ہی ہے۔" مجھے لگا جیسے کسی نے مجھے طمانچہ مار دیا ہو۔

پھر وہ روز زیبا (کمینی۔ مٹی ملی) کو پڑھانے کے لئے جانے لگا۔ اے کاش! لیکن کیا اے کاش؟ شاید اے کاش کہ زیبا روز کالج آکر مجھ سے تمھاری باتیں نہ کرتی۔ بھائی کاظم۔ اور میں اسے خالی خالی نظروں سے نہ دیکھا کرتی۔ کیا یہ بھی اس کے سامنے عریاں ہو کر اپنی اصلیت کھونا چاہتی ہے۔ کیا یہ....؟

ہم واقف نہیں ہوتے لیکن ہم سب کے لئے کوئی نہ کوئی۔ کسی نہ کسی کام کے لئے وقت مقرر ہوتا ہے۔ جب میرا مقررہ وقت قریب سے قریب تر آنے لگا تو میں ساری آس کھو بیٹھی۔ اے کاش۔ اے کاش! اور امی کو جا کر بھائی کاظم سے خود ہی۔ اس جانے ہوئے فیصلہ کے بارے میں آخری بار دریافت کرنا پڑا۔ اور اس نے وہی جواب دیا۔ "میں مجبور ہوں۔"

اور ہم سب نے امی کے تھکے قدموں واپسی سے ہی جواب سن لیا۔ اور شام ہوتے ہی رخت سفر باندھ بیٹھے ـــ اس لئے کہ غم زدوں کا کارواں سنتے ہیں کہ شام کو ہی ڈھل بجاتا ہے ـــ

لیکن وہ خوش اور مطمئن تھا۔ جیسے وہ ان سارے احساسات سے بلند ہو یا انتہائی خود غرض و کمینہ ـــ بے حس و ریاکار ہو ـــ اپنے کو کبھی عریاں نہ کرنے والا۔

بس مجھے تو اسی سے تسکین ہے کہ سفر کی واپسی پر جب میں بے ہوش ہوئی تھی تو اس نے اپنے آنسو خشک کئے تھے ـــ اے بھائی کاظم تمہارا یہی احسان میں ساری زندگی کا مال جانوں گی۔ اس لئے کہ تم نے ہی تو کہا تھا ـــ

"جب مرنے لگو تو آخری چیز یاد رکھو" لیکن بھائی کاظم تم یہ بتانا تو بھول ہی گئے کہ اگر آخری یاد رکھنے قابل چیز وہی موت ہی ہوئی تو ـــ ؟

تب میں اپنے معینہ سفر پر روانہ ہو گئی ـــ

اداس و غمگین ـــ محروم و محزون ـــ میں جو ایک معمولی اور سطحی سی لڑکی تھی ـــ اور ہوں ـــ!

۱۱

ماسٹر صاحب کو گئے ہوئے آج کتنے دن ہو گئے! لیکن مجھے یقین ہی نہیں آتا کہ وہ چلے گئے ہیں ـــ بس اب گھڑی آٹھ بج کر بیس منٹ پر پہونچی اور اب بھائی کاظم کی آواز آئی "میں آؤں ـــ"

لیکن کتنے دن سے یہ آواز نہیں آئی ہے؟ اور میں نہ جانے کیوں غم زدہ ہوں ـــ سبی بھائی بھی تو بغل والا فلیٹ چھوڑ کر چلے گئے ـــ ورنہ ہو سکتا تھا کہ انھیں ہی کوئی خبر ہوتی ـــ لیکن سبی بھائی تو اب کسم کے پاس ہیں۔ سُنا ہے کہ ابھی وہاں نوکری بھی نہیں ملی ہے ـــ بے چارے سبی بھائی۔ اپنے بارے میں کتنی خوش فہمی میں مبتلا تھے لیکن ماسٹر صاحب کے سامنے آکر وہ بھی آخر جھنجھلاہٹ میں مبتلا ہو جاتے۔ بہ قول ماسٹر صاحب کے ـــ "سبی کا موگن ہمیشہ میرے تموگن سے مات کھا جاتا ہے" ہاں واقعی تمھیں دیکھ کر تو ایسا ہی لگتا تھا بھائی کاظم کہ تم کبھی شکست نہ کھانے والے ہو۔ تم حقیقت میں ایک غیر مفتوح تموگن لے کر آئے تھے ـــ اور اب شاید اپنا سارا اثاثہ لے کر کہیں اور چلے گئے ہو ـــ اک ذرا سی بات پر ـــ کیا یہاں پر تمہارا

ستوگن بھی شکست کھا گیا تھا — یا اسے ایک بہانہ مل گیا۔ چلے جانے کا —

ثمینہ کے ہی گھر والے ہوتے تو شاید ان کے بارے میں کچھ معلوم ہوتا۔ لیکن وہ لوگ بھی ثمینہ کی شادی کے بعد ہی — اب تو سال بھر ہوا ہوگا ان لوگوں کو شہر چھوڑے ہوئے۔

کس سے معلوم کراؤں ؟ شاید رمو داس کو معلوم ہو — لیکن اس بے چاری کو بھی کیا پتہ کہ وہ بھی — ان کے رجوگن کی شکست خوردہ ہے — بے چاری جوان لڑکی — سچ بھائی کاظم کیا تم کچھ روحوں کا آشیرواد لے کر اس زمین پر کوئی خاص فرض انجام دینے آئے ہو — نہ جانے اب تم کہاں ہو — ؟

اور کچھ تم نے سنا۔ اب ڈاکٹر داس بالکل ہی پاگل ہو گیا ہے۔ روز گھنٹوں اس پگلی کے پاس آکر بیٹھا رہتا ہے۔ شاید بے چارہ مکافات کر رہا ہے۔ شاید یہ اس کا کفارہ ہو — نہ جانے تم کیسے تھے ماسٹر صاحب کہ اس سے بھی نفرت نہ کرتے تھے — نفرت تو شاید اب میں بھی نہیں کرتی — تم نے ہی تو کہا تھا۔

"کسی کمزور سے نفرت نہ کرو۔ ہو سکتا ہے کہ اس میں ہمارا امتحان لینے والا پرمیشور چھپا بیٹھا ہو —" کون جانے یہ کہانی جھوٹ ہے یا سچ ؟ کون اس پگلی کی ذہنی سطح پر جا کر اس سے اس کی کہانی پوچھ سکتا ہے —"

لیکن ماسٹر صاحب اب خود ڈاکٹر داس ہی اس پگلی کی ذہنی سطح پر آکر اس سے اس کی کہانی کیوں معلوم کرنا چاہتا ہے ؟

میں تو تمھارے سیکڑوں بار سمجھانے کے بعد بھی اپنے ذہن سے اس معصوم لڑکی کی چیخوں سسکیوں اور کرب کو اپنے تصورات سے نہ نکال پاتی تھی۔ (اس لئے بھائی کاظم کہ میں بھی لڑکی تھی — اور شاید اپنے اسی انجام سے خوف زدہ — اور تم لڑکی نہیں تھے) جو اپنے رکشہ والے اکلوتے بھائی کے ساتھ رات کو ٹی بی اسپتال پہونچی تھی — تو نہیں جانتی تھی کہ یہاں کے سکون میں اتنے عفریت خاموش بیٹھے ہیں —

ماسٹر صاحب میں تو اس لڑکی کی آرزوؤں کا ماتم کرتی ہوں — تم بھی تو کچھ نہ مری ہوئی پاکیزہ روحوں کا اکثر تذکرہ کرتے تھے۔ جن کی آرزوئیں ان کی زندگی میں نہ پوری ہو سکی تھیں — جس وجہ سے وہ آم کے سایہ دار درختوں میں غم زدہ سرسراتی رہتی تھیں۔ اور اپنی ادھوری دعاؤں کی تکمیل کے لئے دعا خواں ہوتی تھیں۔

میں بھی اس لڑکی کی سرسراتی ہوئی زندہ روح کو محسوس کرتی ہوں۔ اس لئے کہ شاید میں خود کسی ٹی بی اسپتال کی غم زدہ روح ہوں — اور اسی لئے ڈاکٹر داس سے نفرت کرتی تھی — شاید اب بھی کرتی ہوں — کیا ہوا کہ وہ پاگل ہو گیا؟ اس نے قتل بھی تو کئے ہیں — ان معصوم آرزوؤں خوابوں کا قتل جو ابھی پوری طرح واضح بھی نہیں ہو پائے تھے — ان معصوم بچوں کا قتل جو ابھی پیدا نہیں ہوئے تھے —

ہائے ڈاکٹر تم کتنے بڑے قاتل ہو۔ کہیں میں واقعی تم سے نفرت نہ کرنے لگوں۔

تم اس رات کے واقعہ کے بعد اپنے کو بھلانے لگے تھے — جاننے والوں کو یہ بتانے کے لئے کہ تم شرمندہ ہو۔ اور تب — بہت دن بعد تم پاگل ہوئے ہو — لیکن اس معصوم رکشہ والے کی معصوم بہن تو اسی رات پاگل ہو گئی تھی — جب وہ تمہاری قید سے آزادی پا کر بھاگتی ہوئی اپنے بھائی کے پاس پہونچی تھی — اپنے سارے دکھوں اور نقصانات کو بھلا کر — وہ بس بھاگے جا رہی تھی۔ لیکن جب وہ وہاں پہونچی تو اسے معلوم ہوا کہ اس کا بھائی اپنی فطری موت سے چند دن پہلے ہی — یعنی کل مر چکا تھا۔ ارے ڈاکٹر داس تمھیں حسب وعدہ انجکشن تو منگوا ہی دینا تھا — اس لئے کہ تم نے اسے قید کرتے وقت یہی وعدہ کیا تھا —

لیکن تم تین دن — تین رات صرف اس کے جسم کو دیکھتے رہے — اور جب وہ کراہتی ہوئی اٹھتی تو پہلا سوال یہی کرتی ” ڈاکٹر صاحب! بھیا کیسا ہے “؟ تم کیا جواب دیتے تھے — میں نہیں سوچ پاتی ہوں۔ بس ایک عجیب سی خواہش ہے — کاش تم نے اس کے رکشہ والے بھائی کو اپنی بہن کے انتظار میں..... دیکھ لیا ہوتا — کاش ڈاکٹر داس — صرف ایک بار —

ڈاکٹر داس آج تم پاگل ہو کر کفارہ ادا کر رہے ہو۔ اور دن رات اس غلیظ گھورے پر پگلی کے ساتھ بیٹھے رہتے ہو — لیکن کاش تم اسی وقت پاگل ہو گئے ہوتے جب تمھارے ہی فلیٹ کے نیچے — یہ سڑکوں پر سے جوٹھے پتے اُٹھا کر لاتی اور بیٹھ کر تقسیم کیا کرتی تھی

” یہ بھیا کے لئے ہے — ابھی بھوکا آتا ہو گا —“

” یہ منا کے لئے ہے — دھت — منا کہاں ہے ابھی“ وہ شرما کر اپنے لباس کی ایک دھجی اپنے دانتوں میں دبا لیتی —

” نہیں — یہ سب بھیا کا ہے ہاں —!“

پھر وہ چپکے سے ان تمام پتوں میں سے ایک پتہ اٹھا کر چاٹنے لگتی — اور شرارت سے یا ڈر سے

ادھر ادھر دیکھنے لگتی — شاید — کہیں اس کارکشہ والا بھیا تو چوری کرتے نہیں دیکھ رہا ہے — یا کہیں اس تپہ کا مالک تو نہیں آرہا ہے۔ پتے چھیننے —

ڈاکٹر داس شاید تم نہیں جانتے — کہ ہر لڑکی — جب وہ پیدا ہوتی ہے تو — ماں بن جاتی ہے — بہن بن جاتی ہے — اور بیوی بن جاتی ہے —

خیر اچھا ہی ہوا ڈاکٹر کہ تم پاگل ہو کر ہی اس پگلی کے پاس آگئے۔ اور تمھاری بہن — رمو داس کو آزادی مل گئی — اس لئے کہ دعا خواں رہیں بد دعا بھی تو دے سکتی ہیں۔

چھوڑو ماسٹر صاحب — کاش میں اپنے کو تمھارے جیسا نہ سہی تمھارا عکس ہی بنا لیتی — تو شاید کامیاب ہو جاتی — اور اتنی ہی بلندی سے حقائق کو تلاش کرتی جتنی بلندی اور غیر جانب داری سے تم محاسبہ کرتے تھے۔ اپنا اور دوسروں کا —

جب ثمینہ نے پہلے دن تمھارا تذکرہ کیا تو میں نے اس سیدھی سادی معصوم اور احمق لڑکی کی آنکھوں میں بہت کچھ تلاش کر لیا تھا۔ شاید تمھارے وہاں آنے کے کئی مہینہ بعد وہ مجھ سے تمھارا تذکرہ کر گئی تھی۔ مجبور ہو کر یا سہواً — تو میں نے اس سے کہا تھا کہ تم بنتے ہو صرف۔ یا خول چڑھائے ہوئے ہو — یا دوسروں کو متاثر کرنے کا ڈھونگ نکالا ہے تاکہ سب تم سے ہمدردی کر سکیں — لیکن جب مجھے معلوم ہوا کہ تم نے مجھے پڑھانے سے انکار کر دیا ہے — تو مجھے تم سے ملنے کی خواہش ہوئی — اس لئے کہ مجھے واقعی کسی اچھے ٹیوٹر کی ضرورت تھی — اور تمھارا رزلٹ اور تصویر تب تک میں اخبار میں دیکھ چکی تھی (ثمینہ نے دکھایا تھا) پھر اس وقت تو سبی بھائی نے بھی پاپا — ممی سے تمھاری کافی تعریف کی تھی۔ شاید اس لئے کہ تمھارے پڑھانے کے لئے آجانے سے انھیں بھی آنے جانے کا بہانہ اور موقع ملتا رہے گا۔ بے چارے سبی بھائی — تب ہی تو تمھارے چلے جانے کے بعد اکثر آکر تمھارے بارے میں ممی کو گھٹیا قسم کے لطیفے سنایا کرتے تھے —

اس دن میں صرف تم سے ملنے اور تمھیں اپنے پڑھانے کے لئے تیار کرنے ہی ثمینہ کے گھر گئی تھی — لیکن تم نے انکار کر دیا تھا — پھر جب تم آنے لگے تو مجھے ایسا لگا جیسے تم ہم سب پر احسان کر رہے ہو۔ حالاں کہ تم نے کبھی یہ ظاہر نہ کیا تھا۔ بس آتے — خاموشی سے کتابوں۔ اور نوٹس میں کھو جاتے اور اٹھ کر چلے جاتے۔ تب میں کالج جا کر ثمینہ کو پکڑ کر تمھاری نقلیں کیا کرتی تھی تمھارے بولنے کی تمھارے شعر پڑھنے کی — تمھارے دیکھنے کی۔ تمھارے سنجیدہ ہونے کی۔ تمھارے ہنسنے کی۔ تمھارے سگریٹ پینے کی۔ گڈو سے چھیڑ کرنے کی۔ اور اس کا مصرعہ سنا کر تمھیں پریشان کرنے کی۔

تو تمینہ تمھارے مُڑ نے کی نقل کرتی تھی۔ اور مجھے افسوس ہوتا تھا کہ یہ معمولی سی لڑکی بس اتنا ہی دیکھ سکی —؟ اس سے اچھی تو گڈو ہے — جو تمھارے ہاتھ ہلانے کی — انگلیاں ہلانے کی — اور تمھارے س، کو، ص، کہنے کی نقل اتار لیتی ہے —

کتنے قریب سے گڈو نے تمھیں دیکھا تھا بھائی کاظم — اب وہ بھی بہت اداس ہے — اور تمھارا وہ پسندیدہ قطعہ دوہرایا کرتی ہے۔ وہی "رہئے اب ایسی جگہ چل کر" والا۔

پرسوں ہی ماہے بھی تمھیں پوچھنے آئی تھی۔ نہ جانے کیوں؟ میں نے پوچھا بھی تھا۔ لیکن وہ یہ کہہ کر ٹال گئی کہ "اُردو کا ایک افسانہ دکھلانا تھا"

بے چاری ماہے۔ جو سبی بھائی سے کبھی سبی بھائی کو نہ مانگ سکی۔ صرف اس خوف سے کہ اگر سبی بھائی نے انکار کر دیا تب —؟ بزدل ماہے اب سنا ہے کہ اس نے پڑھائی بھی چھوڑ دی ہے اور پاکستان جانے کا ارادہ کر رہی ہے — وہ میری آنکھوں میں جھانک کر پوچھ رہی تھی — کیا تمھیں بھی پتہ وغیرہ دے کر نہیں گئے ہیں؟

میری سمجھ میں اس وقت نہیں آرہا تھا کہ میں کیا جواب دوں — کہیں آنکھ نہ بول پڑے۔ اس لئے جلدی سے گڈو کی طرف دیکھنے لگی تھی — کہیں میں جھنجھلا نہ جاؤں — اس لئے ریڈیو آن کرنے لگی تھی — اور صرف اتنا کہہ سکی — "نہیں"۔ نہ جانے میں اتنی کمزور کیوں ہو گئی تھی۔ جب کہ تم بھی تعریف کرتے تھے کہ "تم کافی مضبوط لڑکی ہو — اسی لئے میں اتنے دن تک تمھیں پڑھاتا رہا"

لیکن میں آج سوچ رہی ہوں کہ کیا ماہے اگر سبی بھائی کو سبی بھائی سے مانگتی تو —؟

لیکن بھائی کاظم جاتے وقت تو تم پر نہ جانے کون سا آسیب تھا۔ نہ تو تم نے گڈو کی طرف دیکھا — نہ ہی میری طرف — صرف ذرا سی بات پر۔ ہاں بھائی کاظم واقعی یہ ذرا سی بات کہاں تھی؟

ممی نے تو پہلے مجھ سے ہی کہا تھا کہ میں تم سے کنگن کے بارے میں ضرور پوچھوں — اور میں — میں نے کمزوری سے انکار کر دیا تھا۔ اس لئے کہ اس کے علاوہ اور کچھ نہ کر سکتی تھی — مجھ سے زیادہ مضبوط تو یہ گڈو ہے۔ جو انکار کے بعد رونے لگی تھی چیخ چیخ کر — ہاں بھائی کاظم۔

ماسٹر صاحب تم کیسے ستو گئی تھے۔ کہ ایک معمولی سا چوری کا الزام نہ برداشت کر سکے اور سب کچھ چھوڑ کر چلے گئے — تم تو کہا کرتے تھے کہ "اس شہر سے مجھے پیار ہے کہ میرے گیارہ برسوں کا ساتھی ہے — میں اسے مرنے کے بعد چھوڑوں گا — اس لئے کہ مجھے دفن تو کہیں اور ہونا ہے" میں آج تک

سمجھ پائی ہوں کہ تم کہاں دفن ہونا چاہتے تھے ــ؟ ارے ــ میں یہ کیا بکنے لگی ــ ابھی گڈو سن لے تو مجھے مار ہی ڈالے۔

ہاں بھائی کاظم ــ گڈو تمھیں بہت یاد کرتی ہے۔

اور کنگن تو اسی دن ہی مل گیا تھا مسہری کی نواڑ میں چلا گیا تھا۔ اسی لئے تو میں نہ جانے کیوں اسی دن سے ہی آٹھ بج کر بیس منٹ پر تمھارا انتظار کر رہی ہوں۔ کہ تم آجاؤ گے ــ تو میں پہلی بار تم سے اتنی بات کروں گی۔ کہ "ماسٹر صاحب اگر ہو سکے تو ــ ہم لوگوں کو معاف کر دیجئے"

ہاں ماسٹر صاحب آپ آجائیے تو میں اتنا آپ سے ضرور کہوں گی ــ حالاں کہ آپ جب آجاتے تھے۔ تو میری زبان نہ جانے کیوں رک جاتی تھی ــ بولتی تو صرف آپ کی گڈو تھی ــ ہاں آپ کی ــ تمھاری نہیں ــ

۱۲

ابھی ابھی خط سے معلوم ہوا کہ کاظم کہیں چلا گیا ہے ــ؟ نہ جانے کہاں؟

تم مارے گئے۔ کبھی تو تم نے کوئی ایسا کام کیا ہوتا جس سے خوشی ہوتی ــ جہاں گئے ہو ــ کوئی۔ کوئی ایسی حرکت تم سے ضرور سرزد ہوئی ہے جس سے ہم لوگوں کی نظریں نیچی ہوئی ہیں ــ نہ جانے تم میں کون سی کالی روح گھس گئی ہے جو تمھیں ہر اچھے کام سے روکتی ہے ــ مجھے تو یقین ہی نہیں آتا کہ ہم دونوں ہی تمھارے ماں باپ ہیں۔

تم جس سے بھی ملے ہو ــ بتاؤ کیا وہ تم سے مل کر خوش ہوا ہے ــ کیا اسے تمھاری وجہ سے دکھ نہیں پہونچے ہیں ــ اس کے بعد بھی تمھیں ہم لوگوں سے شکایت رہی ہے کہ ہم نے تمھیں چاہت نہ دی ــ تمھارے باپ نے کبھی تمھیں بیٹا کہہ کر نہیں پکارا ــ بلکہ ہمیشہ طنز میں گفتگو کی ہے ــ اگر کبھی کی ہے تو ــ ورنہ وہ تو واقعی تم سے بات کرنے میں احتیاط برتتے تھے ــ کہ کہیں تمھارے اندر کی غلاظت تمھارے منھ سے اُبل کر ان کے بے داغ ضمیر پر نہ چپک جائے میرے سامنے تو تمھاری ساری زندگی کھلی ہوئی ہے۔ لیکن تمھیں کبھی ان کالی طاقتوں نے اتنی فرصت نہ دی کہ ان کا تجزیہ کر کے اپنے کو سدھار سکو۔

تم خود سوچو کہ تمھاری تنہانسی کا سبب کیا ــ؟ گھر ــ خاندان، اعزا، ان سب میں سے کوئی تم سے خوش نہیں ہے ــ؟ کاش تم نے کبھی اس پر غور کیا ہوتا! ــ؟

کیا تم سمجھتے ہو کہ ہمیں تمھاری اس بدنصیبی سے خوشی ہے ــ؟ نہیں۔ بلکہ ہم سب تم سے

نفرت کرنے پر مجبور ہوتے گئے تھے ۔۔۔ اس لئے کہ تم میں خود تمھاری کمزوریاں تھیں۔

اور آج تم نہ جانے کہاں ٹھوکر کھا رہے ہو گے ۔۔۔؟ اس لئے کہ شاید یہی تمھارے مقدر میں
میں لکھا جا چکا ہے ۔۔۔ نہ جانے کس بیکری یا ہوٹل میں برتن مانجھ رہے ہو گے کہ اسی کی پیشین گوئی
تمھارے باپ نے بہت پہلے کردی تھی۔

لیکن میں کیا کروں کاظم کہ میں تمھاری ماں ہوں۔ پھر بھی تمھیں اپنے سینہ سے لگا لیتی تھی۔
یہ جانتے ہوئے کہ جب جب بھی میں نے تمھاری پیٹھ پر ہاتھ پھیرا ہے تو بجائے اس کے کہ ہمک کر سینہ سے
لگ جاتے ۔۔۔ تم سوچا کرتے تھے ۔۔۔ کہ اتنی لمبی چوڑی پیٹھ پر اگر اتنا لمبا چوڑا اور اتنے وزن کا ہاتھ
پھرایا جائے ۔۔۔ تو کیا تاثر پیدا ہو گا ۔۔۔؟

اور تمھاری آنکھیں کہا کرتی تھیں ۔۔۔" اچھا اچھا بس کرو ۔۔۔ جانتا ہوں تمھاری مکاری!"

لیکن تم نے یہ کبھی نہ سوچا کہ ہم نے تمھاری کوتاہیوں اور خامیوں کے بعد بھی تمھیں اپنا سمجھا۔
اس لئے کہ ہم سب کی تمنائیں اور آرزوئیں تم سے ہی وابستہ تھیں ۔۔۔ لیکن تم نے کبھی اس کا احساس
نہ کیا۔ بلکہ ہمیشہ اپنے فیصلوں پر ہی عمل کرتے رہے۔ جس کے ہی نتیجہ میں سیدھے اور سچے راستوں سے
بھٹک کر تمھیں ٹھوکریں کھانا پڑیں ۔۔۔ اور مجھے یہاں تڑپنا پڑا ۔۔۔ اس لئے کہ تم میرے بیٹے تھے ۔۔۔
اس لئے کہ میں تمھاری ماں تھی۔ اور پھر مجھے تو تمھاری اور زیادہ ضرورت تھی۔

بچپن بیتا ۔۔۔ جوانی آئی ۔۔۔ تو میں نے بھی خواب دیکھے تھے۔ اپنا گھر ۔۔۔ اپنا ماحول۔ لیکن خوابوں
کی تعبیریں جب اتنی بھیانک ظاہر ہوئیں تو میں نے پھر خواب دیکھے کہ اب کاظم مجھے ان خوابوں کی تعبیر دیگا۔

اور اب افسوس ہوتا ہے کہ کاش میں نے ایک خواب کے بعد دوسرا کوئی خواب نہ دیکھا ہوتا۔۔۔
تو شاید تم ایسے نہ ہوتے ۔۔۔ میرے لئے غیر ۔۔۔ دوسروں کے لئے ننگ ۔۔۔ کاظم ۔۔۔ اب تو تنہا نسب
ہم لوگ ہیں ۔۔۔ نہ کہ تم ۔۔۔

تم نے کبھی اپنے باپ کے دل میں جھانک کر بھی دیکھا ہے کہ ان کے دل میں تم نے کتنے ٹوٹے
ہوئے خوابوں کے زخم ڈالے ہیں ۔۔۔ انھیں تم سے کتنی امیدیں رہی ہوں گی ۔۔۔ لیکن جب تم انھیں
درمیان سے ہی توڑنے لگے تو ان پر کیا بیتی ہو گی۔

تم ہی بتاؤ کہ تم نے کون سا کام اچھا کیا ہے۔ جس کی تمھیں جزا دی جائے۔ پہلے تو ہم تمھاری
ساری غلطیوں کو ناسمجھی اور بچپنا کہہ کر اپنے دل کو بہلا لیا کرتے تھے۔ لیکن اب تو تم بچے نہ تھے۔ پھر تم نے
عمداً کیوں سیدھے اور صاف راستے کو چھوڑا ۔۔۔ اور اس کے بعد اتنا پریشان ہوئے ۔۔۔ نہ صرف پریشان

ہوئے بلکہ اپنے گھر اپنے باپ اور اپنے خاندان کی ناک کٹائی —

تم خود سوچو جب کوئی سنتا رہا ہوگا کہ یہ مزدور لڑکا.... ان کا بیٹا ہے۔ یہ رکشہ والا.... ان کا لڑکا ہے۔ یہ چپراسی.... اس خاندان کا ہے۔ تو لوگوں نے تمھیں کن نظروں سے دیکھا ہوگا — اور ہم لوگوں کے بارے میں کیا سوچا ہوگا — ؟

کیا تم میں عزت نفس بھی نہیں رہ گئی تھی —

میں تو لوگوں سے کہا کرتی تھی کہ میں نے آج تک کاظم کو کوئی چھچھوری حرکت کرتے خود نہیں دیکھا جب کہ خاندان کے سارے نوجوان گھر میں یا باہر سے بلائی ہوئی نوکرانیوں کے ادھ کھلے گریبانوں میں جھانکنے کے لئے بار بار اپنے پنجوں پر کھڑے ہوا کرتے تھے — لیکن اب تم ہی بتاؤ — آنے والی لگاتار خبروں پر میں کیسے ان لوگوں کا منہ بند کرتی۔ اور ان کے طنز پر کیسے انھیں اسی اعتماد سے منھ توڑ جواب دیتی — کاظم تم تو تنہا نسب اپنی وجہ سے ہوئے تھے۔ لیکن ہم بھی صرف تمھاری ہی ذات سے تنہا نسب ہو گئے۔ سب سے رشتہ توڑ کر الگ آ بیٹھے ہیں۔ آخر کس کس سے۔ کب تک تمھارے کارنامے سنتے۔ ان پر تنقید برداشت کرتے — ؟ اور پھر کس کس کو اپنے دودھ کی صفائی کا واسطہ دے کر تمھاری صفائی دیتے —

لیکن کاظم ہم لوگ پھر بھی تمھاری طرف سے مایوس نہ تھے اور سوچا کرتے تھے کہ ماضی ہمارا ہوگا تم سدھر کر فرائض کا احساس کرو گے — لیکن تمھاری ڈائری پڑھ لینے کے بعد سے ساری امیدیں ختم ہو گئیں — اس لئے کہ ہمیں یقین تھا کہ کم از کم تمھیں اپنی کمزوریوں کا تو احساس ہوگا ہی — اور یہی تم میں چھپی ہوئی اچھائی کا ثبوت ہوگا —

لیکن ڈائری پڑھ لینے کے بعد علم ہوا کہ تم پوری طرح شیطانی طاقتوں کے قابو میں آچکے ہو — اس لئے کہ تمھیں اپنی برائیوں اور کمزوریوں کا احساس نہ تھا۔ بلکہ ان سب کے لئے ایک تاویل اور توجیہہ موجود تھی — تم نے انھیں جھوٹے فلسفوں کی ٹٹی میں چھپایا تھا۔ اور ساری ذمہ داری ہم سب پر ڈال دی تھی — ہاں واقعی اس کا افسوس ہمیں بھی ہے کہ تم کیوں اس خاندان میں پیدا ہوئے — تم نے کیوں میری کوکھ سے جنم لیا — اور میں نے کیوں تمھیں اپنا دودھ پلا کر تمھاری روح کی گندگی میں شرکت کی —

آج خدا جانے تم کہاں ٹھوکر کھا رہے ہو؟ اس سردی میں کیا پتہ تمھارے پاس گرم کپڑا ہے کہ نہیں؟ معلوم نہیں تم نے کچھ کھایا بھی ہے کہ نہیں؟ کیا پتہ کاظم۔ کھانا تو اس وقت یہاں بھی کسی نے

نہیں کھایا ہے۔

کاش تم نے اس وقت اپنے کمزور باپ کا چہرہ دیکھا ہوتا۔ جب اس نے مجھے خط دیا تھا۔۔۔ نہ جانے کتنی سیاہی ان کے چہرے پر امنڈ آئی تھی ۔۔۔ اس لئے کہ پھر بھی تم ہمارے بیٹے تھے۔۔۔ لیکن کاش تم نے بھی کبھی یہ محسوس کیا ہوتا ۔۔۔ اے کاش کاظم ۔۔۔

تمھیں تو ہمارے ہر فعل میں خود غرضی، مکاری اور دکھاوا نظر آتا تھا۔

تم سمجھتے تھے کہ ہم نے تمھارے ساتھ کچھ نہیں کیا ۔۔۔ اور اب تمھاری طرف بھوکی نظروں سے دیکھ رہے ہیں ۔۔۔ تمھیں نوچنے کے انتظار میں بیٹھے ہیں ۔۔۔ یا تم پر اپنا بوجھ ڈالنا چاہتے ہیں ۔۔۔ حالانکہ یہ غلط ہے ۔۔۔ آج بھی تمھارے باپ کی اتنی تنخواہ ہے کہ ہم آسانی سے بسر کر سکتے ہیں ۔۔۔ کاظم ہمارے سارے دکھ سارے افکار تمھارے لئے تھے۔ صرف تمھارے لئے۔ اور صرف اسی لئے کہ تم ہمارے بیٹے تھے۔ ہمارا خون تھے۔

تم لوٹ آؤ کاظم ہمیں تم سے کچھ نہیں چاہیئے ۔۔۔ آجاؤ ۔۔۔ میں محنت مزدوری کرکے تمھیں پھر سے پالوں گی ۔۔۔ ہاں بیٹے لوٹ آؤ ۔۔۔ دیکھو کمرہ میں تمھارا باپ جاگ رہا ہے ۔۔۔ شاید چپکے سے رو بھی رہا ہو۔

کیا تم سمجھتے ہو کہ ان کا دل نہیں چاہتا ہوگا کہ تمھیں بیٹا کہہ کر پکاریں تمھارے سر اور جسم پر شفقت سے ہاتھ پھیریں ۔۔۔ لیکن وہ شاید یہی سوچتے ہیں کہ نہ جانے تم ان کے منہ پر ہی اس فعل کو مکاری اور خود غرضی کہہ دو ۔۔۔ تو ۔۔۔ ؟؟

اس لئے کہ تم نے اس دن بھی یہی کہا تھا جب تم پامسٹ کے یہاں سے لوٹ کر بیہوش ہوئے تھے ۔۔۔ میں تمھارے سرہانے بیٹھی ہوئی دعا پڑھ رہی تھی ۔۔۔ رات بھر کے بعد جب صبح تم کو ہوش آیا تو تم نے کتنی ذلت سے کہا تھا کہ صرف اس لئے سارا گھر پریشان تھا۔ کہ اگر میں مرگیا۔ تو اس گھر کا کیا ہوگا ۔۔۔ تم سب مجھے نوچنے کے لئے زندہ رکھنا چاہتے ہو۔

سوچو کاظم ۔۔۔ ہمیں کتنا دکھ ۔۔۔ اور تم سے کتنی نفرت ہوئی ہوگی۔ ہم نے تمھیں صرف اس لئے زندہ رکھنا چاہا تھا کہ تم زندہ رہ سکو ۔۔۔ اور اپنا بنیادی فرض پورا کر سکو ۔۔۔ لیکن تم نے تو اپنا بنیادی فرض ہی کچھ اور بنا لیا تھا۔ یا طاری کر لیا تھا۔ لیکن کاش تم نے پہلے اپنی روح کو پاک و پاکیزہ کر لیا ہوتا ۔۔۔ تب تم کو مجھ سے بھی شکایت نہ ہوتی کہ میں طنز کرتی ہوں ۔۔۔ اور نہ ہی مجھے تمھاری اس خواہش کا تذکرہ تمھارے باپ سے کرتے جھجک ہوتی۔

مگر میں جانتی تھی کہ تم اس معصوم لڑکی کو بھی اپنے ساتھ اپنی گندگی میں کھینچ لینا چاہتے ہو۔ اور یہ طلب — صرف تمھاری گندی روح کی طلب ہے — ورنہ تمھارے پاس کچھ بھی نہیں ہے — یوں تم اپنے آپ اپنی ڈائری میں — یا دوسروں کے سامنے پل بھر کے لئے جو چاہو بن سکتے ہو — لیکن واقعات گواہ ہیں کہ لوگوں نے بہت دن تک تم سے دھوکہ نہیں کھایا ہے — اور تمھارے اظہار خلوص کے پیچھے چھپی ہوئی خود غرضی یا 'رشوت' کو پہچان گئے ہیں —

یہی وجہ تھی کہ میں تمھاری اس خواہش پر بھی طنز کرتی تھی — جسے تم نے عبادت کا اعلیٰ مرتبہ دے رکھا تھا۔ تمھارے آنسوؤں پر اظہار ہمدردی کرنے کے بجائے نفرت کا اظہار کرتی تھی — اور دل میں سوچتی تھی کہ کتنا گر گیا ہے۔ کیا یہ واقعی میرا خون ہے ؟

پھر بھی کاظم (چھوڑو ان باتوں کو) تم میرے بیٹے ہو۔ اس لئے لوٹ آؤ۔ اپنی گندی روح کو جہاں تم ہو وہیں چھوڑ دو — اور لوٹ آؤ (تاکہ دوسرے تم سے اب بہت زیادہ دھوکہ اور نقصان نہ اٹھائیں) پھر خود ہی بیٹھ کر اپنے سارے اعمال کا تجزیہ کرو — تاکہ پھر کبھی ماں کے ہاتھوں کے وزن اور قد و قامت پر نہ غور کر سکو — بلکہ ہمک کر اس کی گود میں آجاؤ تاکہ کبھی باپ کی نگاہوں کو بھوکی آنکھ نہ کہو — بلکہ ان کی شفقتوں کے سامنے اپنی روح کو جھکا دو — تاکہ کبھی بہن کے پیار کو خود غرضی، بناوٹ اور مکاری نہ کہہ سکو — شاید اب بھی تمھیں خدا معاف کر دے — شاید اب بھی تمھاری نجات ممکن ہو — ؟

۱۳

جب میں سوچتا ہوں کہ ان طویل برسوں میں کیا کھویا اور کیا پایا ہے تو مجھے سارے کا سارا زیاں ہی دکھائی دیتا ہے۔ کھویا ہوا۔ جیسے اب تک میں کچھ نہ پانے کی ہی سعی اور لاحاصلی کی جدوجہد کر رہا تھا۔

میرا ماضی کیا تھا — ؟ اسے اپنی سلیٹ پر سے ایک منچلا بچہ مٹانے کی ناکام کوشش کر رہا ہے!

میرا حال کیا ہے — ؟ یہ میں ہی بہ خوبی جانتا ہوں — !

میرا مستقبل کیا ہوگا — ؟ چھوٹ سی کچھ۔ آئینوں میں نظر تو آتی ہے — ! شاید اتنا بڑا دھوکہ اب تک کسی نے نہ کھایا ہو — کیا واقعی وہ کوئی آسیب تھا جس کی گرفت دن بہ دن مجھ پر سخت ہوتی جا رہی تھی — ؟ یا کسی ٹونے اور تعویذ کا اثر تھا — ؟ تمھیں بتاؤں — شاید تم سے ان روحوں نے کچھ بتایا ہو۔ میں نے تو اپنا سب کچھ صرف ایک جستجو میں کھو دیا — اب تو میں خود بھی اپنے پاس نہیں ہوں۔ جانے کب آؤں — یا آ بھی سکوں — کہ نہیں ؟ کون جانے — ؟ اور جب آؤں تو کیا خود سے الجھ الجھ

نفرت نہ کرنے لگوں گا —؟

ارے بھائی کاظم — ایک معمولی سی بات پر تم نے اپنا سب کچھ ٹھکرا دیا — اور اب وہ معمولی سی بات بھی تمھیں نہ حاصل ہو سکی —!

تم تو ستو گئی — نرگئی — تو گئی — رجو گئی۔ اور نہ جانے کیا کیا بکا کرتے تھے کیا اسی لئے؟ کہ سب چھوڑ دو — ایک سراب کے لئے سارے میٹھے چشموں پر سے گذرتے چلے جاؤ — اپنے آپ میں گم، اپنی خود ساختہ بلندیوں کے ساتھ —؟

اب بتاؤ — اب کون ہے تمھارا۔ کیا تمھارا ملک تمھارا ہے۔ تمھارا شہر تمھارا ہے۔ تمھارا محلہ تمھارا ہے۔ تمھارا گھر تمھارا ہے۔ تمھارے گھر کے افراد تمھارے ہیں؟ سب کو اپنی کٹتی ہوئی ناکوں کا خوف تھا لیکن تمھیں عزت نفس کا خیال بھی نہ آیا؟ چھوڑو اس بحث کو کہ کس کی کتنی غلطی تھی — اب تو وہ شہر بھی تمھارا نہیں رہ گیا۔ جس میں بس رہنے کے تم نے ہمیشہ خواب دیکھے تھے — اُف رے وہ کرب! جب تمھیں اپنے آپ سے ہی وعدہ کرنا پڑا کہ تم شہر دل سے نکلے جا رہے ہو —

اور ان غیر مرئی انگلیوں کے بندھے ہوئے دھاگوں نے تمھیں یہاں لاکر پٹک دیا۔ اور دھاگوں کا رشتہ بھی منقطع کر لیا — اب تم یہاں کے لوگوں سے بچتے پھرتے ہو — انھیں بیوقوف بناتے ہو۔ اپنے سے جھوٹی سچی کہانیاں منسوب کر کے دوسروں کو سناتے ہو اور ان کی ہمدردی حاصل کرنا چاہتے ہو۔ ارے اگر تمھیں ہمدردی ہی حاصل کرنا تھی تو اپنی پیدائش کے وقت سے کشکول لے کر نکل پڑتے — کیا کیا چیزیں تم نے اپنے اوپر طاری کر رکھی تھیں اور کتنی اوپر جا کر تم محاسبہ کیا کرتے تھے — (اپنا نہیں) لیکن اب —؟؟

آؤ! اب بھی لوٹ چلو۔ ابھی بہت وقت ہے۔ اب بھی کچھ لوگ میٹھے پانی کے چشموں کے کنارے دل کا الاؤ جلائے تمھارا انتظار کر رہے ہیں — ان کی کھجوروں — پیازوں — روٹیوں — اور زیتون کے تیل میں — تمھارے انتظار میں پھپھوندی لگتی جا رہی ہے۔ ریت کی ابھری ابھری آنکھیں تمھاری واپسی کے نقوش تلاش کرنے میں ایک جگہ سے اڑتی ہیں لیکن جب تھک جاتی ہیں — تو پھر سب ایک جگہ جمع ہو کر تمھاری تلاش کے منصوبے بنانے لگتی ہیں — اور پھر اڑ چلتی ہیں — واپس چلو بھائی کاظم — اس لئے کہ تم بھی کسی کے منتظر ہو — اور اب یہاں کوئی نہیں — کوئی نہیں — آئیگا!

جب کبھی تم نے دوراہوں پر آکر لوٹ جانے کا ارادہ کیا — جب کبھی تم نے ترک جادہ کیا۔ تو ساری آلودگیوں کے باوجود — میں خوش تھا۔ اور تمھارے تذبذب پر

ہنستا تھا ـــ کڑھتا تھا ـــ اور شوق سے تمھیں دیکھا کرتا تھا ـــ لیکن تم تو اسی راہ پر چلتے رہے۔ اور اب شہر سے نکل کر دوسری ویران کھوہ میں بیٹھ کر تم سوچتے ہو کہ نردان کے درخت پر چڑھ رہے ہو۔ یا تزکیۂ نفس کر رہے ہو ـــ؟ لیکن یہ جھوٹ ہے کاظم بھائی۔ جس جھوٹ کو تم بھی خوب جانتے ہو کہ تم نے اظہار کر کے دیکھ لیا ـــ اور اب اس المیہ کو ـــ رسوائی یا تذلیل کہہ کر خفگی کا اظہار کر رہے ہو۔ تم نے اپنے آپ سے بھی اپنے آپ کو چھپایا ہے ـــ کیا تم یہ چاہتے تھے کہ وہ پوٹلی میں ستو باندھ کر لبیک لبیک کہتا ہوا دوڑا ئے گا ـــ یا تمھارے ستر صفحوں کے جواب میں وہ ایک سو بیس صفحوں میں اپنی داستان محبت اور وفا کی قسمیں لکھ کر بھیج دے گا۔ تا کہ تم اسی یقین اور بھروسہ کر کے صرف اسی کے بنے رہو۔ اسے جو کچھ کہنا تھا وہ کہہ چکا تھا۔ لیکن تم شاید اس سے اور کچھ بہت کچھ چاہتے تھے اپنی قبولیابی کا ثبوت۔ اس کی جذباتیت کی کہانی۔ لیکن وہ تم سے مضبوط ثابت ہوا۔ جسے تم نے رسم جانا ـــ اور سمجھے کہ تم بہلائے اور بیوقوف بنائے جا رہے ہو۔ اور اس لئے ترک جادہ پر آمادہ ہو گئے اور بڑبڑانے لگے کہ کاش اس نے اسی انداز میں قبول یابی بخشی ہوتی جس انداز میں تم نے اپنے کو پیش کیا تھا۔ شاید اسی لئے تم بہن کے بہلاوے میں بھی نہ آ سکے۔ اور تمھاری خواہش کی انتہا میں زوال آنے لگا ـــ شاید تم چاہتے تھے کہ وہ دوسری ٹرین سے سوار ہو کر تمھارے پاس آ جائے اور رو کر بلک بلک کر اپنی بے خبری کا ماتم کرے اور تم شان بے نیازی سے اس کی سرخ آنکھوں کو دیکھ کر افسوس کرتے رہو یا سگریٹ پیتے رہو ـــ یا تم کیا چاہتے تھے ـــ؟ کم سے کم اپنے کو تو بتا دو۔ ورنہ پھر یہ رسوائی کا خیال ترک کر دو۔

تم شاید سوچتے تھے کہ سارے رشتوں کو توڑ کر تم نے جو نیا رشتہ قائم کیا ہے، اسی تجربہ کو پھر دہرایا ہے ـــ جسے کئی بار آزما چکے ہو ـــ وہ تمھاری نجات کا سبب بنے گا؟ نہیں بھائی کاظم نہیں ـــ ہر شخص قیدی ہے ـــ اب تو اپنے کو دھوکہ نہ دو ـــ عورت دنیا میں سب کچھ بنائی جا سکتی ہے ـــ لیکن بہن نہیں ـــ! اس لئے کہ اہل افلاک ہی اس کی اجازت نہیں دیتے۔

جب تم نے کہا تھا کہ میں خیر کے قریب پہونچ چکا ہوں ـــ میں بالذات قائم العقل ہونے جا رہا ہوں ـــ تو کیا ایک مبہم سا اشارہ تمھیں نہیں ملا تھا کہ یعنی تمھارے لئے عورت کو بہن کے روپ میں نازل ہی نہیں کیا ـــ عورت کا بہن کے روپ میں شاید کوئی وجود ہی نہیں ہے ـــ اس کے صرف دو روپ ہیں ـــ ماں ـــ بیوی ـــ

بھائی کاظم ـــ! تم ابھی تک اپنے کو حسب معمول بہلاتے رہے ہو۔ بہلاؤ ـــ مجھے کیا؟ لیکن

استنا ضرور کردو — میرے کہنے سے — کہ اسے زندہ کردو جسے تم نے مار ڈالا ہے۔ ہاں اس کے بجائے زندہ خوابوں کا مار ڈالنا تمھارے لئے واجب ہے۔ تاکہ آئندہ نسلیں خود آگہی کے دُکھ سے محفوظ رہیں — یہ تو کارِ خیر ہو گا — !

تم سوچتے ہو کہ فرائض پر غور کرنے، دکھ اٹھانے یا اظہارِ تردد کرنے سے وہ دوسرے مطمئن ہو جاتے ہوں گے کہ تم واقعی ان کے مخلص ہو۔ نہیں — ! وہ تمھارے اندر کی چھپی ہوئی خود غرضی — تمھارے لہجے کھوکھلے پن سے خوب واقف ہیں — لیکن وہ بھی کیا کریں۔ کہ مصلحت کوشی ان کی قسمت ہے۔ اس لئے کہ وہ بھی زندانی ہیں۔

تب ہی تو رشوت کو رشوت سمجھتے ہیں۔

چھوڑ دو ان رشتوں کا لین دین — کون ماں اور کون بہن — ؟ آؤ اب بھی موقع ہے۔ واپس چلو۔ تج دو۔ چھوڑ دو — سب کچھ ترک کر کے واپس ہو لو — اس لئے کہ ان غموں کے دندانے بہت تیز ہیں۔ ان کی اشتہار روز بروز بڑھتی ہی جائے گی —

واپس ہو کر دیکھو — ! اب بھی کتنے لوگ خراش راہ ہونے کی تمنا میں نیم شکستہ سراؤں میں بیٹھے ہیں — ہاں وہی سب معصوم لوگ جو تم سے دھوکہ کھا چکے ہیں — اب بھی تمھارے منتظر ہیں۔

تم یہاں آکر اپنے بے بس عشق کو عشق رسا سمجھنے لگے ہو کہ تمھیں ایک تعلق کا دھاگہ مل گیا تھا۔ اس لئے کہ تم نے اس تیسرے سفر کی بازگشت میں دو سفر اور انجام دے لئے ہیں — کاش کاظم تم پہلے کی طرح نرگون بھگت ہی رہتے۔ کاش تم جان لیتے کہ ان دونوں سفر کا کوئی وجود ہی نہیں ہے۔ بلکہ یہ صرف اسی تیسرے سفر کی صدائے بازگشت تھی — ہاں صرف بازگشت کی آواز —

تم نہیں جانتے کہ جب صبح کے سینہ میں نیزے ٹوٹیں گے۔ تو یہی غم کے کتے بھونکنا موقوف کر کے تمھیں بھنبھوڑنا شروع کر دیں گے — اس لئے کہ یہی ہوتا آیا ہے اور ہوتا رہے گا —

بچو! بھائی کاظم اس معینہ لمحہ سے بچو — جو صدی کے برابر ہوتا ہے جب تم بکھر کر پاش پاش ہو جاؤ گے — تو پھر اپنے ہی ذرات کی تلاش میں اِدھر اُدھر بگولوں کی طرح دوڑتے پھرو گے — اس لئے کہ آج بھی تمھارے تیسرے سفر کی اصل حقیقت پر یقین کرنے والا کوئی نہیں ہے — وہ بھی نہیں ہے جس کے لئے ہی تم نے یہ لگاتار حبس اور قید و بند کی کشاکش برداشت کی تھی۔ اس لئے کہ بہ قول تمھارے۔ اگر اس نے ذرا سا بھی شرف قبول یابی بخشا ہوتا۔ یا سنجیدگی سے ان چیتکبری سطور کو دیکھا ہوتا۔ تو ایسا نہ ہوتا جیسا کہ ہو رہا ہے۔ اگر وہ بے چین ہو کر دوڑا نہ بھی آتا تو بھی کم از کم اس کی

آنکھ کی نمی۔ اس کے جسم کا بھیگا بھیگا پن۔ اس کے ہونٹوں پر جمی ہوئی پپڑی تو تم تک آسکتی تھی۔
تو زندگی کا سب سے بڑا غم تو تمھیں نہ اٹھانا پڑتا۔ کہ اس نے اس داستان کی شدت پر غور نہیں کیا۔
بلکہ اسی طرح سرسری گذر گئی جس طرح تجینہ اور روداس گذر گئی تھیں۔ کاش میرے ستر صفحات کو
وہ پذیرائی مل گئی ہوتی جو میرے لاشعور میں تھی۔ تو آج کچھ بھی نہ ہوتا۔ نہ کوئی دکھ اور نہ کوئی غم کی پرچھائیں۔
تم تو بڑے فخر سے سوچا کرتے تھے (افسوس کتنی معصوم و بے بس سوچ تھی تمھاری) کہ جب کبھی......
میری زندگی میں یا مر جانے کے بعد اسے میری یہ کہانی معلوم ہوگی جب وہ جانے گا کہ ۱۱ برس پہلے کا
ایک منظر۔ دو منظر اور تیسرا منظر اس کی زندگی میں کتنا بڑا کام کر گیا ہے تو کم از کم ہمدردی تو محسوس
ہی کرے گا۔ ہو سکتا ہے کہ میری بے بسی پر ایک قطرہ آنسو بھی نکل آئے اور وہ دوسروں سے نہ سہی لیکن
اسی سے جو ۱۱ برس سے صرف اسی کا ہے کوئی بات نہ چھپائے گا اور کہے گا۔ سنو! تم پریشان کیوں
ہوتے ہو۔ میں جیسا بھی ہوں تمھارے لئے حاضر ہوں۔ لاؤ اپنے آپ کو۔ اپنے دکھ۔ اپنے سارے
کرب کو۔ اپنی تنہائی بھی۔ سب کچھ میرے حوالہ کر کے اب تم مطمئن ہو جاؤ۔ اس لئے کہ میں تو تمھارا دوسرا
روپ ہوں۔ نہ گھبراؤ۔ کاظم اگر تم نے عبادت کی ہے جز اسے لاپرواہ ہو کر تو میں بھی اتنا کم ظرف نہیں
ہوں کہ تمھیں قبول یابی کا تحفہ نہ دوں۔ اگر اس میں میرا اپنا پن کھو بھی جاتا ہے تو کیا غم کہ وہ بھی
تمھارے پاس رہے گا۔ مت پریشان ہو کاظم، میں تمھارے ہی لئے ہوں اور رہوں گا۔ یہ سچ ہے
کہ مجھے تمھارے استھت پر گیہ کے سفر کے بارے میں واقعی کچھ نہ معلوم تھا اور نہ ہی تمھارا کوئی
قاصد کبھی میرے پاس آیا۔ پھر بھی واقعی میں تمھارا منتظر تھا۔ ہاں کاظم سچ میں تمھارا منتظر تھا۔
اور تم سے متعلق کافی خبریں میں نے اپنے پاس جمع کر رکھی تھیں۔ پاگل نہ ہو۔ چلو سو جاؤ۔ سو جاؤ نا۔
لیکن افسوس کہ آم کے باغات کی سرسراتی اور غم زدہ روحوں نے نہ جانے کن مصلحتوں
کے تحت مجھے بھی ۱۱ برس دھوکہ میں رکھا جب کہ مجھے ان پر اعتماد تھا کہ ان کے صرف ایک
اشارہ پر ہی میں نے طویل ترین ذہنی اور جسمانی اذیت برداشت کی اور استھت پر گیہ کی تلاش
میں نکل پڑا ــــ اور افسوس کہ جن نعمتوں کا وعدہ کیا گیا تھا ان میں سے اہم ترین نعمت جو
میرے لئے سب سے خوش گوار تھی اسے بھی نہ حاصل کرنے دیا۔ اور مکمل اظہار مدعا سے
قبل ہی وہاں سے بے مروتی اور بے حسی کا داغ لے کر پلٹنا پڑا۔ اُف رے کرب ــــ اب تم
کیا کرو گے مکمل اظہار کر کے ــــ ؟ کیا اور بے حسی کا داغ برداشت کر سکو گے۔
اچھا کیا کہ تم نے اس کو بھی اپنے تیسرے سفر کی اصل حقیقت سے آگاہ نہ کیا ــــ بلکہ

صرف ایک کہانی سنا کر رہ گئے ــــ اس لئے کہ وہ بھی یقین نہ کرتی تھی. یا اس کے دماغ ہی میں نہ سما سکتا. اور کہانی کی طرح وہ سفر بھی رسوا ہوتا جس کی سزا میں تمھارے ذہن سے اس تیسرے سفر کی ساری پرتیں کھرچ لی جاتیں. (کاش ایسا ہی ہو) اس لئے کہ اہل افلاک نے دھتورے کے نشہ کی جھونک میں ایک دن میرے سامنے ہی اس راز کا تذکرہ کر دیا تھا ــــ اب تم خود کبھی منزل مقصود سے بھی سفر کا راز نہ بتانا. اس لئے کہ اس کی بے حسی (اصل حقیقت سے) تم نہ برداشت کر سکو گے ــــ اور فوراً اچٹخ کر بکھر جاؤ گے ــــ اٹھو اور اپنے سارے سفر ناموں کو جلا دو ــــ!

اس لئے کہ اس معینہ شہر میں کوئی تمھارا منتظر نہیں ہے. اسی لئے تو وہ تمھائے زبردستی اور خوشامد سے بھیجے ہوئے مخلص سیاح گونگے ہو کر واپس آئے تھے. کہ تمھیں کیا بتائیں ــــ؟ وہاں تمھیں اپنانے کے لئے کوئی ہے ہی نہیں. کوئی وجود ہو تو اس پر شک بھی کیا جائے. کیا جانے وہ شہر بھی ہے یا نہیں؛ شاید اہل افلاک نے ہی تمھیں دھوکہ دیا. شاید وہ قبرستان کی غم زدہ روحیں بھی دھوکہ کھا گئیں. شاید ان سال خوردہ کتابوں نے بھی تمھیں دھوکہ دیا ہے. کہ کتابیں تو اہل افلاک کی پابند ہوتی ہیں ــــ یا شاید۔ یعنی ہو تو سکتا ہے کہ سب مل کر کوئی امتحان لے رہے ہوں ــــ یا شاید ــــ شاید ــــ شا ــــ ش ــــ :. ــــ کون جان سکتا ہے ان کے اسرار کو ــ کہ وہ سب اہل افلاک ہیں اور تم زمین کا حقیر ذرہ. جو اپنے اردگرد سے غافل. اپنے ہی خول میں پھلستا رہا ہے.

یقین جانو ــــ اس شہر کا کوئی وجود ہی نہیں ہے. جہاں تمھارے لئے آئینہ بندی کی گئی ہو. جہاں گلی کوچوں میں عرق گلاب و بید مشک چھڑکا گیا ہو. بیلے اور ہار سنگھار کے پھول بکھرائے گئے ہوں. خوش نما مرمریں حوض میں کنول کے پھول کھلائے جا رہے ہوں ــــ جن کی پتیاں چاندی ایسے پانی پر تیر رہی ہوں ــــ اور وہاں کوئی تمھارا منتظر ہو. جس کے لئے تم کمربستہ ہو رہے ہو ــــ

واپس ہو لو ــــ اکہ سدا تمھیں واپسی کا غم رہے. اور پھر تم اپنے دیگر المیوں کی طرح اسے بھی بھلا کر مطمئن ہو جاؤ. کہ تم خود واپس ہوئے ہو ــــ اس لئے کہ تم ایک معمولی سے پاکباز گناہگار کے علاوہ کچھ بھی نہیں ہو ــــ جس سے کبھی کسی کو مسرت نہ مل سکی. اور ہر ایک تمھاری پاک بازی سے لمحاتی دھوکہ کھاتا رہا ــــ لیکن اب شاید تم اپنے اندر کے چھپے ہوئے گناہ گار کو نہ دبا سکو گے ــــ نہ دبا پا رہے ہو ــــ اس لئے کہ اب اس کے ظہور کا وقت معینہ آ چکا ہے. اور پاک بازی کا دور

جا چکا ہے — تمہارا کردار — پورا ہو چکا ہے۔ اب اہل افلاک دوسرے پارٹ کے لئے کسی اور کو چنیں گے۔ اور پھر کسی کو اس کے ہم راہ کردیں گے — تاکہ وہ ہر وقت اس اداکار کے ساتھ رہے۔ اور اسے مستقل بھنگ کے نشہ سے چور کئے رہے۔ تاکہ وہ یہ خوبی اپنا رول ادا کر سکے — اور نام نہاد معینہ شہر کا عازم رہے۔ کچھ خود ساختہ اصولوں کے بل پر کچھ خود پر طاری کردہ مفروضات کے لئے —

نہ جانے یہ اہل افلاک کبھی کسی کی اداکاری سے مطمئن ہوتے ہیں کہ نہیں — ؟ جانے کبھی کسی رول کو بھرپور سمجھا ہے — کہ نہیں — ؟ جانے ابھی سمجھیں گے بھی کہ نہیں — ؟ — اور یہ طویل ڈرامہ باب در باب چلتا ہی رہے گا — ؟ یہاں تو کسی اداکار کو یہ بھی نہیں معلوم کہ اسے کون سا رول ادا کرنا ہے تاکہ وقت سے پہلے ریہرسل کرلے — اور کب تک ادا کرنا ہے ؟ تاکہ اپنے کو ایڈجسٹ کرسکے — اور کب ان کے ایک اشارہ پر پردہ کے پیچھے چلا جانا ہے — تاکہ رخت سفر تو باندھ لے — ہائے رے بے چارے اداکار — اور اف رے اہل افلاک —

اس لئے بھائی کاظم تم ایک بغاوت اور کردو — اور بغیر اہل افلاک کی اجازت لئے، بغیر اپنا پورا رول ادا کئے — واپس ہوجاؤ — حالاں کہ میں جانتا ہوں کہ تمھیں بغاوت پر اکسانے کی مجھے کیا — اور کیسی سزا دی جائے گی — ؟ ہوسکتا ہے کہ میں برداشت بھی کرلوں — لیکن تم اب شاید اپنے آنے والے سخت ترین رول کو نہ نبھا سکو — اور بھنگ کا نشہ اکھڑتے ہی لڑکھڑا کر اسٹیج پر گر پڑو — یا کھڑے ہوکر چیخنے لگو — میں کام نہیں کروں گا — ! بند کردو یہ ڈرامہ — اور تب بہت سارے تماشائی تمھاری اس سچی اور حقیقی اداکاری پر مدتوں تمھارے پیچھے پیچھے تالی بجاتے چلیں گے —

نہ جانے اہل افلاک سچی جذبات نگاری سمجھ بھی پاتے ہیں یا نہیں — ؟

اس لئے آؤ بھائی کاظم لوٹ چلو — اپنے اس تیسرے سفر کو بھی مٹا دو — اور واپس ہولو — کہ شاید تیسرا سفر تم نے کبھی کیا ہی نہیں تھا — ؟ ہاں سچ — ! شاید یہ بھی تم نے اپنے اوپر طاری کرلیا تھا — کس میں ہمت ہے کہ تیسرا سفر کرسکے — اور پھر ایک طویل ترین عبادت اور تزکیۂ نفس کے لئے سارے موجودات سے بے پرواہو کر تیار ہو جائے — پھر بھی شک کہ نہ جانے حق پورا ہوا یا نہیں — اسی لئے تو آج تک کسی نے تیسرا سفر کیا ہی نہیں (تم کہاں کے ترم خاں ہو) اور اسی لئے کسی نے کسی معینہ شہر میں انتظار کی زحمت ہی نہ گوارا کی — یہ تو شاید

ہل افلاک کا دن میں دیکھا ہوا خواب ہے ــــ بے چارے معصوم اہل افلاک ــــ کہ ان کے لئے کوئی زمین نہیں ہوتی ــــ ان پر کوئی ہنسنے والا نہیں ہوتا ــــ کسی میں جرأت نہیں ہوتی کہ ان اہل افلاک کا استحصال کر سکے۔ اس لئے کہ وہ نہ کسی سے پیدا ہوئے ہیں اور نہ ان سے کوئی پیدا ہو سکتا ہے۔

ہاں بھائی کاظم ــــ میں بھی اب تک اہل افلاک کے حکم سے تمھیں بہلاتا آیا تھا۔ ورنہ تمھارا وہ مفروضہ تو ابتداء سے ہی مفروضہ تھا ــــ کہ کوئی لاشعوری طور پر تمھارے بھیگے ہوئے شانوں، ٹھٹھرے ہوئے تکیوں کی نمی محسوس کرتا ہوگا ــــ؟ کوئی تمھاری ۲ بجے کے بعد کی سسکیوں کو سنتا ہوگا۔ اور غیر محسوس طریقے سے گھبرا کر اٹھ جاتا ہوگا ــــ ضرور اٹھ جاتا ہوگا ــــ یہ جھوٹ ہے بھائی کاظم ــــ لو میں ہی تمھیں بتا دیتا ہوں ــــ کسی سے پوچھنے کی کیا ضرورت کہ اسے مجبوراً تمھیں بہلانا پڑے ــــ اور اگر کوئی دوسرا تمھیں اصل حقیقت سے آگاہ کرتا ــــ یا کسی اور ذریعہ سے تمھیں اس جھوٹ کا علم ہوتا تو تم برداشت نہ کر سکتے ــــ اور مجھے بھی دھوکہ باز کہتے۔ اس لئے میں ہی تم کو بتائے دیتا ہوں ــــ آؤ لوٹ چلیں۔ اس لئے کہ ہم جانتے ہیں کہ ــــ نیند کب اور کیسے آتی ہے ــــ

اور اگر تم نہیں چلتے ہو تو لو میں چلا ــــ اس لئے کہ ظہور سے قبل میں مرنا نہیں چاہتا۔ اور شاید یہ موت میری تقدیر میں ہے ــــ اس لئے اب میں خود ہی اس مقررہ شہر کے معینہ سفر سے انکار کرتا ہوں ــــ نہ جاؤں گا ــــ اب نہ جاؤں گا ــــ یہ میرا فیصلہ ہے ــــ (ارے اس فیصلہ کا کرب جب مجھے خود فیصلہ کرنا پڑا کہ اب میں خود ہی نہ جاؤں گا۔) اس لئے اس بار شاید میں ہی رسوا کر کے شہر میں پھرایا جاؤں۔

۱۴

کتنا تنہا ــــ کتنا اداس ہوں ــــ جیسے ساری زندگی کا کرب آج کی مٹیالی رات میں سمٹ آیا ہو۔ اس لئے کہ اداسی کا المیہ تنہائی ــــ لافانی ہے۔

سب ساتھ چھوڑ گئے ــــ لیکن میں نہ جا سکا ــــ آج بہت غم زدہ ہوں کہ وہ بھی آخر چلا ہی گیا ــــ اور میں یہاں کچھ داغ لئے ــــ کچھ الزام لئے جلاوطنی کی سزا بھگت رہا ہوں۔ اپنا تجزیہ کر رہا ہوں۔ سود و زیاں میں توازن تلاش کر رہا ہوں ــــ لیکن کچھ نہیں ملتا۔ نہ ہی سود ہے نہ ہی زیاں ہے ــــ جیسے کچھ ہے ہی نہیں ــــ نہ جانے سب کہاں ہوں گے ــــ؟

میرا نرگن تو تمھیں اتنا چاہتا تھا کہ جب مقررہ میعاد پر خود میں نے ــــ اور دوسروں نے

اسے تلاش کیا۔ تو اس جگہ پر اس کے وجود کی کوئی نشانی ہی نہ ملی ۔۔ نہ مل سکی ۔

آجاؤ ۔ لوٹ آؤ ۔۔ ورنہ میں نہ معلوم کہاں کہاں بھٹکوں گا۔ کس کس دروازہ پر دستک دوں گا اور پھر لڑکھڑاتا ہوا واپس پلٹوں گا۔ اس بار تو تم نے کہا تھا کہ ہم جنم جنمانتر کے ساتھی ہیں۔ لیکن چوتھی۔ پانچویں بار تو ویسے ہی پلٹ آیا ۔۔ اُداس سی شفق تھی ۔۔ قبرستان پر برستا ہوا سیاہ دھواں تھا ۔۔ پن چکی کی آواز تھی ۔۔ اڑتے ہوئے سفید کبوتر تھے ۔۔ تالاب پر مچھلی پکڑتا ہوا بچہ تھا ۔۔ اور درختوں کے پھیلتے ہوئے بھوت تھے ۔۔ بکری کی مینگنیاں تھیں ۔۔ سب کچھ اداس اداس تھا ۔۔ اور میں تھا ۔۔

اب تو یہ بوجھ سنبھالے ریش ہو چکا ہوں۔ نہ جانے صحرا کی ریت میں مراد کا قلادہ کہاں دفن ہے ۔۔ اور ابھی کتنی دور ہے ۔۔ کہیں ایسا تو نہ ہو کہ اسی بے بسی، جستجو اور انتظار میں کھو جاؤں ۔۔ خود کو کھو بیٹھوں اور اپنے کو تمہارے حوالہ نہ کر سکوں ۔۔ سچ یہ کتنا بڑا المیہ ہوگا۔ کہ میں اپنے کو اتنی مشقتوں، ریاضتوں کے بعد بھی تمہارے حوالہ نہ کر سکا ۔۔ کہ یہ افلاک کا طے شدہ منصوبہ تھا ۔۔

یہ لگاتار برستے ہوئے سنگ ریزے نہ جانے کیا کچھ دفن کر دیں۔ اور پھر واقعی تھیں کچھ سرسراتی ہوئی غم زدہ روحوں کے درمیان سے گذر کر کسی تازہ قبر پہ لمحہ بھر کے لئے آنا پڑے ۔۔ اور کہنا پڑے ۔۔ ایک لڑکا تھا ۔۔ عقل مند و پاک باز ۔۔ بے چارہ ۔۔ اپنی نطری موت سے پہلے ہی مار ڈالا گیا ۔۔ اب اس کی باقی زندگی کا حساب کون دے گا ۔۔ بے چارہ ۔۔ افسوس ۔

حالاں کہ پامسٹ نے تو کہا تھا کہ یہ بھی ناممکن ہے ۔۔ کہ تم پابند رسوم و قیود ہو ۔۔ لیکن مجھے تو خوش ہو لینے دو ۔۔ اس لئے کہ جب بھی چٹیل دھوپ میں سے چند سایہ دار لمحے زبردستی اپنے لئے بچا تا ہوں تو نہ چاہتے ہوئے بھی تم آجاتے ہو ۔۔ اور میں اس لمحہ پھر خواب دیکھنے لگتا ہوں کہ تم کہہ رہے ہو ۔۔

"تم پریشان کیوں ہوتے ہو ۔۔ ایں ۔۔ مجھے سب خبر ہے۔ بلکہ مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ میں یہ سب بہت پہلے سے ہی جانتی ہوں ۔۔"

اور میں تمہارے پیر کے انگوٹھے کو اپنی آنکھ لگی ہوئی انگلی سے مس کرنے کے لئے اٹھنے لگتا ہوں ۔۔ لیکن اسی لمحہ آنکھ کھل جاتی ہے ۔۔

تم مجھ سے پوچھتی ہو ۔۔

"تمھارا عبادت کے بارے میں کیا خیال ہے ——؟"

اور میں جو تم سے اتنی قربت کے بعد بھی کبھی بات نہ کر سکا تھا —— تمھارا سوال سنتے ہی گھبرا جاتا ہوں تو تم سنبھالتی ہو ——

"میرا مطلب ہے کہ کیا عبادت کا اظہار کر دینا چاہئیے ——؟"

اور میں اپنے سارے زائل شدہ نرگن بھگتی کے اثرات کو واپس لاکر چیخ سا پڑتا ہوں۔

"نہیں —— اک اظہار توہین ہے۔ اگر عبادت میں اتنی کشش نہیں کہ معبود خود مجسم ہو کر ساری الوہی زنجیروں کو توڑ کر سامنے آجائے تو اپنی عبادت کا جھوٹ تلاش کرنا چاہئیے ——"

تو تم نے کہا —— "لیکن اگر بغیر بتائے کوئی سب کچھ جان لے تو ——؟"

"تو —— ؟ تو ——؟"

"ہاں —— تمھیں کم از کم مجھ سے تو بتا دینا تھا —— کاظم —— کہ یہ تو میرا ہی راز تھا —— اور میں تو کافی عرصہ پہلے ہی تمھاری کشش کی حدود میں آچکی تھی ——"

لیکن پھر میری آنکھ کھل جاتی تھی ——

پھر جب ۲۷ فروری ۱۹۷۸ء کو کسی نے مجھے پکارا —— "جلدی سے کاظم کو بلاؤ۔ اب اس کی طبیعت بہت خراب ہو چکی ہے" —— تو میں لبیک لبیک کہتا ہوا دوڑ پڑا تھا —— لیکن پھر میری آنکھ کسی کے جھنجھوڑنے پر کھل گئی تھی۔

اب دیکھو! یہ آنکھ کب بند ہوتی ہے۔ اور میں سو جاتا ہوں۔

کاش دل کے داغ اور روح کے زخم دکھائے جا سکتے —— سچ —— یہ سب جلتے ہیں مسکراتے نہیں اور پکار پکار کر کہتے ہیں —— ہماری تمناؤں پر حرف آخر لگانے والو —— بتاؤ —— عمر کے ان معینہ برسوں —— کو کیسے گذاریں۔ کہ آسمانوں پر اب ہمارے لئے کوئی جگہ نہیں ہے۔ اور زمین پر شام کے بھوتوں نے خفیہ کمندیں بچھا رکھی ہیں —— کہیں تو پناہ دو —— کوئی تو پناہ دو۔ کہ اب تو نسیم سحر بھی سوئے ہوئے جنگل کی تمنا آلود —— اور نم نم —— بوجھل سانسیں معلوم ہوتی ہے۔

"اف رے وہ موت —— کہ —— دھواں پھیل رہا ہو۔ اندر باہر اندھیرا ہی اندھیرا ہو۔ کرشن پکش کا چاند دھیرے دھیرے مفقود ہو رہا ہو۔ دکشائن میں میلے اور کثیف بادلوں سے بھرا ہوا آکاش پھیلا ہو ——"

آؤ —— اب تم خود ہی چلے آؤ —— دیکھو نا —— میں اس مسلسل سفر میں کتنا تھک چکا ہوں۔

اتنی ٹھوکریں کھائی ہیں کہ جسم پک گیا ہے۔ اتنے آبلے پڑے ہیں کہ اب پاؤں کا نشان ہی نہیں ملتا — دیکھو تو سہی قدموں میں کتنی لرزش ہے — اور پھر بھی تم انتظار کی تلقین کرتی ہو۔ اف یہ مسافت — لیکن اب نہ چل سکوں گا — اب تمھارے بسے ہوئے شہر کی آئینہ بندی نہ دیکھ سکوں گا۔ اب ان حوضوں تک پہونچنا میرے بس سے باہر ہے جن میں قرمزی کنول کھلائے جاتے ہیں — ان گلیوں میں گذرنا محال ہے جن میں عرق گلاب چھڑکا جاتا ہے۔
اب تم خود ہی آجاؤ کہ افلاک کا لکھا پورا ہو جائے — وہ سب بھی تو منتظر ہوں گے — بھلا دو — لوح محفوظ پر لکھے ہوئے اصولوں کو۔ اور شہر کی ساری شیشہ لگی ہوئی فصیل کو مسمار کر کے چلے آؤ۔ تاکہ میرے بعد کسی مسافر کو فصیل کا خوف نہ رہ جائے۔

اس لئے کہ اب ہم اپنے من کے کرد گیتہ میں ہار مان چکے ہیں — بلکہ اب تو ہم میں اتنی بھی سکت نہیں رہ گئی ہے کہ ہم سفید جھنڈا اٹھا کر طالب امان ہو سکیں — اس لئے کہ تمھارے بغیر تو ساری خوشی نم کی پرچھائیں لگتی — اور ہر ہنسی آنسوؤں کی بازگشت لگتی تھی۔ میں نے تو اپنی سانسوں میں بھی تمھاری ہی آواز پائی تھی —

اس لئے جن شہروں سے تم گذرے ہو یا گذرنے کا امکان رہا ہے۔ میں ان شہروں میں باوضو داخل ہوا ہوں۔ یہی سوچ سوچ کر ان راہوں میں قدم رکھے ہیں کہ شاید کبھی تمھارے قدم بھی یہاں پڑے ہوں۔ یا پڑیں گے — پھر اپنے ہی خون سے تمھیں عقیدت کا خراج ادا کرتا تھا — اس امید میں کہ شاید تم انھیں قبول کر کے میرے شہر دل کی فصیلوں کو نیست و نابود نہ کرو — یا شاید اس لئے کہ ان کے علاوہ میرے پاس کچھ بھی میرا نہیں تھا — اور سوچتا — کیا واقعی تیسرا سفر بھی اب یاد کی سلیٹ پر نہ باقی بچا ہوگا؟

میری تو تمنا ہے کہ جیسی چادر تم نے مجھے دی تھی۔ ویسی ہی تمھیں لوٹا دوں۔ لوٹا سکوں۔ اور تم اسے خوب اچھی طرح دیکھ کر سنبھال کر رکھ لو — اور سوچو — کہ اس کے لئے مجھے کتنے یگیہ اور دان کرنے پڑے تھے — کتنے الیوں سے گذرنا پڑا تھا —؟ لیکن یہ کون جان سکے گا —؟ یا کس کو اتنی فرصت ہوگی؟ میں بھی کیسے اور کب بتا سکوں گا —؟ کہ میں بھی — گئی رات کو ہی سہی، سو جانے والوں میں سے تھا —

"باپ جی پاپ دے کوں کیدھا ہتھے، نام لیا تا دوں ندرا آدے"

۱۵

ساڑھے گیارہ ہو چکے ہیں۔ اور کسم ابھی تک نہیں آئی ہے۔ نہ جانے کہاں ہو ؟

میں تو اسی دن شکست مان چکا تھا۔ جب مجھے سب کچھ چھوڑ کر اس کے پاس آنا پڑا۔ اور وہ میری خواہش کے باوجود مجھ تک نہ جا سکی۔ اس لئے کہ جتنا سفر اسے کرنا تھا ــ وہ کر چکی تھی اور اب میری باری تھی ــ سو میں سب کچھ چھوڑ کر چلا آیا ــ اور اب سمجھتا ہوں کہ پر سکون ہوں ــ خدا جانے ہوں بھی کہ نہیں ــ ؟ شاید لگاتار عمل کا نام ہی سکون ہو۔ اس لئے کہ ہر شدید حرکت میں سکون آ جاتا ہے ــ پھر بھی کچھ نہ کچھ کھو دینے کا غم تو ہمیشہ رہتا ہے خواہ لاکھ اپنے کو بہلاؤ ... نہ جانے اب ماہے کہاں ہے۔ ؟ کیسی ہے ؟ سنا ہے کہ پاکستان جانے کا پروگرام بنا رہی تھی ــ نہ جانے اسے اس فرار سے بھی سکون مل سکے گا یا نہیں ؟ خدا جانے کہ ہم اپنے کو بہلا کر بھی کیسے لطف اندوز ہو لیتے ہیں۔ اور معینہ افعال انجام دیتے رہتے ہیں جیسے آج میں لطف اندوز ہو رہا ہوں۔ یا شاید اسی طرح کسم بھی لطف اندوز ہو رہی ہے۔ کیا پتہ کہ ماہے بھی کسی طرح لطف اندوز ہو پا رہی ہے یا نہیں ــ یا ساری زندگی بھائی کاظم کے بقول گھٹیا افسانے لکھ کر ہی اپنے کو بہلائے رہے گی۔ اور دوسروں کو پذیرائی کی پر امید نظروں سے دیکھا کرے گی۔

نہ جانے اب یہ بھائی کاظم کہاں ہے۔ اس کے خود پر طاری کردہ فلسفوں کا کیا حال ہے ؟ اس بے چاری ذیبا ظفریاب کا کیا حال ہے ــ وہ تو افسانے بھی نہیں لکھ پاتی ہوگی ... اور اس سے بری طرح مرعوب یا خوف زدہ تھی۔ کہ چائے کی پیالی دیتے وقت بھی اس کے ہاتھ بری طرح لرزنے لگتے تھے ــ

بھائی کاظم۔ اگر تمھیں اپنی پیشین گوئیوں کو سچ ہوتے دیکھنے کی خواہش ہو تو پھر میرے پاس چلے آؤ ــ لیکن تم ہی بتاؤ کہ میں کیا کرتا ــ میں ہی تو کسم کا ذمہ دار تھا ــ اس لئے کہ میں نے ہی اسے تمھارے کہنے کے مطابق ــ تنہا نسب بنایا تھا ــ یہاں آ کر بھی میں تمھاری نقل کرنا چاہتا ہوں۔ مگر بری طرح ناکام ہو جاتا ہوں ــ اس لئے کہ میں تمھاری جیسی محاسبہ کی قوت کہاں سے لاؤں۔ تمھارے جیسا ابھے۔ کہاں سے پاؤں ؟ تمھارے جیسی سم دروشتی یعنی سب کچھ .... دیکھ سکنے کا فراخ دلانہ نظریہ .... کہاں سے لاؤں ؟ میں شاید واقعی قوت فیصلہ نہ رکھتا تھا ــ اور تم میں اچھے برے کی تمیز تھی۔ اور اپنے فیصلوں پر اٹل رہ سکتے تھے۔ واقعی میرا انگوٹھا پیچھے کی طرف جھک جاتا ہے ــ اور اب تو شاید اور بھی زیادہ جھکنے لگا ہے

تم نہ جانے کہاں ہو گے ــــ؟ ورنہ تم سے ہی میں آج آمادگی سے کچھ حاصل کرتا ــ قبولیت سے تم سے باتیں کرتا ــ لیکن تم بھی شاید اپنے آپ سے شکست کھا کر کہیں چلے گئے ہو ـــ کاش تم یہیں کہیں میرے پاس ہوتے ۔ اور میں تم سے مل کر جھنجھلاتا رہتا ــ اور اپنی کمزوریوں کا علم ہوتے ہی دوسروں سے تمھاری برائی کرنے لگتا ـــ کاش ـــ اس لئے کہ ہم دونوں ہی کمزور تھے ۔ اپنے آپ سے شکست خوردہ ـــ خواہ تم اس کا اعتراف نہ کرو ـــ لیکن مجھے یہ اعتراف ہے ـــ کہ ۔۔۔ اب تو نیند بھی بڑی مشکل سے آتی ہے ۔ بہرحال تمھارے ہی بہ قول ۔ اشو چیاں ان دشوچ استوم ـــ کہ اب جو بات لائق غم نہیں رہ گئی اس کا غم کیا ہی کیوں جائے

سنا ہے زیبا ظفریاب نے شادی سے انکار کر دیا ہے ـــ جب کہ لڑکا کوئی I.A.S. تھا ۔ کیا بھائی کاظم ۔ تم اس خبر کو بھی لائق غم نہیں سمجھتے ـــ؟ شاید ضرور سمجھتے ہو گے ـــ لیکن مجھے یقین ہے کہ کبھی نہ ظاہر ہونے دو گے ۔ اس لئے کہ تمھارے نزدیک شاید اپنے علاوہ کسی کی کوئی اہمیت نہیں ہے ۔ اس لئے کہ تم واقعی اسھتت پر گیہ کی منزل کے قریب پہونچ چکے ہو گے ـــ ساکار اتھت پر گیہ ۔ بالذات قائم العقل ـــ کاش ـــ اے کاش ـــ لیکن کیا اے کاش ۔؟

۱۶

نہ جانے آج وہ کہاں ہو گا ـــ؟ کہاں کہاں بھٹک رہا ہو گا ۔ اپنے جھوٹے فلسفوں کی جھلستی ہوئی ریت میں کیا جانے اسے کوئی سکون کا سایہ نظر آیا کہ نہیں؟ یا اب بھی وہ سراب کو ہی سایہ سمجھ رہا ہے ـــ؟

کیا جانے اب اسے اپنے گاؤں کی یاد آتی ہے یا نہیں ـــ؟ سفید و بسنتی رنگوں کو وہ اب بھی پسند کرتا ہے یا نہیں ـــ؟ کیا کبھی مٹر اور گڑ کھانے کی خواہش ہوتی ہے ـــ؟ یا وہ اب ان سب سے بھی بلند ہو گیا ہے ۔ خود ساختہ بلند ۔ نہ معلوم جہاں وہ ہے وہاں کے تالابوں میں کنول ہیں ـــ؟ کیا اسے اپنا تیسرا سفر اب بھی اتنی ہی اچھی طرح یاد ہے ۔ یا لاتعداد سفروں میں وہ اسے کھو بیٹھا ہے ـــ کاش وہ میری شادی میں چپکے سے آ گیا ہوتا تو میں اس سے پہلا سوال یہی کرتا ـــ بھائی کاظم تمھارا تیسرا سفر ـــ؟ اور اس کے خفا ہوتے ہی ایک پلیٹ میں تلی ہوئی مٹر اس کے سامنے رکھ دیتا ـــ کیا اسے کیمرہ میرے پاس گروی رکھنے کا اب بھی دکھ ہے ـــ کاش میں نے لالچ میں کیمرہ خود نہ لیا ہوتا ـــ یا کاش اسے یہ راز نہ معلوم ہو سکتا لیکن اس سے چھپ بھی کیسے سکتا تھا ۔ وہ تو ہر ایک کے اندر جھانک لیتا ہے ۔ کاش کبھی

کوئی اس کے اندر بھی جھانکنے کا موقع پا جاتا — کاش. پتہ نہیں — کیا وہاں بھی وہ قبرستانوں کی تلاش میں رہتا ہے — ؟ یا کیا پتہ کہیں وہ خود ہی کسی قبرستان میں تو نہیں ہے — ارے — کہیں اس کی ماں نے نہ سن لیا ہو — اسے تو آج بھی اس کی واپسی کا انتظار ہے — پاک و پاکیزہ — آب زمزم سے دھلا دھلایا — تب میں اکثر اس کی ماں سے نظریں چرا کر اپنے آنسو خشک کرتا ہوا سوچتا ہوں — کہ کاش اسے نرگن سانکھ بدھی — سگن یوگ بدھی مل گئی ہو — خواہ وہ کسی برفانی گپھا میں ہو — تاکہ وہ — اسمقت پرگیہ ہو گیا ہو — کاش بھائی کاظم تم اسمقت پرگیہ ہو کر ایک بار اپنے گاؤں لوٹ آؤ تاکہ دیکھیں. اب بھی تم مٹر کے کھیت میں چھپ سکتے ہو یا نہیں — ؟ تاکہ میں اپنی بیوی کا تعارف تم سے کرا سکوں — اس لئے کہ وہ تم سے ملنے کی بہت مشتاق ہے — شاید اس لئے کہ تم ہی اکیلے میرے بھی بچپن کے ساتھی تھے — نہ جانے تمھاری بھی قسمت میں بیوی ہے کہ نہیں جو اسی طرح مجھ سے ملنے کی مشتاق ہو گی — اس لئے کہ میں بھی تمھارے بچپن کا اکلوتا ساتھی تھا — اور — تمھارے سفر کا رازدار بھی —

کاش تم اسمقت پرگیہ ہو کر ہی — یہاں آؤ — اس لئے کہ ہم سب نے ابھی تک کوئی ساکار اسمقت پرگیہ دیکھا ہی نہیں ہے — تب کیسے لگو گے تم — ؟ ایں — !

اختتامیہ

جب میں اس کے نہ لوٹنے پر اکیلا واپس چلا — تو اہل افلاک نے صدا دی — "جاؤ — تمھاری نیک چلنی اور خوش اطواری کی بنا پر ہم نے تمھارے ظہور کے معینہ وقت کو قریب کر دیا ہے — اس لئے کہ تم نے اپنا فرض بہ خوبی ادا کیا ہے"

میں نے اس کے بچھڑنے کے دکھ — اور اپنے مشکوک ظہور کی خوشی میں کانپتے ہوئے اوپر دیکھا — تو اہل افلاک ایک دوسرے سے آنکھ کا اشارہ کر کے مسکرا رہے تھے. نہ جانے کیوں — ؟

میں بغیر ان کی اجازت لئے تیزی سے اس شہر کی طرف دوڑ پڑا — جہاں میرے فرض کے بارہ سال گذرے تھے — تاکہ لوگوں سے اعلان کر کے بتا سکوں — کہ میرا ظہور مشکوک نہیں تھا — لو — دیکھو — ! میں آگیا.

لیکن — افسوس. جب اس شہر میں پہونچا تو دیکھا کہ — وہ اُجڑ چکا ہے — سارے

نقوش اتنے بدل گئے ہیں کہ پہچاننا دشوار ہو گیا ہے۔ آیا میں اسی شہر میں ہوں یا کہیں اور آگیا ہوں؟

نہ جانے اس معصوم پر کب کون سا زلزلہ آیا تھا کہ سب کچھ مسمار ہو گیا۔

میں اپنے گذشتہ نقوشِ پا کو تلاش کرنے لگا — لیکن اب تو وہاں نہ کسی مسکن کا نشان تھا — نہ ہی کوئی آثار تھے — میں بھٹکتا بھٹکتا جب ایک تنگ گلی سے گذر کر باہر نکلا تو سامنے — وہی گھوڑا دکھائی دیا — اور ایک بگلی اسی طرح اکیلی اس پر بیٹھی دکھائی دی — اس کی بغل سے دھواں بھی اٹھ رہا تھا — میں نے سوچا کہ شاید پھر اسے آج کسی ماہے نے ایک ماچس دے دی ہے — عمداً یا سہواً۔ اور اب وہ آگ جلائے ہے — اُف کتنا خطرناک فعل ہے یہ — کسی دن خود کو نہ جلا بیٹھے — لیکن جب نزدیک پہونچا تو چکرا کر گر پڑا — وہ بگلی نہیں تھی — بلکہ ماہے تھی — ارے نہیں — یہ تو رمو داس ہے — گرتے گرتے بھی میں اسے پہچان گیا — ارے رمو داس تم بھی آخر پاگل ہو ہی گئیں — پھر مجھے کچھ پتہ نہیں کہ کیا ہوا —

جب آنکھ کھلی تو میں نے اپنے کو سبی بھائی والے فلیٹ میں اسی مخصوص مسہری پر لیٹا ہوا پایا — بغل کے کمرہ میں کچھ بچے اور دو مرد عورت پھسپھسا رہے تھے — "نہ جانے کون ہے — کیسے گر گیا — ؟ کہاں سے آیا ہے — بے چارہ —"

میں ابھی پوری طرح ہوش میں بھی نہیں آسکا تھا کہ ایک آواز برآمدہ سے ہو کر کمرہ میں گھس آئی — اور ادھر اُدھر دوڑ دوڑ کر چیزوں کی ترتیب بگاڑنے لگی — میں فوراً چونک کر اُٹھ بیٹھا — اب وہ بھی آتی ہوگی — لیکن ابھی تو گڈو ظفر یاب ہی سارے کمرہ میں اچھل رہی تھی۔

"گلابو خوب لڑے گی — ہاں — شتابو خوب لڑے گی" کہ وہ بھی آگئی — اُف گڈو — اب چیزوں کو اتنا بے ترتیب نہ کیا کرو — اب مجھ میں اتنی سکت نہیں ہے کہ میں انھیں پھر اسی ترتیب سے سجا سکوں —"

پھر دونوں کمرہ سے نکل کر برآمدہ میں آگئیں — "گڈو — دیکھو کیا وقت ہوا ہے؟"

"ایں۔ جی۔ جی۔ وقت؟ آٹھ بج کر پچیس منٹ"

میں جلدی سے برآمدہ میں آیا تو — گڈو ظفر یاب باہر نکل گئی۔ صرف وہ رہ گئی۔

"کیا اب ماسٹر صاحب کبھی نہ آئیں گے — گڈو! — ؟ اتنا لیٹ تو کبھی نہیں ہوئے تھے — ہاں شاید — بھائی کاظم اب کبھی نہ آئیں گے — نہ جانے کہاں ہوں گے — وہ — ؟"

"ہر رات جب میں دروازہ کھولتی ہوں تو سورج دوڑ کر اندر آجاتا ہے۔ پھر اس کی تپش، سوزش اور اس کا قہر و جلال ساری رات میرے سینہ میں ذخیرہ رہتا ہے۔ اور میں روز صبح کو سوچتی ہوں کہ میں نے اس بار عظیم کو کیسے اٹھا لیا....؟"

میں خلاف اصول اس کمرہ سے اس محلہ سے پھر اس شہر سے بھاگ کھڑا ہوا۔ تاکہ چل کر اسے بتاؤں کہ اس شہر میں اب بھی ہمارا مسکن ہے۔ ہاں واقعی کوئی خود وہاں ہمارا منتظر ہے — آئینہ بندی بھی ہو چکی ہے — گلیوں اور شاہ راہوں میں عرق گلاب بید مشک چھڑکا جا چکا ہے — بیلے اور ہار سنگھار کے پھول بکھرے ہوئے ہیں — چکیلے، خوش نما مرمریں۔ حوضوں میں کنول کے پھول کھل چکے ہیں — ان کی پتیاں چاندی ایسے پانی پر تیر رہی ہیں۔ ہاں ہاں میں نے خود یہ سب دیکھا ہے — آؤ — ! جلدی سے کمربستہ ہو لو۔ کہ ہم فوراً ہی لوٹ چلیں — چلو جلدی کرو — ! — کہ میرا ظہور بھی ہو چکا ہے — لیکن جب میں ہانپتا ہوا اس کے پاس آیا۔ اور دروازہ کی درز سے جھانکنے لگا — تو دیکھا — کہ وہ اپنے ہی خون میں لت پت لیٹا ہوا کراہ رہا ہے — جہاں زاد — اے جہاں زاد۔

□